موازنۂ خوشحال و غالب





ناز سرحدی

موازنہ خوشحال وغالب

ناز سرحدی

نام کتاب موازنہ خوشحال وغالب

مصنف نازسرحدی

کمپوزنگ ارشادخان (پشتو اکیڈمی پشاور)

پریس جدون پرنٹنگ پریس، خیبر بازار پشاور

تعداد 500

سال اشاعت 2011ء

زرتعاون 300/- روپیہ

ملنے کا پتہ

☆ یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور شہر

☆ پشتو اکیڈمی بک شاپ پشاور یونیورسٹی

☆ سعید بک بنک کیفونمنٹ پلازہ ارباب روڈ پشاور کینٹ پاکستان

فون نمبر 091-5273761

☆ سعید بک بنک جناح سپر اسلام آباد پاکستان

فون نمبر 501-2651656-57-58

انتساب

خوشحال و غالب کے نام

فہرست

ستون ہیں۔ جن کے سہارے ہماری ادبی تاریخ کا ڈھانچہ کھڑا ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ یہ دونوں ہستیاں صرف پشتو اور اردو زبانوں تک محدود نہیں۔ بلکہ فارسی میں بھی جس کی ادبی روایت نے پشتو اور اردو کے ساتھ دیگر زبانوں' چغتائی' ترک' کردی' عثمانی ترک' بلوچی اور پنجابی پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے خوشحال و غالب نے طبع آزمائی کر کے اپنے اپنے علم و ہنر کا ثبوت دیا ہے۔

یہ بات لکھتے ہوئے مجھے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ بادی النظر میں خوشحال و غالب کے تقابلی مطالعے یا شخصیت وفن کے موازنے کا وہ جواز نظر نہیں آتا جو ہمیشہ اس طرح کے علمی و ادبی مباحث کی بنیاد ٹھہرتا ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ شہد کی مکھی اور اژدر کبھی کبھی ایک ہی پھول سے رس لیتے ہیں۔ خوشحال و غالب کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں فقید المثال ہستیوں کے حیات وافکار اور طرز اظہار میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ جنہیں سامنے لانا اور ان پر بات کرنا از حد ضروری ہے کیونکہ ایسے ہی تقابلی مطالعے نہایت ہی جامع مواد کے ساتھ قلیل وقت میں ہمیں بہت کچھ پڑھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح سے اگر ایک طرف ہمیں ایک ہی مطالعے میں کئی جہتیں پڑھنے کو ملتی ہیں تو دوسری طرف موازنے کے عمل کے دوران بعض اوقات ہماری رسائی ان نکات تک بھی ہو جاتی ہے۔ جنہیں عام حالات میں دریافت کرنا قدرے مشکل ہوتا ہے۔

خوشحال خان خٹک جنہیں دنیا زیادہ تر پشتو کے بلند پایہ شاعر کے طور پر جانتی ہے

صرف ایک شاعر نہ تھے وہ ایک نڈر اور جنگجو سردار، مدبر سیاستدان، حاذق حکیم، تجربہ کار شکاری، بے بدل عالم اور صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ ان کی شخصیت کا مطالعہ کرتے وقت ان کے ہر پہلو کے بارے میں یہی گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی ساری توانائی اسی ایک پہلو پر صرف کی ہوگی، مگر آخر کار اس امر کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان کی کثیر الجہت شخصیت کی توانائیاں ہر سو پھیلی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے کی کسی بھی زبان میں خوشحال خان خٹک جیسی شخصیت کی مثال ابھی تک نظر نہیں آتی۔ مستشرقین کے علاوہ علامہ اقبال جیسی شخصیت بھی خوشحال کی شخصیت اور کارناموں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور انہی کی ہدایت و مشاورت سے برصغیر کی ایک بیٹی خدیجہ فیروز الدین نے خوشحال خان خٹک کی حیات و افکار پر "The Life and works of Illustrious Khushhal khan Khattak" کے عنوان کے تحت پنجاب یونیورسٹی کے لیے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ دوسری طرف غالب بھی اپنی گوں ناگوں خوبیوں کے حوالے سے اردو ادب کی تاریخ میں ایک عہد ساز شخصیت کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اردو شاعری نے ان کے ہاں جوانی کا جوبن دیکھا اور جدید نثر نے ان کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ شائد ہی دنیا میں کوئی ایسا شخص ہو جس نے اردو کا نام سنا ہو اور غالب کو نہ جانتا ہو۔

محترم ناز سرحدی داد اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے خوشحال و غالب جیسی بلند پایہ اور عظیم المرتبت ادبی ہستیوں کے حیات و فن کے موازنے کے حوالے سے اس گرانقدر تحقیقی اور تنقیدی کام کا بیڑہ اٹھایا۔ اگرچہ انہوں نے تحقیق کے لئے انہی حوالوں

پر اکتفاء کیا ہے۔ جو ایک عرصے سے دوست محمد خان کامل، سید رسول رسا، پروفیسر حمید اللہ ہاشمی، ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل صدیقی، ایوب صابر، الطاف حسین حالی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر حمید احمد خان اور دیگر مرتب کرتے چلے آئے ہیں۔ جن کو استناد کا درجہ حاصل ہے اور اہل علم و دانش کے ایک وسیع حلقے کی شرف قبولیت بھی۔

گلوبل ویلیج کے جدید تناظر میں خوشحال و غالب کا یہ تقابلی مطالعہ ہر لحاظ سے ایک قابل ستائش کاوش ہے۔ کیونکہ جس دور میں خوشحال و غالب زندہ تھے اس دور میں فاصلے اٹل حقیقت کی طرح مواصلاتی رابطوں کی راہ میں حائل رہے ہوں گے۔ لیکن آج اس طرح کی علمی و ادبی معلومات کے لئے فاصلے اپنی حقیقت کھو چکے ہیں اور یوں یہ موازنہ اردو دان طبقے میں خوشحال شناسی اور پشتو بولنے والوں کے لئے غالب شناسی کے حوالے سے بھر پور کردار ادا کرنے کا متحمل ہے۔

مصنف نے جس عرق ریزی اور جانفشانی سے خوشحال و غالب کے موازنے کے ضمن میں جن نکات کو موضوعات کے طور پر اٹھایا ہے۔ وہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ ایک وسیع مطالعے کے بعد ہی لکھنے بیٹھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں خوشحال و غالب کے حالات زندگی سے لے کر ہر دو شخصیتوں کے مذہبی، نظریاتی اور فنی پہلوؤں کا پورا پورا ادراک کرانے کے لئے مصنف حوالہ جاتی طریقۂ کار اپنائے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کا یہ عمل، ان کے شعور اور تنقیدی نظر کی معیت میں استناد کی حدوں تک جا پہنچتا ہے۔ جو کہ نہ صرف خود مصنف بلکہ قاری کی ذات کے لئے بھی اعتبار اور معیار کا باعث بنتا ہے۔

اس حوالے سے مذہب ومسلک، حب علی، مہجوری، یکساں نظریہ شعر، غزل گوئی و قصیدہ گوئی، فلسفۂ غم، تصوف، جرأت اور بے باکی، حسن وعشق، طنز ومزاح وغیرہ وہ مماثل قدریں ہیں۔ جنھیں محترم ناز سرحدی نے خوشحال و غالب کے موازنے کے دوران موضوع بحث بنایا ہے۔ ہر عنوان کے تحت جو تفصیلات اور تاویلات دی گئی ہیں انہیں معتبر حوالوں کے ذریعے مضبوط کرنے کی کافی بلکہ کامیاب سعی کی گئی ہے اور یوں نہ صرف خوشحال و غالب کا موازنہ پڑھنے کو ملتا ہے بلکہ ان تمام کتابوں تک قاری کی رسائی بیک وقت ہو جاتی ہے۔ جن کو اس موازنے کو مرتب کرتے وقت ٹٹولا اور پڑھا گیا ہے۔

میں محترم ناز سرحدی کو اس کامیاب تحقیقی منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر مبارکباد دیتا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس اہم کتاب پر مجھے چند سطریں تحریر کرنے کی دعوت دی۔

ناز سرحدی اسکے بعد فارغ بیٹھنے والے نہیں۔ اب وہ ایک اور اچھوتے عنوان یعنی "The Political Thoughts of Khushal Khan Khattak" پر انگریزی میں کتاب لکھنے جارہے ہیں۔ اس کتاب کو مکمل کرنے کے سلسلے میں میری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک
پشاور یونیورسٹی

حرفِ اول

میں ''موازنہ خوشحال و غالب'' کے موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت نہ کرتا اگر مجھے ان دونوں نابغہ ہستیوں کے شخصی حالات اور کلام پڑھنے کے بعد ان کی شخصیتوں' افکار اور فن میں ناقابل یقین حد تک ہم آہنگی نظر نہ آتی۔ گو کہ ان دونوں کی شخصیتوں اور فن کے کچھ گوشوں میں تفاوت بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی من حیث المجموع خوشحال و غالب ہماری دنیائے ادب کی تاریخ میں دوسرے شعراء وادباء سے ممیز نظر آتے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے اور یہی ان کا مقام۔

خوشحال و غالب کی شخصیتوں اور فن کا مطالعہ کرنے کے بعد کسی شک وشبہ کے بغیر یہ احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے کہ ان دونوں نادر ہستیوں کا موازنہ اردو اور پشتو ادب کے شیدائیوں کے لیے نہایت ہی مفید اور احسن قدم ثابت ہوسکتا ہے۔

میری خوش قسمتی رہی ہے کہ اردو میری قومی تو پشتو میری مادری زبان ہے۔ پھر یہ کہ شاعری کے ساتھ شغف رکھنے والے ایک قاری کی حیثیت سے مجھے اردو اور پشتو ادب کے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا رہا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۶۹ء میں پاکستان ہائی کمیشن لندن (برطانیہ) میں

تعیناتی کے دوران میں نے برٹش میوزیم اور سینٹیل سیکشن لائبریری کی رکنیت لے رکھی تھی۔ وہاں جو پہلی کتاب میں نے لائبریری میں بیٹھ کر پڑھنے کے لئے نکلوائی تھی وہ خوشحال بابا کے پوتے افضل خان خٹک کی کتاب ''تاریخ مرصع'' کا قلمی نسخہ تھا۔

ہمارے ان دونوں نادرالوقت شعراء کا مطالعہ کرنے پر کھلتا ہے کہ ان کے ادوار میں لگ بھگ دو صدیوں کے فاصلہ کے باوجود ان کی شخصیتوں اور فن میں باہمی موافقت کے ساتھ ساتھ جو تفاوت پایا جاتا ہے اسے قلمبند کردینے سے اہل ادب حضرات کے لئے ایک مفید مطالعہ کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت میں نے ۱۹۹۴ء میں اس موضوع پر کام شروع کیا ہے۔ تو تقریباً سترہ (۱۷) برس اس ضمن میں تحقیق کرنے پر اس خیال کو مزید تقویت ملتی گئی کو موازنہ خوشحال و غالب پر قلم اٹھانا ایک مفید کام ہے۔ جسے مکمل کیا جانا چاہیئے۔ یہ ایک ادبی ضرورت ہے تاکہ ہزاروں سال پرانی زبان پشتو اور نسبتاً نئی زبان اردو میں ادا کئے گئے ان دونوں نامور شعراء کے خیالات و افکار، ان کے انداز ہائے فن اور بڑی حد تک انکی شخصیتوں کے مطالعہ کے ذریعے نہ صرف اردو اور پشتو ادب کو ایک دوسرے کے نزدیک تر لانے کا اہتمام کیا جائے بلکہ ہماری قومی یک جہتی کو بھی مزید سنوارا جائے۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو خوشحال خان خٹک کی عمر کا خاصا حصہ اپنے وطن کو مغل تسلط سے آزاد کرانے میں گذرا۔ جس سے خوشحال بابا کے جذبۂ حریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف غالب نے مغلیہ دور کے آخری لمحات میں ہندوستان پر

انگریزی تسلط کی ابتداء کو بنظرِ حیرت دیکھا۔ اس طرح ہمارے یہ ہر دو نابغۂ روزگار شعراء لگ بھگ دو ڈھائی سو سال پر محیط مغلیہ سلطنت کے ایک خاص دور کے دونوں سروں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

غالب نے زیادہ تر عشقیہ شاعری میں کمال حاصل کیا مگر اردو نثر پر ان کے مکاتیب نے ایک نہایت گہرا اثر چھوڑا ہے۔ انہوں نے فارسی میں شاعری کے علاوہ مغلیہ خاندان کی تاریخ (مہر نیم روز) اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حالات (دستنبو) لکھنے کا کارنامہ بھی سرانجام دیا۔ اُدھر خوشحال خان خٹک نے نہ صرف عشقیہ، فکری اور حماسی شاعری میں کمال دکھایا بلکہ مردِ غیرت مند یعنی تکیال اور باز کا تصور بھی دیا جسے بعد میں علامہ اقبال نے خودی مردِ مومن اور شاہین کی صورت میں پیش کیا۔ امید ہے قارئین ''موازنہ خوشحال و غالب'' میں اس نکتے پر دی گئی تفصیلات سے بطور خاص محظوظ ہونگے۔

پشتو نثر پر بھی خوشحال خان کا بڑا احسان رہا ہے کہ انہوں نے پشتو نثر میں ''دستار نامہ'' جیسی نادر کتاب تصنیف کی جسے اپنے مضمون (ایک سردار کو کن خصائل اور ہنروں کا حامل ہونا چاہیئے) کے لحاظ سے افلاطون کی ''جمہوریہ'' امیر کیکاوس کی ''قابوس نامہ'' اور نکولومیکیاولی کی شہرہ آفاق کتاب "The prince" (شہزادہ) کے مدمقابل رکھ سکتے ہیں۔ دستار نامہ کی نثر خوشحال سے پہلے کی مسجع اور مقفٰی نثر کے مقابلے میں سادہ اور پشتو روزمرہ کے مطابق ہے۔

جناب خاطر غزنوی کے بقول ''یوں اس کتاب کو پشتو نثر کے نئے دور کا حرف

آغاز کہا جاسکتا ہے''۔خوشحال بابا کا فارسی کلام بھی موجود ہے۔

جہاں تک خوشحال و غالب کے موازنہ کا تعلق ہے تو جن چیدہ چیدہ خصائص کی وجہ سے یہ موازنہ ضروری سمجھا گیا ان میں یہ حقائق شامل ہیں کہ ہماری یہ دونوں نابغۂ روزگار ہستیاں مغلیہ دور میں ہو گذری ہیں۔دونوں کا بچپن امیرانہ اور نوابانہ ماحول میں گذرا۔دونوں نے چھوٹی عمر میں شاعری شروع کی۔دونوں کو مغل دربار میں رسائی حاصل رہی۔خوشحال بابا نے پشتو شاعری اور نثر کے پرانے باب کو ختم ہوتے دیکھا اور نئے باب کو شروع کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔تو غالب نے اردو شاعری اور نثر کے پرانے باب کو ختم ہوتے دیکھا اور نئے باب کو شروع کیا۔ان دونوں ہستیوں پر بڑھاپے میں ابتلاء کا دور آیا۔دونوں نے ستر سال سے زیادہ کی عمر پائی۔اور یہ کہ دونوں اپنے فکر و فن کی جدت کی بدولت اپنی اپنی زبان پر ثبت ہو گئے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران آپ دیکھیں گے کہ ان دونوں بین الاقوامی شہرت کے حامل شعراء کے کلام میں ہم آہنگئی فکر بھی پائی جاتی ہے اور فکر مخالف بھی۔اسکے ساتھ ساتھ آپکے احساس میں کبھی ایک برتر نظر آئے گا اور کبھی دوسرا۔گو کہ بیشتر مضامین کے آخر میں ان دونوں نابغہ ہستیوں کی شخصیت' فن اور فکر پر ایک مختصر سا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔مگر میرے نزدیک خوشحال و غالب کا اصل موازنہ وہ تاثر ہے۔جو قارئین کے اذہان میں اس کتاب کے ہر مضمون کے پڑھنے کے بعد خود بخود پیدا ہوتا چلا جائے گا۔آپ جوں جوں اس کتاب کے مطالعہ میں آگے بڑھتے جائیں گے توں توں آپکو اپنے اپنے دور

کے ان دونوں قدآور انسانوں کے فن اور شخصیت کے خدوخال صاف ہوتے نظر آئیں گے۔ اور یہی اس کتاب کا منشاء و مطمع نظر ہے۔

خوشحال و غالب ہمارے آسمانِ ادب کے رخشندہ ستارے ہیں۔ انہوں نے اپنی اپنی زبان کو آئین نو دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں اپنے اپنے ادب میں درجۂ کمال پر فائز ہیں۔ دونوں اپنے متعلق یہ پیشن گوئی کر گئے کہ ان کے بعد ان جیسا کوئی نہیں آئے گا۔

خوشحال

نـه بـه زمـا غـنـدې بـل نـنـګيالے راشي
نـه بـه زمـا غـنـدې بـل جـنـګيالے راشي
خټک خو پـر يـرده پـه درست افغان کښې
عـجـب کـه هسې فـرهـنګيالے راشي

ترجمہ:- نہ ہی کوئی میری طرح ناموس پر کٹ مرنے والا آئے گا۔
نہ ہی (میرے بعد) کوئی مجھ جیسا جنگجو آئے گا۔
خٹک کا کیا شمار ہے پوری افغان قوم میں
عجب کہ کوئی مجھ جیسا فہیم اور عقلمند آئے۔

غالب:-

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

اس کتاب کو لکھنے کے لیے بے شمار کتابیں' ماہنامے' سہ ماہی رسالے اور بیش قیمت مقالے میری نظر سے گذرے۔ جہاں مناسب سمجھا گیا وہاں ان تمام سے چیدہ چیدہ اقتباسات ''موازنہ خوشحال و غالب'' میں دے دیئے گئے ہیں۔ اور ان کتب' رسائل و مقالات کا ذکر ہر اقتباس کے ساتھ Reference کے طور پر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے میں تمام متعلقہ مصنفین' مؤلفین' مقالہ نگاروں اور ناشرین کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انکے بیش قیمت خیالات سے ''موازنہ خوشحال و غالب'' کو از حد فائدہ پہنچا۔ اور اس کی افادیت میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

آخر میں اس کتاب کے مکمل ہونے پر میں اپنے رب ذوالجلال کا جس قدر شکر بجالاؤں کم ہے۔

تجھ ہی سے مانگنا میرا شعار ہو یا رب
ہمیش مجھ کو بچاتی رہے غنا تیری

ناز سرحدی

ناز سرحدی
۸ ہیرن گیٹ روڈ
ہمبرسٹون۔لیسٹر (برطانیہ)

جون ۲۰۱۱ء

باب اول
شخصیت

حیاتِ غالب

سنین کے آئینے میں

۱۷۹۷ء پیدائش دسمبر مطابق ۸ رجب ۱۲۱۳ھ' اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ ولد عبداللہ بیگ بن میرزا قوقان بیگ بمقام آگرہ۔

۱۸۰۲ء وفات عبداللہ بیگ' غالب اپنے چچا نصر اللہ بیگ کی سرپرستی میں آئے۔

۱۸۰۳ء لارڈ لیک نے دہلی کو فتح کیا۔

۱۸۰۶ء غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ کی وفات جنہوں نے غالب کو اپنا بیٹا بنا رکھا تھا۔ غالب اپنے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان رئیس آگرہ کی سرپرستی میں آئے۔

۱۸۰۶ء شاہ عالم کی وفات اور اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی۔

۱۸۰۷ء ایک روایت کے مطابق غالب نے شعر گوئی کا آغاز کیا۔

۱۸۰۹ء دوسری روایت کے مطابق اس سال سے شعر گوئی کا آغاز کیا اور رنگ بیدل کو اپنایا۔

۱۸۱۰ء نواب الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی اور نواب احمد بخش خان والئی فیروز پور جھر کہ جاگیر دار لوہارو کی بھتیجی امراؤ بیگم سے شادی ہوئی۔

۱۸۱۰ء نواب حسام الدین حیدر نے ان کا کلام میر تقی میر کے سامنے پیش کیا۔

۱۸۱۱ء عبدالصمد کی شاگردی۔

۱۸۱۳ء آگرے سے دہلی میں آمد اور قیام۔

۱۸۲۱ء اردو کلام کی تدوین بہ ترتیب ردیف (یہی دیوان غالب نسخہ بھوپال کی تاریخ کتابت ہے)

۱۸۲۲ء فارسی شاعری کا آغاز ۱۸۲۲ء تا ۱۸۵۰ء فارسی نظم ونثر

۱۸۲۵ء فارسی زبان میں پہلی نثری تصنیف رسالہ قواعد نیز پنج آہنگ تصنیف ہوئی۔

۱۸۲۶ء پنشن کی حصول کے لیے کلکتے کا سفر۔ مرزا الٰہی بخش معروف خسر غالب کی وفات۔

۱۸۲۶ء دہلی سے کلکتے کی طرف روانگی' انتخاب دیوان اردو۔

۱۸۲۷ء لکھنؤ کا سفر۔ لکھنؤ سے کانپور اور پھر باندرہ۔

۱۸۲۸ء ورود کلکتہ' معرکہ حامیان قتیل' دربار انگریزی کا آغاز۔

۱۸۲۹ء دہلی میں مراجعت (۱۸۲۸ء ۔ ۱۸۲۹ء انتخاب کلام فارسی واردو۔ موسوم بہ "گل رعنا" کی تدوین بفرمائش مولوی سراج الدین احمد)

۱۸۳۱ء پنشن کا دعویٰ جسے ولیم ٹمنگ نے خارج کیا۔

۱۸۳۲ء انتخاب کلام اردو' دیوان مروج

۱۸۳۵ء فریزر کا قتل' نواب شمس الدین خان کو سزائے موت' کلیات فارسی "میخانہ آرزو"

کے نام سے مرتب ہوا ۔

۱۸۳۷ء کلیات غالب فارسی کی تدوین

۱۸۴۱ء دیوان غالب اردو کے پہلے ایڈیشن کی طباعت' مطبوعہ سید المطابع دہلی' قمار بازی کے الزام میں پہلی بازپرس۔

۱۸۴۲ء دہلی کالج میں پروفیسری کی پیشکش اور غالب کا انکار۔

۱۸۴۵ء دیوان فارسی ''میخانہ آرزو'' کا پہلا ایڈیشن' مطبع دار السلام دہلی سے شائع ہوا۔

۱۸۴۷ء دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت' مطبع دار السلام' دہلی' قمار بازی کے الزام میں کوتوال شہر فیض الحسن کے ہاتھوں گرفتار ہو کر تین ماہ تک قید میں رہے۔

۱۸۵۰ء بہادر شاہ سے نجم الدولہ' دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ۔ تاریخ نویسی پر تقرر۔ ولی عہد شہزادہ فتح الملک کی استادی' ریختہ گوئی کا دور ثانی۔

۱۸۵۱ء مرزا جواں بخت کی شادی اور غالب و ذوق کی کشیدگی۔

۱۸۵۲ء ''مہر نیمروز'' لکھی۔ وفات زین العابدین عارف

۱۸۵۴ء استاد شہ مقرر ہوئے۔ چار سو روپے سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔

۱۸۵۵ء مہر نیمروز کا پہلا حصہ شائع ہوا۔

۱۸۵۷ء جنگ آزادی' دیوان اردو ترتیب دیا اور اس کا ایک نسخہ رامپور بھیجا۔ دربار رام پور سے تعلق۔ وفات مرزا یوسف۔

۱۸۵۸ء دستنبو کا پہلا ایڈیشن مطبع مفید الخلائق' آگرہ

۱۸۵۹ء نواب رامپور نے سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی جو وفات تک ملتی رہی۔ سفر میرٹھ۔
۱۸۶۰ء نواب کی دعوت پر رام پور گئے۔ ترتیب کلام غالب' بدست ناظر حسین مرزا' قاطع برہان لکھی۔
۱۸۶۱ء دیوان اردو کا تیسرا ایڈیشن' مطبع احمد دہلی' مرزا صاحب درد قولنج میں مبتلا ہوئے۔ ترتیب کلیات فارسی
۱۸۶۲ء دیوان اردو کا چوتھا ایڈیشن' مطبع نظامی' کانپور
۱۸۶۳ء حکومت انگلیسیہ سے خلعت عطا ہوئی۔ "نگارستان سخن" مرتبہ ظہیر دہلوی میں انتخاب کلام غالب کی طباعت (اس مجموعے میں ذوق' مومن اور غالب کے کلام کا انتخاب تھا اور یہ مطبع مفید الخلائق آگرہ میں باہتمام منشی شیو نرائن چھپا) کلیات فارسی کا دوسرا ایڈیشن منشی نولکشور نے شائع کیا۔
۱۸۶۴ء مثنوی ابر گہر بار اکمل المطابع' دہلی سے شائع ہوئی۔
۱۸۶۵ء نواب یوسف علی خان کے انتقال پر نواب کلب علی خان جانشین ہوئے۔ تو غالب نے رام پور کا سفر کیا قاطع برہان نظر ثانی اور اضافوں کے بعد درفش کاویانی کے نام سے شائع ہوئی۔ لطائف غیبی اور سوالات عبدالکریم شائع ہوئی۔
۱۸۶۶ء آخری انتخاب کلام بفرمائش خلد آشیاں نواب کلب علی خان والئی رامپور۔ حواس باختگی کا اقرار
۱۸۶۷ء مولوی امین الدین پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ۔ "سبد چین" کے نام سے

فارسی کلام مطبع محمدی' دہلی سے شائع ہوا۔ تیغ تیز شائع ہوئی۔ نکات و رقعات غالب شائع ہوئی۔ حسین علی خان متبنٰی کی نواب احمد بخش خان کے حقیقی بھائی کی پوتی سے نسبت۔

۱۸۶۸ء عود ہندی کا پہلا ایڈیشن مطبع مجتبائی' میرٹھ کلیات نثر فارسی (پنج آہنگ' دستنبو' مہر نیمروز) منشی نولکشور نے پہلی مرتبہ مرزا غالب کی اجازت سے شائع کی۔ ادائے قرض کے لئے والئی رامپور سے اعانت کی درخواست۔

۱۸۶۹ء وفات غالب ۱۵ فروری مطابق ۲ ذیقعد' ۱۲۸۵ھ پیر کے دن' ظہر کے وقت' نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔

حیاتِ خوشحال
سنین کے آئینے میں

۱۶۱۳ء۔ (جون مطابق ربیع الاول ۱۰۲۲ھ) خوشحال خان ولد شہباز خان بن یحییٰ خان بمقام سرائے اکوڑہ خٹک جہانگیر بادشاہ کے دور میں پیدا ہوئے۔

۱۶۲۶ء۔ خوشحال خان نے ۱۳ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ یوسفزیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔

۱۶۳۱ء۔ خوشحال خان کی پہلی شادی ۱۸ سال کی عمر میں ہوئی۔

۱۶۳۳ء۔ خوشحال خان نے ۲۰ سال کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔

۱۶۴۰ء۔ وفات شہباز خان؛ خوشحال خان کو اٹھائیس سال کی عمر میں باپ کی جگہ خٹک قبیلہ نے اپنا سردار مقرر کیا۔ عہد شاہجہان کے چودہویں سال فرمانِ شاہی کے ذریعے خوشحال خان کو اپنے قبیلے کا سردار مان لیا گیا۔

۱۶۴۱ء۔ خوشحال خان نے شہزادہ مراد بخش کے ہمراہ کانگڑہ کی مہم میں حصہ لیکر تارا گڑھ کے قلعہ [illegible] کیا۔

۱۶۴۶ء۔ خوشحال خان نے شہزادہ مراد بخش کے ہمراہ بلخ و بدخشاں کی مہم میں حصہ لیا۔

۱۶۴۹ء۔ شاہ جہان بادشاہ قندھار کی مہم کے سلسلہ میں کابل پہنچا تو خوشحال خان نے کابل کا سفر کیا اور شاہی دربار میں حاضری دی

۱۶۵۸ء۔ اورنگزیب عالمگیر کی تخت نشینی۔

۱۶۶۴ء۔ گورنر کابل سید امیر خان خوانی کی تیار کردہ ایک سازش کے تحت خوشحال خان خٹک کو گرفتار کر کے پابہ سلاسل پشاور سے دلی لے جایا گیا۔ اور راجھستان میں جے پور کے نزدیک قلعہ رنتھمبور میں قید کر دیا گیا۔ اُسوقت خوشحال خان کی عمر ۵۱ برس تھی۔ اپنا زیادہ تر کلام اور چند دوسری کتابیں خوشحال خان نے اسی قید میں تصنیف کیں۔

۱۶۶۹ء۔ پانچ سال کی قید اور نظر بندی کے بعد خوشحال خان کو رہا کر دیا گیا۔ وہ اکوڑہ خٹک پہنچے اور مغلوں کی مخالفت اختیار کی۔

۱۶۷۲ء۔ خوشحال خان نے پشتون سرداروں ایمل خان مہمند اور دریا خان افریدی کے ساتھ مغل صوبیدار محمد امین خان کے لشکر کے خلاف جنگ خیبر میں تعاون کیا۔ اور پشتونوں کی اس فتح کو اپنے کلام میں بہت سراہا۔

۱۶۷۳ء۔ خوشحال خان نے قلعہ نوشہرہ پر حملہ کر کے مغلوں کو وہاں سے بھگایا اور نگزیب عالمگیر کی بذات خود حسن ابدال میں آمد تا کہ سرحدی جنگوں کی کمان خود سنبھالے۔

۱۶۷۴ء۔ (ا) خوشحال خان نے پشتونوں کو مغلوں کے خلاف متحد کرنے کے لیے سوات کا
تا سفر کیا۔ جسکے دوران "سوات نامہ" کے عنوان سے اپنا شعری سفرنامہ بھی
۱۶۷۹ء ترتیب دیا۔

(۲) خوشحال خان اپنی زندگی کے آخری چند سال اپنے بیٹے بہرام اور اسکے امدادی مغلوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہنے کے بعد آفریدیوں کے ہاں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ ۱۶۸۹ء۔ خوشحال خان ۷۶ برس کی عمر میں اپنے گھر سے دور آفریدیوں کے علاقہ میں وفات پا گئے۔ انہیں انکی وصیت کے مطابق اکوڑہ خٹک کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر ایسوڑی بالا نامی گاؤں کے متصل پہاڑیوں کے دامن میں سپردِ خاک کیا گیا۔

خوشحال اور غالب کی ولادت اور بچپن

,,مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے عہد حکومت میں ربیع الثانی ۱۰۲۲ھ (مطابق مئی۔ جون ۱۶۱۳ء) میں شہباز خان کے ہاں ایک فرزند پیدا ہوا۔ جس کی قسمت میں نہ صرف افغانوں کی تاریخ کے ایک خاص دور میں ان کا قومی شاعر و مفکر اور ان کا فوجی و سیاسی قائد ہونا لکھا تھا بلکہ جسے اس کے فن اور علمی و ادبی آثار کی جامعیت و عمومیت کی وجہ سے (جوں جوں وہ سمجھا اور جانا جائے گا) ہر جگہ ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جو شہرت و ناموری کے اس بلند مقام تک پہنچا جہاں معدودے چند افغانوں کو رسائی حاصل ہوئی۔ جس کا یوم ولادت افغانوں کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھا جائے گا۔ اس بچے کا نام خوشحال خان رکھا گیا۔ ,,خیر عالمیانی'' ۱۰۲۲ھ اس کا مادۂ تاریخ ولادت ہے''

(دوست محمد کامل۔ ,,خوشحال خان خٹک'')

,,مرزا غالب کے دادا محمد شاہ کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان

آئے اور لاہور میں معین الملک کی ملازمت اختیار کی۔ لاہور سے وہ دہلی گئے اور وہاں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف کی سرکار میں انہیں ایک معقول ملازمت مل گئی اور پہاسو کا پرگنہ بطور جاگیر کے عطا ہوا۔ انہی کی اولاد میں مرزا غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خان عرف مرزا دولھا تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خان کی شادی خواجہ غلام حسین خان کمیدان کی بیٹی سے ہوئی اور ان کے دو بیٹے ہوئے ایک تو مرزا اسداللہ خان غالب جنہوں نے فارسی اور اردو نظم ونثر میں نام پیدا کیا اور دوسرے مرزا یوسف خان۔۔۔۔اسد اللہ بیگ خان عرف مرزا نوشہ' اسد اور غالب تخلص' قوم ترک' ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) بہ مقام آگرہ پیدا ہوئے۔ انہوں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ ایک ترکوں کا مشہور خاندان تھا۔ (مرزا غالب نے اپنے آپ کو سلجوقی وافراسیابی وپشنگی کہا ہے)''

(پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی۔ احوال ونقد غالب)

جہاں خوشحال نے ۱۳ برس کی عمر میں یوسفزئیوں کے خلاف اپنی پہلی جنگ لڑی ۱۸ سال کی عمر میں پہلی شادی ہوئی۔ ۲۰ سال کی عمر میں شاعری شروع کی اور ۲۸ سال کی عمر میں انہیں اپنے باپ کی وفات پر خٹک قبیلہ کا سردار بنایا گیا۔ وہاں غالب ۵ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ ۱۲ سال کی عمر میں شاعری شروع کی اور ۱۳ برس کی عمر میں انکی شادی ہوگئی جس

کے بعد وہ آگرہ سے دہلی آ بسے۔

تعلیم و تربیت کے سلسلے میں خوشحال نے زیادہ دھیان شکار کو دیا اور کم مدرسے کو۔ کم و بیش یہی حال غالب کا بھی تھا۔ انہوں نے زیادہ دھیان عیش وعشرت کو دیا اور کم مدرسے کو۔ مگر ان کی تعلیم کسی قدر باقاعدگی کے ساتھ ہوئی۔ کیا عجیب اتفاق ہے کہ جناب صلاح الدین ندیم نے غالب کے مکتب کے ماحول اور انکے کھلنڈرے پن کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بطور عمومی خوشحال کے بچپن کے بھی حسب حال ہے۔ آیئے دیکھئیے :-

,,مکتب کی روایتی اور تنگ فضا میں گھٹن محسوس کرنے والا بچہ جب اس فضا کو قبول نہیں کرتا اور درسی کتب کی طرف توجہ نہیں کرتا اور بیشتر وقت کھیل کود میں صرف کرتا ہے اور مکتب سے باہر کی کھلی فضا کا متلاشی رہتا ہے۔ تو بڑے بوڑھوں کی نگاہ میں وہ اپنی زندگی خراب کرتا ہے۔ حالانکہ گریز پائی کا یہ انداز کسی اور حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ بزرگوں کی عمر بھر کا تجربہ ان کے اپنے زمانے کا تجربہ ہوتا ہے۔ اور اس تجربے کی حدود اس قدر وسیع نہیں ہوتیں کہ نئی نسل کے تقاضوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیں اور وسعت طلبی کے خمیر سے تخلیق پانے والے بچے کی انا اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوتی۔ وہ بھانپ لیتی ہے کہ اس کی پرورش اور نمو کے لیے کون سا زمانہ مناسب ہے اور اس سلسلے میں نوخیز نگاہ کا تجسس اس کی رہنمائی کرتا

ہے۔ بچے کا تجسس خالص اور کھرا ہوتا ہے۔ اس کی کوئی جہت متعین نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ذات کی تنگ گپھاؤں کو چمکانے کے لیے اسے زمانے کے چڑھتے ہوئے تازہ اور نئے سورج سے توانا کرنیں فراہم کرتا ہے اور پھر یہاں قیام نہیں کرتا۔ باہر نکل کر اپنے ارد گرد کو محسوس کرتا ہے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہاں بھی نہیں ٹھہرتا اور کائنات کی لامحدود وسعتوں کو اپنی نگاہ میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ ۔۔۔۔ غالب کی شخصیت بھی کچھ اسی قسم کے کھلنڈرے بچے کی انا کی طرح ہے"

(صلاح الدین ندیم۔ ,,غالب کا ذوق تجسس'

ایک اور اتفاق یہ بھی ہوا کہ خوشحال کے والد شہباز خان اور غالب کے والد عبداللہ بیگ خان دونوں میدان جنگ میں بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ اس سے آگے ان دونوں یعنی خوشحال و غالب کی نابغہ شخصیتیں اپنی اپنی علیٰحدہ ڈگر پر مختلف حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے جانکلتی ہیں۔

خوشحال و غالب
شخصیت

خوشحال وغالب دو نابغہ روزگار شخصیتیں گذری ہیں۔انہوں نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے وہ ان کی شخصیتوں کے زیر اثر تھا۔تو چاہیئے کہ ہم ان دونوں کی شخصیتوں کے تمام تر پہلوؤں پر نظر ڈالیں اور جانیں کہ یہ نابغہ شخصیتیں برصغیر کے شعرو ادب کی تاریخ پر کیسے اور کیونکر ثبت ہوئیں۔

خوشحال کی شخصیت

,,اقوام کی تاریخ میں ہر زمانے کا ایک مخصوص دورانیہ انقلاب کا تقاضہ کرتا ہے۔اس تقاضے یا وقت کی پکار کو پورا کرنے کے لیے فطرت ایک انسان کا انتخاب کرتی ہے۔اس منتخب انسان کو قدرت بڑی فیاضی سے اوصاف، سوچ اور کمال بخشتی ہے۔تا کہ وہ حالات کو بدلنے اور زمانے

کا رخ دوسری طرف موڑنے پر قادر ہو جائے۔ ایسے لوگ اپنے دور کے نابغہ کہلاتے ہیں۔ کہیں ایک فنکار پیدا ہو جاتا ہے تاکہ حسن کی حقیقت و غایت کی تلاش میں دوسروں کی راہنمائی کرے۔ کوئی جرنیل پیدا ہوتا ہے کہ حق کا بول بالا کرنے اور انقلاب برپا کرنے کا داعی بنے۔ فلسفی اور حکیم پیدا ہوتا ہے کہ غور و فکر کی راہ راست کی نشاندہی کرے اور ذرات و موجودات کے اس بڑے کارخانے اور کائنات زیست کے چھپے رازوں سے پردہ اٹھائے۔۔۔۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علوم و فنون کی تمام خصوصیتیں ایک ہی شخصیت میں مرتکز ہو جاتی ہیں۔ قدرت اپنے جلال و جمال اور کمال کا اظہار ایک ایسے انسان کی پیدائش کی صورت میں کرتی ہے۔۔۔۔ ایسی ہی ایک شخصیت عظیم خوشحال خٹک کی ہے کہ دنیا کے نادر اور نابغہ انسانوں میں ایک خاص امتیازی مقام رکھتا ہے"۔

ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک، "خوشحال خان خٹک"

سہ ماہی پشتو، جون۔ اگست ۲۰۰۱ء

قدرت کا احسان کہ اس نے خوشحال جیسے انسان کو پشتون قوم میں پیدا کیا۔ مگر خوشحال کی پہلو دار شخصیت کے پیش نظر ان پر قلم اٹھانا مشکل سے دوچار کر دیتا ہے۔ کہ کہاں سے شروع کیا جائے اور کیسے۔ مشہور ماہر خوشحالیات پروفیسر پریشان خٹک کو بھی یہی مشکل

درپیش آئی:-

,,خوشحال خان خٹک اگر نرا شاعر ہوتا تو اس پر بات کرنے میں اتنی دشواری پیش نہ آتی۔مگر جو شخص بیک وقت شاعر' ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت ہی بہادر سپاہی' تجربہ کار جرنیل' فیلسوف' حکیم' ماہر فلکیات' ماہر النساب' تاریخ دان' سیاست دا' جغرافیہ دان ' معلم اخلاق' شکاری اور اعلیٰ درجے کا شہسوار ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہو تو اس پر کچھ کہنے یا لکھتے وقت دشواری یہ پیش آتی ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے اور کہاں پر ختم کی جائے''

(پروفیسر پریشان خٹک۔,,خوشحال خان خٹک'' از خوشحال نامہ' ص ۳۵)

اگر تاریخی تناظر میں دیکھنا ہو تو بات خوشحال کے پردادا ملک اکوڑے سے شروع کی جانی چاہیئے کہ اس نے اپنے رشتہ داروں سے ناراض ہو کر کوہاٹ میر ,اپنا علاقہ کربوغہ (ٹیری) چھوڑا اور درہ سونیالہ میں آ مقیم ہوا۔بعد میں شہنشاہ اکبر کو جب اٹک سے پشاور جانے والی شاہراہ کی حفاظت کا خیال آیا تو اسکی نظر انتخاب ملک اکوڑے پر پڑی اور بادشاہ نے اسے بلا بھیجا۔اس کی قدر افزائی کی اور اس شاہی سڑک کی حفاظت کا کام اسے سونپ دیا اور خیر آباد سے نوشہرہ تک کا علاقہ اسے بطور جاگیر عطا کیا۔یوں ملک اکوڑے مغل شہنشاہ کی ملازمت میں آ گیا۔اس نے موقع کی مناسبت سے خیر آباد اور نوشہرہ کے درمیان شاہی سڑک کے کنارے اپنا الگ گاؤں سرائے کے نام سے آباد کیا جو آ جکل ملک اکوڑے کے

نام کی مناسبت سے سرائے اکوڑہ خٹک کہلاتا ہے۔ ملک اکوڑے کا جانشین اس کا بیٹا یحییٰ خان ہوا۔ اور جب یحییٰ خان بولاق خٹکوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا تو اسکے بیٹے شہباز خان نے اپنے باپ کی جگہ سنبھالی۔ یہی شہباز خان خوشحال خان کا باپ تھا۔ لیکن شہباز خان یوسفزیوں کے خلاف ایک معرکہ میں لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اور آخر کار اپنے قبیلے خٹک کی سرداری کا بوجھ خوشحال کے کندھوں پر آپڑا۔ اُس وقت خوشحال کی عمر ۲۸ برس تھی۔

جب خوشحال سردار بنا۔ تو سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے یوسفزئی علاقہ پر چڑھ دوڑا اور اپنے دشمنوں کو شکست سے دوچار کیا۔ اُن دنوں مغل بادشاہ شاہجہان کا دور حکومت تھا۔ اگلے سال خوشحال خان نے شہزادہ مراد بخش کے ہمراہ بلخ، بدخشان اور کانگڑہ (تارا گڑھ) کی مہمات سر کیں۔ جس کے عوض شاہجہان نے خوش ہو کر لاہور کے مقام پر اُسے چار لاکھ روپیہ نقد انعام اور اڑھائی لاکھ روپے کی جاگیر عطا کی اور ساتھ ہی خوشحال کو خدمت شاہی کے لئے پانچ سو سوار اور ایک ہزار پیدل فوج تیار رکھنے کا حکم بھی دیا۔

۱۶۴۹ء میں شاہجہان قندھار کی مہم کے سلسلہ میں کابل پہنچا تو خوشحال خان نے کابل کا سفر کیا اور شاہی دربار میں حاضری دی شاہجہان کی مہربانیوں کے پیش نظر خوشحال نے اپنے کلام میں شاہجہان کو قدردان کہہ کر یاد کیا ہے۔ مگر شاہجہان کی نظر بندی کے بعد جب اورنگزیب نے عنان حکومت سنبھالی تو بادشاہ کے عمال اور خوشحال کے درمیان کسی غلط فہمی کی وجہ سے خوشحال کو ۱۶۶۴ء میں جبکہ اُس کی عمر ۵۱ برس تھی۔ اور وہ تقریباً تیس سال

تک نہایت وفاداری کے ساتھ مغلوں کی ملازمت کرتا رہا تھا۔ گورنر کابل سید امیر خوانی کی تیار کردہ ایک سازش کے تحت پشاور بلوا کر گرفتار کرلیا گیا اور پابہ سلاسل دہلی لے جایا گیا۔ اسکے بعد اسے راجھستان میں جے پور کے نزدیک رنتھمبور کے قلعہ میں قید کردیا گیا۔ خوشحال نے اپنی کلیات کا بیشتر حصہ فراق نامہ اور دستارنامہ اسی قید کے دوران لکھے۔ اور اسی قید کے دوران خوشحال نے اورنگزیب کے خلاف متعدد قصیدے بھی لکھے۔ اپنے وطن کی یاد اور ہند سے نفرت کے بارے میں بھی اسی قید کے دوران اپنے یادگار قصیدے اور غزلیں لکھیں۔ خوشحال کو کم وبیش پانچ سال کی قید اور نظر بندی کے بعد اپنے وطن واپس آنا نصیب ہوا۔ اب وہ ایک بدلا ہوا خوشحال تھا۔ اسے اپنی بے گناہی کا یقین اور قید کی وجہ سے ذلت پر بے انتہا صدمہ تھا اس نے قبیلے کی سرداری اپنے بیٹے اشرف خان کے حوالے کی اور خود مغل حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں اعلان کردیا:۔

د افغـان پـه ننـگ مـې اوتـړلـه تـوره
ننـګيالـے د زمـانـې خوشحال ختـک يم

ترجمہ:۔ میں نے افغانوں کے نام کی خاطر (اپنی کمر سے) تلوار باندھی ہے۔ میں زمانے بھر کا غیرت مند خوشحال خٹک ہوں۔

سر اولف کیرو نے اپنی کتاب ,,دی پوئمز آف خوشحال خان خٹک'' کے شروع ہی میں تعارف کے طور پر یہی شعر نقل کیا ہے۔

"My Sword I girt upon my thigh To guard our nations ancient fame,
Its champion in the age am I , The khattak khan, Khushhal my name,

یادر ہے خوشحال کی لوح قبر پر اس کا اپنا یہ شعر آج بھی کندہ ہے۔

اب خوشحال کی زندگی کے دو بڑے مقاصد رہ گئے تھے۔ پشتونوں کا اتحاد اور اورنگزیب کی مخالفت۔ یوں دیکھا جائے تو یہ ہر دو مقاصد ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ پشتونوں کے اتحاد کے بل بوتے پر خوشحال مغل بادشاہ اورنگزیب کی مخالفت میں کامیاب ہوسکتا تھا۔ ایک موقعہ پر خوشحال نے اتحاد کی برکت کو اجاگر کرنے کے لیے یہ اشعار کہے:-

چې مغل وته مې وتړله توره
درست پښتون مې و عالم وته ښکاره کړ
اتفاق په پښتنو کښې پيدا نه شو
گنې ما به د مغل گريوان پاره کړ

ترجمہ:- ,,جب میں نے مغلوں کے خلاف تلوار اُٹھائی
تو تمام پشتون قوم کو دنیا میں نمایاں کر دیا
(مگر) پشتونوں میں اتحاد پیدا نہ ہوسکا
ورنہ میں مغلوں کے گریبان پارہ پارہ کر دیتا''

پشتونوں کے اتحاد کی خاطر خوشحال تمام پشتون قبائل کے پاس گئے اور انہیں متحد کرنے کی کوشش کی ۔ چند ایک قبائل یعنی مہمند' آفریدی اور شنواری تو خوشحال سے آملے لیکن پشتونوں کے سب سے بڑے قبیلے یوسفزئی نے خوشحال کا ساتھ نہ دیا۔ حالانکہ ان کے ساتھ اتحاد کی خاطر خوشحال نامساعد حالات میں یوسفزیوں کے گڑھ سوات بہ نفس نفیس گئے تھے۔ سفر سوات کا جو فائدہ ہوا وہ خوشحال کی کتاب سوات نامہ' کی شکل میں سامنے آیا یعنی اتنے مشکل حالات میں بھی خوشحال نے لکھنے لکھانے کا کام جاری رکھا۔ سوات نامہ میں سوات کی تاریخ' وہاں کے لوگوں اور وہاں کے جغرافیہ سے متعلق باتیں درج ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ سوات نامہ خوشحال کی وہ کتاب ہے جسے پشتو میں پہلے سفرنامے کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ اسی سفر کے دوران خوشحال اور اخون درویزہ کے مرید خاص شیخ میاں نور کے درمیان اخون درویزہ کی کتاب مخزن اسلام کے بارے میں مناظرہ بھی ہوا۔ جس میں خوشحال نے مخزن کی خامیاں منظر عام پر لائیں ۔ جو پشتون قبائل خوشحال سے آملے تھے۔ ان کی مدد سے خوشحال نے مغلیہ افواج کو چھ مقامات پر شکست سے دوچار کیا۔ ان جنگوں میں مغلیہ سلطنت کے ہزاروں فوجی اور چند نامور جرنیل بھی مارے گئے۔ ادھر اورنگزیب نے خوشحال کی کامیابیوں کو روکنے کے لیے دو کام کئے ۔ پشتون قبائل میں اپنی دولت ایسی پھیلائی کہ اکثر قبائل زر کی خاطر مغلیہ سلطنت کی وفاداری کا دم بھرنے لگے۔ دوسرا کام اورنگزیب نے یہ کیا کہ خوشحال کے بیٹے بہرام کو خوشحال کی جگہ سردار مان لیا۔ اور خٹک قبیلے کے دوسرے سرکردہ افراد کو بھی انعامات سے نوازا۔ بہرام کو یہ مشن دیا گیا کہ وہ

اپنے باپ کو زندہ گرفتار کرے۔ کہتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں خوشحال خان اپنا علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اور ہر وقت گھوڑے کی پیٹھ پر سوار رہنے لگے۔ وہ کسی ایک مقام پر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ آخر کار انہوں نے افریدیوں کے پاس پناہ لی۔ اور کچھ عرصہ بعد ۱۶۸۹ء میں اٹھتر ۷۸ سال کی عمر میں جلاوطنی کے دوران وفات پائی۔ وفات سے پہلے خوشحال بابا وصیت کر گئے تھے۔ کہ انہیں ایسی جگہ دفنا دیا جائے جہاں وہ مغلوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُٹھنے والی گرد سے محفوظ رہیں۔ علامہ اقبال نے اس وصیت کو بال جبریل میں یوں جگہ دی ہے۔

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں کہستان کا یہ بچہ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہمنشیں دل کی بات
وہ مدفن ہے خوشحال خان کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مغل شہسواروں کی گرد سمند

جیسا کہ خوشحال کے حالات زندگی سے ظاہر ہے وہ ایک آزاد طبیعت انسان تھے۔ شکار کھیلنا، حرب و ضرب کو عزیز رکھنا، قلم سے محبت رکھنا، پشتون قوم کو متحدہ اور آزاد دیکھنے کی بے حد خواہش، جمہوریت پسند، ننگ اور غیرت پر مر مٹنے والے باہمت انسان جو ایک رنگین مزاج

اور رومانی شاعر بھی تھے۔ جن کے اشعار کی تعداد چالیس ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ نثر اس کے علاوہ ہے۔ جو بہار کے موسم میں اپنی بیاض بغل میں دبائے سیر چمن کو نکلتے تھے۔ ساتھ میں ان کی حماسی شاعری کا بھی جواب نہیں۔ انہوں نے نہ صرف مرد اور ننگیال کا تصور پیش کیا بلکہ باز کا ایسا تصور دیا کہ علامہ اقبال نے اس سے استفادہ کرتے ہوئے شاہین کا تصور اپنایا۔ جس کی شاعری میں علامہ اقبال اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق شعر عرب کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور سر اولین ہاول کے مطابق جس کے اشعار کی بحور انگریزی شاعری کے قریب ہیں۔ خوشحال علم طب میں بھی طاق تھے۔ انکی کتاب طب نامہ اسی حقیقت کی غماز ہے خوشحال نے اگر ایک طرف افریدی حسین دوشیزاؤں کے متعلق ایک دلکش انداز میں لکھا اور پشتون عورت کو چین و خطا کی خوبصورت حسیناؤں سے زیادہ خوبصورت جانا تو دوسری طرف قید رتھمبور کی یادگار کے طور پر ہندی حسیناؤں کی بھی تعریف کی اور انکے گن گائے ہیں۔

اپنے وطن کے خشک پتھروں کو سونے سے زیادہ عزیز رکھنے والے خوشحال کو گنگا جمنا کے پانی سے زیادہ دریائے لنڈا (دریائے کابل) کے پانی کی یاد ہند میں قید کے دوران ستاتی رہی۔ مذہبی لحاظ سے ایک کٹر سنی مسلمان جسے لہو ولہب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ لیکن اگر آپ ان کی مے اور مے پرستی سے متعلق غزلیں پڑھیں تو ان سے زیادہ مے پرست آپکو شاید کہ ملے۔ صوفیانہ شاعری اس کے علاوہ ہے۔ وہ اخلاقیات کے معلم کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں

خوشحال کے اخلاق و عادات پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔لیکن خوشحالیات کے ماہر میاں سید رسول رسا نے ان کے اخلاق و عادات کے متعلق بڑا مربوط تبصرہ کیا ہے۔

,,خوشحال خان اونچے اخلاق کے پشتون سردار تھے۔مہمان نواز' مروت اور سخاوت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔دوسروں کی مالی مدد کرنے کے لیے مشہور تھے۔اور اُسوقت کے پشتون خوانین کی طرح شکار کے دلدادہ تھے۔باز کے ذریعے شکار کے لیے خاص رغبت رکھتے تھے۔گھوڑے' باز اور شکاری کتے انکو بہت پسند تھے۔اور باز تو بڑے شوق سے پالتے تھے۔۔۔۔باز کا شکار خوشحال خان کی شاعری پر بہت اثر انداز ہوا۔انکی شاعری میں شکاری پرندوں یعنی شاہین اور عقاب کا بہت زیادہ ذکر ملتا ہے''

سید رسول رسا آگے چل کر یوں رقمطراز ہیں:

,,خوشحال خان پیدائشی شاعر تھے عاشق مزاج اور حسن پرست تھے لیکن عیاش اور اوباش نہیں تھے۔خود فرماتے ہیں نہ تو میں خراباتی ہوں ,,نہ قمار باز ہوں اور نہ ہی زناکار ہوں'' اور خوشحال جب یہ کچھ کہتے ہیں تو صحیح کہتے ہیں ان میں کسی قسم کی بد عادت نہیں پائی جاتی تھی۔البتہ ان کا جنسی ہیجان بہت تھا لیکن اس قسم کے خواہشات کی تکمیل کے لیے کوئی ناجائز اور حرام طریقے انہوں نے نہیں اپنائے

اور اپنے آپ کو دوسری عورتوں سے بچاتے ہوئے انہوں نے ایک سے زیادہ شادیاں کی تھیں۔ اپنے جنسی تجربات اور مشاہدات کا ذکر کلیات میں بے باکی کے ساتھ کیا ہے۔ یہ انکی صاف گوئی اور حق گوئی پر دلالت کرتا ہے ----- باتوں سے سنجیدگی ٹپکتی تھی مگر ظرافت سے بھی کام لیتے تھے ----خوشحال خان کے اخلاق و عادات، کارناموں اور تصانیف کے مطالعے کے بعد گمان ہوتا ہے کہ روہ کے پہاڑوں کے یہ سفید شہباز بشر نہیں بلکہ فوق البشر تھے''

(میاں سید رسول رسا، مقدمہ ارمغان خوشحال'')

,,خوشحال خان خٹک کی زندگی بڑی پُر آشوب اور ہنگامہ خیز تھی انہوں نے کبھی بھی معمولی اور حقیر کاموں میں وقت ضائع نہیں کیا۔ وہ حق گوئی اور بے باکی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اور ان کی تلوار میں جو چمک اور تیزی تھی ان کی شاعری میں اس سے بڑھ کر قوت اور زور تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں اگر مغلیہ خاندان کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کیا اور ان کی سلطنت کو استحکام بخشنے میں ان کا ممد ہوا تو دوسری جانب جب انہوں نے مغلیہ خانوادوں کی غلط پالیسیوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو آخر دم تک اپنی بات پر ڈٹے رہے''

(فہم دل راہی، دیدہ ور خوشحال''از خوشحال نامہ)

خوشحال خان خٹک ایشیا کا عظیم ترین باغی تھا۔ جس نے دنیاوی عظمت کو ٹھکرا کر آزادی کا علم بلند کیا۔ جب تک روئے زمین پر ایک بھی حریت پسند باقی ہے صوبہ سرحد کے اس بطلِ جلیل کا نام اس وقت تک صفحہ ہستی سے مٹ نہیں سکتا۔ اس کے باغیانہ اشعار کی بازگشت رہتی دنیا تک اربابِ فکر ونظر کے دل میں گونجتی رہے گی:

,,آزادی کا مقام بادشاہی سے بلند ہے جب انسان کسی کا محکوم ہوتا ہے تو وہ قیدی ہوتا ہے''۔

(ایوب صابرؔ از خوشحال نامہ)

جب ہم اخلاقیات کا ذکر کرتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ خوشحال خود ایک با اخلاق شخصیت کے مالک تھے بلکہ انکے کلام میں جابجا اخلاقیات پر اشعار ملتے ہیں۔

چې زړۀ لـه تـانـه د چا ښـه کیـږی
ښـه کـړه دعـا گټـه دعـا قبلیـږی

ترجمہ: اگر تیری وجہ سے کسی کا دل خوش ہوتا ہے۔ تو تُو بھلائی کر، دعائیں لے کہ دعا قبول ہوتی ہے۔

آزار د هیـچـا د اخستـو نـۀ دے
ښیـرے د خـوږو زړونـو لـگیـږی

ترجمہ:- بدعا کسی کی بھی نہیں لینی چاہیئے، کیونکہ دکھی دلوں کی بددعا لگتی ہے۔

کـه دې زړۀ دے چې بـد نـه مـومې لـه چـانـه
اول تـهٔ پـريـږده د بـدو خـصـلـتـونـه

ترجمہ:۔اگرتو چاہتا ہے کہ کوئی تمہارے ساتھ بدی نہ کرے تو پہلے اپنی بُری خصلتوں کو چھوڑ دے۔

خوشحال کے کلام کا مطالعہ انہیں ایک فلسفی اور مفکر کے طور پر بھی متعارف کرتا ہے۔اسلئے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ ایک پہاڑی قبیلے کے فرد ہونے کے ناطے ایک محدود سوچ رکھنے والے انسان تھے۔بلخ وبدخشان' کابل' سوات' اٹک' لاہور' دہلی' آگرہ' تاراگڑھ اور تھنبور انکے دیکھے بھالے مقامات میں سے ہیں۔بلکہ بلخ وبدخشان اور تاراگڑھ میں تو انہوں نے مغلیہ سلطنت کے ایک سردار کی حیثیت سے جنگی معرکوں میں حصہ لیا۔اپنے کلام میں دوسرے مقامات کے علاوہ دہلی اور لاہور کا ذکر کیا ہے۔دہلی شہر کی تعریف اور اس میں گذرنے والے پشتون اور مغل بادشاہوں کی تاریخ ایک طویل قصیدے کی شکل میں لکھی ہے۔ پنجاب کی رومانی داستان ہیر رانجھا اور شورکوٹ کا ذکر انکے کلام میں ملتا ہے۔صلح کل کے داعی تھے۔اپنی ایک غزل میں اپنے وقت کی مروج اردو کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔پشتو کے علاوہ وہ فارسی کے بھی ایک اچھے شاعر تھے۔انکی خوبیاں کہاں تک گنوائی جائیں۔بس سمجھیے کہ اکوڑہ کے پاس ایسوڑی کی پہاڑی کے دامن میں اپنے مزار میں آسودہ آرام یہ ہستی خوشحال خان خٹک ہم سب کے ہیرو تھے۔کیونکہ جس علاقہ کو وہ مغلیہ سلطنت کے پنجہ سے (جسے وہ غیر ملکی طاقت سمجھتے تھے) آزاد کرانے کا عزم رکھتے تھے۔وہ قندھار سے لیکر

اٹک تک کا علاقہ ہے جس کا بیشتر حصہ آج آزاد پاکستان میں شامل ہے۔ یوں خوشحال پاکستان کے شاعر کے طور پر جانے جائینگے۔ خوشحال کے مندرجہ اوصاف کو اجاگر کرنے کے لیے انکے چیدہ چیدہ اشعار پیش خدمت ہیں:-

یو د ښکار بل د کتاب بل د دلبرو

په جهان کښې نورې نه شوې دا درې مینې

ترجمہ:- ,,شکار' کتاب اور حسینوں سے پیار ان تینوں کے علاوہ دنیا میں اور کوئی پیار نہیں''۔

په ځان او په جهان کښې ما دوه څيزه دي وکښلي

په ځان کښې دواړه سترګې په جهان کښې واړه ښکلي

ترجمہ:- اپنی ذات میں اور باقی ساری دنیا' میں نے دو چیزیں انتخاب کی ہیں۔ اپنی ذات میں دونوں آنکھیں اور دنیا میں سارے حسین۔

د خوشحال خټک خوشي به هغه وخت شي

چې بريښنا د سپينو تورو شي په زغرو

ترجمہ:- خوشحال خٹک کی خوشی تو اسوقت ہوتی ہے۔ جب چمکتی ہوئی تلواریں زرہ سے ٹکرا کر روشنی پیدا کریں۔

بله هيڅ ليدله نه شي په دا مېنځ کښې

يا مغل د مېنځه ورک يا پښتون خوار

ترجمہ:-کوئی درمیانی راستہ نظر نہیں آتا۔ یا مغل بیچ میں سے دفع ہو جائینگے یا پشتونوں کو خوار ہونا پڑے گا۔

که يې مومې اوړے ژمے ګبينه خوره
خو په سود يې خبر مهٔ کړه خپل پلار

ترجمہ:- اگر تمہیں شہد ملے تو اسے گرمی سردی دونوں موسموں میں کھاؤ مگر خبردار اس کے فوائد سے اپنے والد کو آگاہ نہ کرنا۔

په جهان د ننګيالي دي دا دوه کاره
يا به وخوري ککرۍ يا به کامران شي

ترجمہ:- دنیا میں غیرتمند کے لئے یہ دو کام ہیں۔ یا تو اپنا سر ہار بیٹھے گا یا کامران ہو جائیگا۔

تنګه خوَلهٔ دِغنچه ګل ده　　په لبانو لکه مل ده

ترجمہ:-تمہارا تنگ دھانہ غنچۂ گل کی طرح اور تمہارے لب شراب کی طرح ہیں۔

شور و شر به د رانجا په جهان نه وو
که د هير صورت پيدا نه وے په شور کښې

ترجمہ:-رانجھے کی دنیا میں شور و شر نہ ہوتا اگر ہیر شورکوٹ میں پیدا نہ ہوئی ہوتی۔

مسلمان وئيل رب رب کا　　هندو وائی چې رام رام
هر يوهٔ وته چې ګورې　　واړه بولي د خدائے نام

ترجمہ:-مسلمان رب رب کہتے ہیں　　ہندو رام رام جپتے ہیں

ان میں سے جس کسی کو بھی دیکھو   وہ خدا ہی کا نام لیتا ہے

د نمانځه تر قضا ګرانه دا قضا ده
چې قضا شي د څلورو مصلحت

ترجمہ:- جہاں چار آدمیوں کا صلاح مشورہ قضا ہو جائے۔ تو یہ قضا نماز کی قضا سے زیادہ مشکل ہے۔

که هر څو دي پښتنې جونه طناز
دا د هند سکنې هم نه دي بې نیاز
په جیو جیو درته پستې خبرې وائي
هر زمان له تا په څو رنګه همراز
عجب سرې په پانو شونډې درته خاندي
میخې غاښ په مسې تور عشوه پرداز

ترجمہ:- پشتون عورتیں کتنی ہی شوخ وشنگ کیوں نہ ہوں مگر ہندوستان کی یہ سانولیاں بھی اتنی بے نیاز نہیں۔ نرمی اور جی جان سے باتیں کرتی ہیں۔ ہر گھڑی تمہارے ساتھ ہیں اور ہر طرح سے تمہاری ہمراز۔ پان سے عجب طرح ہونٹ لال کر کے تمہارے سامنے کھل کھلائیں گی۔ دانتوں میں سونے کی میخیں جڑی ہوئی، مسی ملے ہوئے ناز و انداز والی۔

خوشحال کی ۳۰۰ ویں برسی کے موقع پر منظوم نذرانہ ہائے عقیدت

مرے خوشحال کے نغمے بھی اک ایسے ہی لافانی ستارے کی ضیا ہیں
مری مٹی کے چہرے کی حیا ہیں
انہی نغموں کے پرتو سے امنگیں جگمگاتی ہیں
انہی سے اس زمیں کی آنکھ میں دلہن کی آنکھیں مسکراتی ہیں
اسی تارے کی مشعل سے ہے اپنا تن بدن روشن
کرن اندر کرن روشن
مرے خوشحال کے نغموں سے ہے میرا وطن. روشن

امجد اسلام امجد

تو جام غزل میں قطرہ قطرہ
صہبائے حیات گھولتا ہے

اشعار میں تیرے نکتہ نکتہ
پختون ضمیر بولتا ہے

محسن احسان

خشک ٹکڑا تھا، نانِ جویں کا مگر
میں نے قند و نبات و لبن کر دیا
باکرہ تھی ابھی تک یہ پشتو غزل
اس اچھوتی کو میں نے دلہن کر دیا

اس مسافت میں افکار و انظار کی
کچھ نہیں فاصلہ ماہ کا سال کا
پیشرو تھے ابوالفضل و فیضی مرے
پیشرو ہوں میں غالب کا اقبال کا

رضا ہمدانی

غالب کی شخصیت

غالب کی شخصیت کے بارے میں سب سے پہلے ہمیں وہ تہذیبی ماحول دیکھنا ہوگا۔ جس میں غالب کی پیدائش ہوئی اور بچپن گذرا:۔

,,غالب نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ دہلی اور آگرہ کے چند معزز خاندانوں میں سے تھا۔ یہ خاندان عام انسانوں کے مقابلے میں بادشاہوں اور ان کے خاندانی معاملوں منصب داروں اور انکی سازشوں' مرہٹوں روہیلوں نوابین اودھ اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور ان کی باہمی رقابتوں یعنی شیطان کے غموں سے زیادہ آشنا تھا۔ اس کے اغراض بھی مختلف موقعوں پر ان ہی طاقتوں میں سے کسی ایک سے وابستہ رہے۔ خواجہ غلام حسین کمیدان شاہی خاندان کے پروردہ تھے۔ غالب کے باپ الور کی ریاست سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے چچا مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے۔ بعد میں لارڈ لیک کی سرکردگی میں لڑے اور ان کی اولاد کمپنی کے وظیفہ کی مستحق سمجھی گئی۔ غالب کے ایک اور بزرگ نواب احمد بخش تھے۔ جن کی بھتیجی سے غالب کی شادی ہوئی۔ یہ انگریزوں کے بہت

بڑے دوست اور دہلی کے شاہی خاندان سے منسلک تھے۔ گویا بچپن میں غالب مغلوں، مرہٹوں اور انگریزوں کی مربیانہ توجہ سے بالواسطہ فیض یاب رہے۔ غالباً ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی ہوگی کہ مغل بادشاہ ہے اور نہیں بھی ہے۔ مرہٹہ مغلوں کا نائب ہے اور حاکم بھی ہے۔ انگریز مسلمان نہیں ہندو نہیں لیکن دہلی پر حکومت کرتا ہے اور میرے خاندان کے بزرگ ہر طاقت کے ساتھ ہیں اور سچ پوچھو تو کسی کے ساتھ بھی نہیں''

ڈاکٹر خورشید الاسلام،،غالب کا تہذیبی ماحول''

جیسا کہ معلوم ہے غالب کی عمر ابھی مشکل سے پانچ برس کی تھی کہ انکے والد عبداللہ بیگ خان وفات ہوگئے اور غالب اپنے چچا نصر اللہ بیگ خان کی کفالت میں آ گئے جنہوں نے انہیں بڑے نازونعم سے پالا۔ نصر اللہ بیگ خان ایک خوشحال جاگیردار تھے۔ ایئے دیکھیں کہ اس ماحول نے غالب کی شخصیت پر کیا اثرات مرتب کیے:-

''غالب نے اپنے بچپن میں فراوانی دولت اور آسائش کا جو رنگ دیکھا۔ اس نے غالب کے مزاج کی تشکیل میں ضرور ایک اہم حصہ لیا ہوگا۔ غالب کی زندگی میں آسائش، عزت اور زر کے حصول کی مسلسل تگ و دو کی ایک اہم وجہ غالباً یہی تھی کہ اس نے خوشحالی کا ایک دلکش دور دیکھا تھا اور قطعاً غیر شعوری طور پر اس دور کو ایک معیار قرار دے

دیا تھا۔ چنانچہ اس نے عمر بھر خوشحالی اور آسائش کے معیار تک پہنچنے کے لیے تگ و دو کی اور ہر ناکامی اس کی آتش شوق کو فزوں تر کرتی رہی۔ ان حالات میں غالب کی شخصیت کی تکمیل میں اس کے خون گرم نے بھی حصہ لیا۔ ایک عام انسان تو شاید پیہم صدمات کے پیش نظر انفعالیت کے رجحان کو اختیار کر لیتا اور شکست و یاس کی ایک تصویر بن کر رہ جاتا لیکن غالب کے اندر زندگی کی رمق کچھ زیادہ ہی توانا تھی۔ چنانچہ اس نے ناکامیوں اور نامرادیوں کے باوجود ایک بہتر اور خوب تر معیار زندگی کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اس کی زندگی ایک مسلسل تگ و دو، بے قراری اور اپنی تمام زندگی سے بے اطمینانی کی تفسیر بن کر رہ گئی''

ڈاکٹر وزیر آغا ''غالب کی شخصیت''

غالب کے سسر نواب الٰہی بخش معروف شاعر بھی تھے۔ اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ ذوق اور مومن بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے کے شمالی ہند کی دنیائے شاعری میں ان تینوں کا ڈنکا بجتا تھا۔ معروف نے غالب کو شاہ نصیر کی شاگردی کے لیے ضرور کہا ہوگا مگر غالب اپنی انفرادیت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ وہ کسی کو اپنا استاد ماننے پر تیار نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے غالب کی اس انفرادیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے:-

''وہ (غالب) دہلی کی ادبی محفل میں داخل ہوئے تو بغیر کسی خارجی سہارے کے، نہ دولت تھی نہ کوئی سرپرست، اس کے علاوہ اس زمانے کا طرۂ امتیاز یعنی کوئی استاد بھی نہ تھا جس کی شاگردی پروانہ راہداری بن کر ملک ادب میں ان کو اطمینان کے ساتھ قدم رکھنے دیتی غالب بے یار و مددگار میدان جنگ میں یکہ وتنہا داخل ہو گئے۔ غضب یہ تھا کہ وہ وصف اضافی یعنی آبائی افتخار اور عیش رفتہ کا خمار لے کر آئے۔ اپنی قابلیت و برتری کا احساس ان کو منکسر المزاج بننے نہ دیتا تھا۔ ۔۔۔۔۔۔ صرف خال خال منتخب حضرات غالب کے دوست بن سکے۔ منجملہ دیگر اشخاص کے مولوی فضل حق خیر آبادی، مفتی صدرالدین، شیفتہ، مومن، کالے صاحب وغیرہ ان کے مزاج میں دخل پا سکے''

ڈاکٹر اعجاز حسین ''غالب اپنے زمانے میں''

ایک اور قباحت یہ ہوئی کہ غالب مذہبی شعائر کے متعلق سنجیدہ نہیں تھے۔ اس ضمن میں انکی نماز اور روزے سے دوری اور مے خوری لوگوں کو بد دل کرنے کے لیے کافی تھی۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کے الفاظ میں ان کے کردار کی لغزش خواہ وہ ادب سے علاقہ نہ رکھتی ہو، بدنام کرنے والوں کے ہاتھ میں ایک ایسا حربہ بن جاتی تھی جو ان کے علمی اور ادبی کارناموں کو بھی مجروح کر دیتی تھی۔ یوں غالب کی شخصیت میں انفرادیت نے بڑھکر خود پرستی کو جنم

دیا۔ اپنے آپ کو دوسروں سے منفرد سمجھنے والا اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا بھی سمجھتا ہے اور اسکے احساسات اور جذبات میں رفعت بھی آجاتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس صورت حال کو اپنے مقالے میں یوں سمیٹا ہے:-

> ''غالب کی عام زندگی میں خود پرستی کا جذبہ بالکل معمولی باتوں سے وجود میں آیا ہے۔ مثلاً خاندانی وجاہت ' پیشہ آباء ' پنشن' نسب' خلعت' دربار تک رسائی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام باتیں نہ صرف غالب کو عزیز ہیں بلکہ وہ ان باتوں کو اپنی شاعرانہ کاوشوں کے مقابلہ میں زیادہ اہم بھی خیال کرتا ہے۔ اور ان کے باعث اس کے ہاں جو ''خود پرستی'' کا جذبہ ابھرا ہے اس کی نوعیت ایک بڑی حد تک عامیانہ ہے۔ لیکن شعر کی دنیا میں جہاں مادی عوامل جذباتی تقاضوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں یہی خود پرستی اس روپ میں ابھرتی ہے کہ محسوس ہوتا ہے گویا غالب ایک اونچے سنگھاسن پر بیٹھا ہے اور ایک نگاہ غلط انداز سے گزرتے ہوئے کاروائی کو دیکھتا چلا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں غالب اپنے شعر میں خود کو احساسی اور جذباتی طور پر لوگوں کی سطح سے اونچا تصور کرتا ہے۔ خود پرستی کا جذبہ وہی ہے جو غالب کی عام زندگی میں موجود تھا لیکن ارتقاع پاکر کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ چند اشعار دیکھئے:-

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی"

ڈاکٹر وزیر آغا"غالب کی شخصیت"

سفر کلکتہ غالب کی زندگی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بنگال ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا بڑا ہدف تھا گو کہ اس کی یلغار ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل سے شروع ہوئی تھی۔ کلکتہ بنگال کا اہم شہر اور مرکز تھا۔ سید احتشام حسین نے اسے"نیم فرنگی نیم ایشیائی" شہر سے موسوم کیا ہے۔ غالب کو سفر کلکتہ اسلئے درپیش آیا کہ انکے چچا کی جاگیر کے صلہ میں انہیں جو پنشن انگریزی سرکار سے ملتی تھی وہ بند کر دی گئی تھی۔ جس کی داگذاری کے لیے غالب کو عدالت میں پیشی کے سلسلہ میں کلکتہ کا سفر درپیش ہوا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً تیس برس (۳۰) تھی۔ وہ لکھنؤ' بنارس اور دوسرے مقامات سے ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے جہاں انہوں نے اپنے دو سالہ قیام کے دوران مقدمہ بھی لڑا اور ادبی معرکے بھی سر کئے۔ سید احتشام حسین غالب کے قیام کلکتہ پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:-

" غالب نے وہاں (کلکتہ میں) جو چہل پہل دیکھی' جو عمارتیں

دیکھیں، جو حسین وجمیل عورتیں دیکھیں، جو ایک نیا بنتا ہوا تمدن دیکھا اس نے انکا دل موہ لیا۔ بنارس میں مناظر فطرت اور حسن انسانی نے ان کے جوان حسن پرست دل پر گہرا اثر ڈالا تھا تو انہیں وہاں (کلکتہ) کے "سبزہ زار ہائے مطرہ" اور "نازنین بتانِ خود آرا" یاد آتے اور سینے پر تیر لگتا۔ کلکتہ میں کچھ ایسی کشش تھی کہ احباب کی دوری کا غم بھی مٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتے ہوئے بھی انسان کا ذہنی اُفق اسی طرح وسیع ہوتا ہے اور شعور اسی طرح وہ ذخیرہ جمع کرتا ہے جو اسے اپنی طبقاتی تنگ نظری سے باہر نکالنے میں معین ہوتا ہے"

(سید احتشام حسین "غالب کا تفکر")

غالب کے قیام کلکتہ کو مولانا ابوالکلام آزاد نے انکی زندگی کا اہم موڑ کہا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو غالب کو کلکتہ میں سبزہ زار اور نازنین کے علاوہ بہت کچھ دیکھنے اور سمجھنے کو ملا۔ سب سے پہلے تو غالب کو مقدمے کے سلسلے میں انگریزی عدالتی نظام اور انگریزی طرز حکومت سے آگاہی حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ سٹیم انجن، ٹیلیفون، ریلوے اور بجلی سے واقفیت ہوئی کلکتہ سے غالب ایسے خیالات اور تصورات لائے جوان کے ہم عصر شعراء وادباء کے وہم وگمان میں بھی نہ تھے۔ سید احتشام حسین تو یہ تک کہتے ہیں کہ "کوئی قطعی ثبوت تو نہیں دیا جاسکتا لیکن غالب کے اردو خطوط میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کی اردو نثر کی سادگی دیکھ کر

یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ غالب نے کلکتہ کے دو سالہ قیام میں اس جدید نثر کا مطالعہ کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا جس کے حسن اور اثر سے اردو کے نثر نگار اس وقت ناواقف تھے''۔

غالب نے اپنے سفر کلکتہ میں جو کچھ جانا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے شعور میں نئے انگریزی نظام حکومت و اقتصاد کا ایک دھندلا سا نقشہ بنتا چلا گیا۔ جس کا مقابلہ وہ ہندوستان کے موجودہ جاگیرداری نظام سے کر سکتے تھے۔ نتیجتاً انہیں کہنا پڑا:

صاحبان انگلستاں رانگر
شوہ و انداز اینان رانگر
داد و دانش رابہم پیوستہ اند
ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند
آتش کزسنگ بیروں آورند
ایں ہنرمنداں زخس خوں آورند

کلکتہ میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ اسکے اثرات کا شمالی ہند تک پہنچنا ناگزیر تھا۔ جو غدر کی صورت میں دہلی پہنچا۔ سفر کلکتہ غالب کی زندگی کا اہم موڑ تھا۔ غدر انکی زندگی کا ایک موڑ تو کہلایا جا سکتا ہے مگر اتنا اہم نہیں کہ غالب کو حیران کر دے گو کہ اپنے بھائی یوسف مرزا کی عین غدر کے دوران وفات سے غالب اپنی بے سروسامانی کی وجہ سے پریشان ضرور ہوئے۔ غالب پر غدر کی اثرات کی نوعیت کیا تھی:

''غدر کے متعلق غالب کوئی گہری سیاسی رائے نہیں رکھتے تھے۔ اس

کے علاوہ وہ پہلے ہی سے اس نظام کی تباہی کا اتنا احساس رکھتے تھے
کہ جب حکومت بدلی تو انہیں حیرت نہ ہوئی بلکہ ان کے لیے یہ کوئی
ایسی بات ہوئی جس کا انہیں پہلے سے یقین تھا۔۔۔غالب کا نقطہ نظر
اس سلسلہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عذر کی وجہ سے پیدا ہونے والی
سیاسی تبدیلی کو ایک حقیقت سمجھ کر اور انگریزی حکومت کو ایک نئی
سلطنت سمجھ کر قبول کر لیا جائے۔ اس لیے اس کے اندر اس نئی
حکومت کے خلاف کوئی جذبہ نہیں معلوم ہوتا''

(سید احتشام حسین ''غالب کا تفکر'')

اگر غالب کے ذہنی ارتقاء پر غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ غالب کی ذہنی ترقی کا دور عذر تک ختم ہو چکا تھا۔ وہ عذر کے بعد بارہ برس اور زندہ رہے جس کے دوران شعر گوئی تقریباً ختم کر دی۔ شاعری میں شاگردوں کی غزلوں کی تصحیح تک محدود ہو گئے ہاں البتہ انہوں نے اردو میں خطوط نگاری شروع کر کے شاعری کی کمی کا ازالہ کرنے کی ایک صورت ضرور نکالی:۔

''غالب کے یہاں نکتہ سنجی اور شوخی شروع سے تھی۔ اور اس کے اثر
سے ان کی شاعری میں ایک لطیف چاندنی بھی موجود تھی مگر خطوں
میں اس دولت بیدار نے ایک ایسا حسن اور کیف بھر دیا ہے جو غالب
کی جامعیت اور ان کی بھرپور شخصیت کا اردو ادب کو آخری تحفہ

ہے۔۔۔ غالب کو آخری وقت تک اپنے اوپر قابو رہا۔ وہ اپنے جگر پاروں کی قربانی بھی کر سکتے تھے اور جب ایک شمع بجھنے یا مدہم پڑنے لگتی تو دوسری شمع جلا سکتے تھے۔ ڈاکٹر جانسن کی طرح وہ بھی ایک ایسی شخصیت رکھتے تھے جو ان کے سارے کارناموں سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔۔۔ ان کی شخصیت کی آب وتاب سے ان کی تصانیف کو روشنی ملتی رہی مگر ان کا اپنا شعلہ رخشندہ وتابندہ رہا"

(آل احمد سرور "غالب کا ذہنی ارتقاء")

کہتے ہیں کہ غالب کی شخصیت ان کی شاعری سے زیادہ انکے خطوط میں جھلکتی ہے۔ انکی خطوط نویسی کی افادیت ذیل کے اقتباسات سے پوری طرح عیاں ہوتی ہے۔ اور ساتھ میں غالب کی شخصیت بھی:-

"غرض مرزا نے اپنی شخصیت کے مختلف پہلو اس تفصیل سے واضح کر دیئے ہیں کہ تنہا انہی کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کا جامع اور مکمل نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ خطوط محض اس وجہ سے بیش بہا نہیں کہ غالب کے خطوط ہیں بلکہ ان کی بیش بہائی کے دوسرے وجوہ بھی ہیں مثلاً ان کے آئینے میں غالب کی شخصیت ایسے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی ہے کہ اکثر اصحاب کو زندگی میں بھی اسے اس تفصیل سے دیکھنے کا موقع شاید ہی ملا ہو۔ ان میں غالب کے دل ودماغ کی مکمل تصویر

خود ان کے موقلم سے تیار ہو کر سامنے آ گئی ہے اور یہ تصویر اس جامعیت سے نہ ان کے کلیات نظم فارسی میں ملتی ہے نہ کلیاتِ نثر فارسی میں اور نہ اردو دیوان میں"

(مولانا غلام رسول مہر "خطوط غالب کی اہم خصوصیات")

"اردو کے اس بڑے شاعر کی داستان حیات یوں تو بڑی سادہ ہے لیکن حقیقت میں اس میں بڑی رنگارنگی ہے جس کا ایک ہلکا سا عکس ان کی شاعری میں نظر آتا ہے مگر اس کی پوری جھلک ہم ان کے خطوط میں دیکھتے ہیں۔۔۔۔ غالب کی زندگی میں جو رکھ رکھاؤ ہے جو حسن' سلیقہ اور نفاست ہے وہی رکھ رکھاؤ' حسن سلیقہ اور نفاست ان کے خطوط میں بھی ہے اور یہی ان کا فن ہے"

(ڈاکٹر شوکت سبزواری "غالب خطوط کے آئینے میں")

جب ہم غالب کے مزاج کی بات کرتے ہیں تو دراصل ہم ان کے مزاح کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے اکثر نقاد اس نکتہ پر متفق ہیں۔ حالی نے غالب کو حیوان ظریف کا درجہ دیا ہے۔ غالب کے اکثر اشعار کو انکی حسِ مزاح کو دماغ میں رکھتے ہوئے پڑھیے تو ان میں چھپا ہوا مزاح سامنے آ جاتا ہے۔ بادی نظر میں یہی اشعار سنجیدہ محسوس ہوتے ہیں یہ چند اشعار دیکھیے جو ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنے مقالے "حیوان ظریف" کے لیے چنے ہیں۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می تواں یافت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

اب ان کے اخلاق و عادات سے متعلق بھی جانکاری ضروری ہے۔ کیونکہ انسان کی شخصیت اسکے اخلاق و عادات کا بھی پرتو ہوتی ہے۔ جیسا کہ گذر چکا غالب کے اخلاق و عادات اور انکی شخصیت کے باقی مظاہر انکے خطوط میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مگر ان کے چند نقادان کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ آیئے دیکھیں:-

''مرزا کے اخلاق بہت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جوان سے ملنے جاتا تھا۔ بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے۔ اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لیے ان کے دوست ہر ملت اور مذہب کے نہ صرف دہلی

میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط انہوں نے دوستوں کو لکھے ان کے ایک ایک لفظ سے مہر ومحبت اور غم خواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے"

(الطاف حسین حالی "اخلاق وعادات")

"سب سے پہلے یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب ایک بے شکایت زندگی پر یقین رکھتا ہے اور یاد رکھنا چاہئے کہ بے شکایت زندگی کوئی معمولی مطمع نظر نہیں بلکہ انسانی اخلاق کا ایک نہایت بلند مقام ہے کسی آدمی کی شخصیت ناپنے کے لیے یہ جاننا کافی ہے کہ وہ اپنے ماحول یا اپنی قسمت کے خلاف شکایت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یا ان سے سمجھوتہ کر کے خوش رہنے کی کوشش کرتا ہے"

(اقبال سلمان "اخلاقیات غالب")

"غالب کی شخصیت واہمیت کا تصور کرتے وقت ہم کو یہ باتیں نظر انداز نہیں کرنی چاہئیں۔ غالب نے کسی حال میں سوا اپنے کسی اور کی آڑ نہ پکڑی اور اس آڑ پکڑنے میں وہ کہیں بھاگتے چھپتے نہ پھرے۔ ہر طرح کی مشکلات کا تمام عمر سامنا رہا لیکن انہوں نے فریاد کی نہ بغاوت۔ ہر مسماری کے نیچے سے پھٹے حال لیکن مسکراتے ہوئے نکلے۔ تو رانی خون گرما جاتا تو اپنے ناقدروں پر جی کھول کر برس بھی پڑتے۔ اردو شاعری

میں غالب پہلے شخص ہیں جنھوں نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے"

(رشید احمد صدیقی "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا")

اگر پوچھا جائے کہ غالب کا پیغام کیا ہے۔ تو ان کے کلام کے مطالعہ سے کوئی ایسا پیغام نہیں ملتا جس سے ظاہر ہو کہ وہ اپنی قوم یا اہل قوم یا اہل دنیا کو کوئی خاص پیغام دینا چاہتے تھے۔ نہ ہی کوئی ایسی علامت ہی ملتی ہے جیسے اقبال کے ہاں شاہین کی علامت ہے یا خوشحال کے ہاں مردتنگیال کی علامت ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غالب نے اردو شاعری اور اردو نثر کو ایک نیا رنگ عطا کیا۔ آل احمد سرور بھی اس سے متفق ہیں:-

> "غالب کی شاعری کا کوئی پیغام نہیں ہے جس طرح حالی یا اقبال کا پیام ہے۔ وہ میر کی طرح ایک بڑے اور گہرے رنگ کے مالک بھی نہیں ہیں ان کے یہاں ایک رنگارنگی اور اس رنگارنگی میں انفرادیت اور انوکھا پن ہے۔ یوں تو انہوں نے ہر صنف سخن میں داد کمال دی اور حالی نے انہیں جامع حیثیات اور خسرو اور فیضی کی بساط کا آخری فرد غلط نہیں کہا ہے۔ مگر دراصل ان کی سب سے اچھی ترجمان غزل ہے۔ غزل گو شاعر کوئی پیام پیش نہیں کرتا۔ وہ بحر کی تہہ سے موتی چننے میں یا باغ میں کلیاں توڑنے ہی میں مصروف رہتا ہے"

(آل احمد سرور "غالب کا ذہنی ارتقاء")

اب مرزا کا آخری وقت آن پہنچا تھا۔ ضعیف ہو گئے تھے۔ یہ اچھا ہوا کہ انکے فارسی اور

اردو دیوان اور خطوط کا مجموعہ عود ہندی ان کی زندگی ہی میں چھپ چکے تھے۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ پیر کے دن ظہر کے وقت غالب اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب دہلی میں دفن ہوئے۔ ۷۲ برس کی عمر پائی۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

جان دی ' دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آخر میں غالب کے چند اشعار جن سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلا دو کہ ہم بتلائیں کیا

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھادیا کہ یوں

کلکتہ کا جو ذکر کیا تونے ہم نشیں
اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دوگر خطا کرے کوئی

خوشحال وغالب کی تعلیم وتربیت اور علمیت

خوشحال خان خٹک

خوشحال نے پشتونوں کے خٹک قبیلے کے سردار شہباز خان کے ہاں آنکھ کھولی۔ ظاہر ہے ان دنوں جیسا کہ دستور تھا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے خوشحال کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ لیکن جیسا کہ انکے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے وہ مکتب کی تعلیم پر پورا دھیان نہ دے سکے۔

"میں پورے جہان کا علم سیکھ لیتا اگر مجھے شکار کی لت نہ پڑی ہوتی"

خوشحال کی تعلیم وتربیت میں انکے والد ملک شہباز خان خاص دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے جہاں مکتب کے علاوہ خوشحال کی تعلیم کے لیے گھر پر بھی انتظام کیا ہوا تھا وہاں تربیت کے سلسلہ میں زیادہ فکرمند رہتے۔ ان حالات کے متعلق خوشحال کے کلام میں یہ شعر ملتا ہے:-

ډېر زما په تربيت وو
تل به ئې ما سره شدت وو

ترجمہ:- ''میرے والد کو میری تربیت کا بہت زیادہ خیال رہتا تھا۔ اسی لیے وہ اس ضمن میں مجھ سے ہمیشہ سختی برتتے تھے''

بچپن میں خوشحال کا زیادہ تر وقت شکار اور سیر و تفریح میں گذرتا۔ کہتے ہیں کہ اسکے بعد خوشحال نے علم عمومی مطالعے اور ذاتی تجربوں اور مشاہدوں سے حاصل کیا۔ خوشحال نے اپنے کلام میں اپنی طبیعت کو عطائی کہا ہے۔ یہ محض اپنی انکساری اور عاجزی کا اظہار تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ایم اقبال نسیم خٹک پشتو ڈیپارٹمنٹ پشاور یونیورسٹی فرماتے ہیں:-

''خوشحال نے اپنے دور کے مروجہ علوم پر بخوبی عبور حاصل کیا۔ عربی جانتا تھا۔ فارسی ادبیات کا اچھا عالم تھا۔ پشتو زبان میں سر آمد روزگار تھا اس سب کچھ کے باوجود وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ شکار کے شوق نے اسے علم حاصل کرنے نہ دیا۔ لیکن اصل صورت حال وہ تھی جو خوشحال بابا نے اپنے ایک قطعہ میں یوں بیان کی ہے:-

ترجمہ:- نظم ہو کہ نثر ہو یا خط

پشتو زبان پر میرا بے حساب حق ہے

نہ تو اس زبان میں ماضی میں کوئی کتاب تھی نہ ہی اس کا اپنا کوئی رسم الخط۔ ہاں البتہ میں نے اب پشتو میں چند کتابیں تصنیف کر ڈالی ہیں''

(ڈاکٹر ایم اقبال نسیم خٹک ''مقدمہ دیدبۂ خوشحال'')

بقول خوشحال' شکار، قلم اور کتاب کے ساتھ انکا رشتہ آخر تک استوار رہا۔ قلم اور کتاب کے ساتھ تو یاری بڑھاپے میں بھی رہی:

ترجمہ:-"میرا اگر کوئی یار ہے تو قلم ہے یا پھر کتاب لیکن بڑھاپے میں نظر کی کمزوری کی وجہ سے اب یہ یاری بھی ختم ہوئی"

حقیقت یہ ہے کہ خوشحال ایک عالم فاضل انسان تھے۔ انکا اسلامی علوم پر عبور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شاہ اویس صدیقی ملتانی کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ پروفیسر شاہ جہان خان کے مطابق خوشحال اپنے کلام میں اپنے استاد مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

مولانا عبدالحکیم د دنیا و دین حکیم

یعنی" مولانا عبدالحکیم جو دین اور دنیا کے حکیم تھے" اسکے علاوہ اپنی کتاب دستارنامہ کے تیسرے ہنر "تحریر" کہ داخل کسب کمال ہے کے ذیل میں حضرت شاہ اویس صدیقی ملتانی کے متعلق یوں کہا ہے" نیک بخت شخص کبھی فن سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ عبث کام نہیں کرتا" ہمارے استاد شاہ اویس صدیقی ملتانی بہت بزرگ اور مقدس شخصیت کے مالک تھے۔ وہ علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ ور تھے۔ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے:-

معشوقہ کتاب است و کمان است و قلم
دیگر ہمہ محنت و رنج است و الم

کہتے ہیں کہ خوشحال کے کلام میں صوفیانہ رنگ اپنے استاد مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے

تشرف سے آیا جو جہانگیر اور شاہ جہان کے دور میں گذرے تھے۔ اور ۱۰۶۷ھ میں وفات پا گئے۔

خوشحال کی تعلیمی استعداد کے متعلق قاضی محمد وجیہہ الدین یوں رقمطراز ہیں:-

''خوشحال عالم تھا اور علم دوست بھی علماء کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا اور اسی لئے علماء کے ساتھ محبت رکھتا تھا۔ اپنے زمانے کی فارسی، عربی اور دوسرے مروجہ علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ فارسی زبان پر عبور کا یہ حال تھا کہ فارسی زبان میں بھی قابل قدر شاعری کی۔ اپنے کلام میں عربی الفاظ استعمال کرتا اور قرآن پاک کی تعلیمات سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے دینی علوم حاصل کرنے کے لئے کافی جدوجہد کی تھی۔ اسی لئے اپنی اسلامی فقہ کی کتاب ''فضل نامہ'' میں اس نے فقہ اور دوسرے مذہبی مسائل پر بحث کی ہے خوشحال نے عربی کی مشہور کتاب ''ھدایہ'' کا پشتو میں خوبصورت ترجمہ کیا ہے''

(قاضی محمد وجیہہ الدین ''خوشحال مطالعہ ص ۱۷'')

خوشحال کا دیوان اس کی علمیت اور تربیت پر دال ہے خوشحال اپنے دیوان کے متعلق خود کہتے ہیں:-

ترجمہ:- اگر میرے دیوان کے ایک ایک شعر کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد چالیس ہزار سے بڑھ جائے گی''

ایک دوسری جگہ یوں رقمطراز ہیں:-

ترجمہ :-''میرا دیوان علم کے خزانوں کا باغ ہے جس میں قسماقسم کے پھول کھلے ہوئے ہیں''

''میں نے وزن' مضمون' نزاکت اور تشبیہہ میں پشتو اشعار کو عین فارسی تک پہنچا دیا''

''پشتو شعر کو تازہ بہ تازہ مضمون کی بدولت میں نے شیراز اور زخجند کا ہم پلہ بنا دیا''

''جو زمانے کا فاضل ہوگا وہی سمجھ سکے گا کہ خوشحال خان خٹک کا یہ شعر کتنا دل نشیں ہے''

خوشحال نے اپنے کلام میں جابجا اپنے استادوں کو بڑی عزت سے یاد کیا ہے:-

ترجمہ:-''مجھ پر بار بار میرے استاد کا احسان ہو کہ اس نے میرے ضمیر کو زنگ سے پاک کر دیا''

''یہ جو خوشحال کے دل کا طوطا بولنے لگا ہے (تو اس لیے کہ وہ) اپنے استاد کا آئینہ اپنے سامنے رکھے ہوئے ہے''

''ہر اس شخص کو اپنا استاد گردانو جو تجھے کچھ سمجھائے۔ اپنے سے عمر میں چھوٹے کو اپنا بڑا جانو اگر وہ تمہیں کوئی اچھی بات بتائے''

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی خوشحال کی علمیت پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

''خوشحال خان خٹک کو پشتون روایات اور پشتو ادبیات میں بلند رتبہ حاصل ہے ان کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرت

انسانی اور مظاہر کائنات کا صحیح علم و مشاہدہ اور تجربہ رکھتے تھے۔ انکے کلام میں بیک وقت قدیم' روایات' کلاسیکی رجحانات اور جدید تقاضوں کا عکس نظر آتا ہے ان کے علم کی وسعت' نظر کی دقت اور فکر کی صحت کا ثبوت ہے"

(ڈاکٹر رضی الدین صدیقی "پیش لفظ منتخبات خوشحال خان خٹک")

استاد محترم جناب ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی مرحوم استاد شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی خوشحال کی علمیت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:-

"خوشحال خان خٹک کا کلام اسکی وسعت نظر' مطالعہ کائنات اور غیر محدود تجربات و جذبات پر شاہد و عادل ہے۔ رنگارنگی تنوع' ہمہ گیری اور گہرائی دیکھ کر اس کے فطری شاعر اور باکمال صاحب فن ہونے پر ایمان لانا پڑتا ہے اس کے کلام میں زندگی اپنی پوری تابنا کی اور بوقلمونی کے ساتھ دلفریب اور خوشنما جلوے دکھاتی نظر آتی ہے"

(ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی "منتخبات خوشحال خان خٹک")

پروفیسر پریشان خٹک اس موضوع پر یوں رقمطراز ہیں:-

"خوشحال خان خٹک پر لاہور کی بیگم خدیجہ فیروز الدین نامی جس خاتون نے پہلی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس نے خوشحال کی

کتابوں کی تعداد ۳۵۰ بتائی ہے جبکہ میجر راورٹی نے یہ تعداد ۲۵۰ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ اب صرف ۱۶ کتب دستیاب ہیں"

جہاں تک خوشحال کی علمیت کا تعلق ہے تو اُوپر اس کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے مزید تفصیل کے لیے ہمیں جناب میاں سید رسول رسا کی کتاب مقدمہ ارمغان خوشحال کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ خوشحال کی تصانیف کے متعلق میاں صاحب فرماتے ہیں:

"خوشحال خان نظم و نثر کی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں چند ایک یہ ہیں: کلیات خوشحال خان' دستار نامہ (نثر)' فضل نامہ' باز نامہ' سوات نامہ (منظوم سفر نامہ) ہدایہ' آئینہ' فراق نامہ' اخلاق نامہ' فرضنامہ' نام حق' طب منظوم' زنجیری (پشتو شارٹ ہینڈ) اور بیاض۔ خوشحال نے فارسی میں بھی غزلیں چھوڑی ہیں۔

آگے چلکر میاں صاحب کلیات خوشحال خان پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:-

> "خوشحال کی تمام تصانیف میں جتنی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں ان سب میں نظم میں خوشحال خان کی کلیات ایک اہم کتاب ہے۔ یہ اہمیت کے لحاظ سے نہ صرف نظم کی بائیبل ہے بلکہ مضامین کے تنوع ' وسعت اور ہمہ گیریت میں پشتو کا شاہنامہ ہے۔ اس کتاب کو پڑھے بغیر پشتون کی فطرت کی رنگا رنگ' گوں ناگوں اور قسما قسم پیچیدہ سادگی کی سمجھ آنا مشکل کام ہے۔ اور جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے پشتون کو پہچاننے کے لیے خوشحال خان کی کلیات کا

مطالعہ ضروری ہے"

(میاں سید رسول رسا "مقدمہ ارمغان خوشحال")

"نظم کی تکنیک کے نقطہ نگاہ سے خوشحال خان کی کلیات پشتو ادب میں ایک یگانہ موتی ہے۔ اور اسمیں بہت سی اصناف پائی جاتی ہیں مثلاً غزل، رباعی، قطعہ، قصیدہ، مخمس، مسدس، معشر، ترکیب بند، مربع، مثنوی اور ترجیع بند وغیرہ، جیسے کہ فارسی ادب کا بہترین سرمایہ فردوسی کا شاہنامہ ہے۔ اسی طرح پشتو ادب میں ہر لحاظ سے بلند ادبی اور فنی شاہکار خوشحال خان کا دیوان ہے۔ اگر پشتو ادب کا پورا سرمایہ ایک طرف رکھیں اور کلیات خوشحال خان دوسری طرف تو خوشحال خان کا دیوان پھر بھی بھاری نکلے گا"

(میاں سید رسول رسا "مقدمہ ارمغان خوشحال")

سر اولف کیرو اور ایولن ہاول نے اپنی کتاب The Poems of Khushal khan khattak - 1963 میں صفحہ ۱۱ پر خوشحال کی علمیت پر یوں روشنی ڈالی ہے:-

" Khushal was no crude swash- buckler, but a gentleman, well educated after the fashion of his day with some knowlege of Arabic derived from the Study of the Koran and fine Vocabular of Arabic words. To hold his own at court as he

did, he must have been quite at home in persion of the kind written and spoken in India and he Obviously had some knowledge of persion litrature. It is chiefly to him that his native tongue which he wielded with complete mastery owes its enrichment with loan words borrowed from these sources and they are to it as words from Greek Latin and Norman French are to English"

اسی کتاب کے صفحہ ۱۳ پر خوشحال کی حسن پرستی پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے۔

"For beauty in all its forms whether of mountains trees flowers birds or women, he had ever an eye and for the beauties of nature more than eye an almost wordsworthian sense of interfusion which leads him to make the startling confession. "Da khulio da Jamal puh nendare kkhe mi khudai byamund" .

"In contemplation of perfection of beauties, I found God."

پشتون قوم کی خوش بختی ہے کہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے خوشحال خان خٹک کی علیت کا ذکر ان زرین الفاظ میں کیا ہے۔

خوش سرود آں شاعر افغاں شناس آں کہ بیند باز گوید بے ہراس
آں حکیم ملت افغانیاں آں طبیب علت افغانیاں
راز قومے دید و بے باکانہ گفت حرف حق باشوخی رندانہ گفت

خوشحال نے اپنی علمیت سے متعلق جو کچھ کہا وہ انکے ان اشعار سے عیاں ہے:-

په درون كښې مې پراته دي ډېر گنجونه
په معنىٰ كښې لكه كان د سيم و زريم

ترجمہ:- میرے باطن میں بڑے خزانے چھپے ہوئے ہیں (اسلئے) معنیٰ کے لحاظ سے میں سیم وزر کی ایک کان ہوں۔

ما خوشحال څه دا اشعار ويلى نه دي
يو اسرار مې هـويـدا كـړلـه اشعاره

ترجمہ:- مجھ خوشحال نے صرف اشعار ہی نہیں کہے بلکہ ان کے ذریعے ایک اسرار کو ہویدا کیا ہے۔

دا رنگينې معنې چيرې دي خوشحاله
چې را درومي لكه گل په بياض ستا

ترجمہ:- اے خوشحال یہ رنگین معنی کہاں پر ملتے ہیں کہ تیری بیاض پر پھول بن کر اترتے ہیں۔

خوشحال خان کا یہ تاریخی قطعہ انکی شخصیت اور علمیت پر دال ہے:-

''پھر نہ مجھ جیسا عزت مند اور ننگ و نام کا متوالا پیدا ہوگا
اور نہ مجھ جیسا جنگجو پیدا ہوگا
خٹک (قبیلے) کا کیا ذکر تمام افغان قوم میں
شاید ہی مجھ جیسا دانشمند پیدا ہو''۔

اسد اللہ خان غالب

ادھر مرزا غالب نے ایک ترکوں کے ایک مشہور خاندان میں آنکھ کھولی۔ باپ اور بعد میں چچا کی وفات کے بعد غالب کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ جہاں کا ماحول امیرانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انکی زندگی کا ابتدائی زمانہ رنگینیوں اور سرمستیوں میں گذرا۔ اس ضمن میں غالب نے خود کہا ہے کہ ''میں لہو ولعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہوگیا''

باوجود اس سب کچھ کے غالب کی تعلیم کسی قدر باقاعدگی کے ساتھ ہوئی انکو شیخ معظم اور نظیر اکبر آبادی جیسے استاد ملے۔ ملا عبدالصمد سے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ غالب دو سال ملا عبدالصمد کے ساتھ رہے۔ چونکہ غالب کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ملے اس لیے انکی تعلیمی استعداد خاصی تھی۔ وہ فارسی زبان بخوبی جانتے تھے۔ فارسی ادب سے لگاؤ تھا۔ عربی زبان میں بھی کچھ استعداد تھی۔ عربی میں صرف ونحو بھی اپنے استاد سے پڑھا۔ فلسفہ، تصوف، طب، منطق اور معانی و بیان سے دلچسپی رہی۔ فن عروض میں بھی پوری دستگاہ تھی۔

> ''غالب ایک نورانی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اسلاف کا گرم خون انہیں ورثے میں ملا تھا۔ آبا و اجداد کی امارت نے جسے وہ کہیں

سپہ گری سے کہیں مرزبانی سے تعبیر کرتے ہیں ان کے دل میں انانیت کے جذبے کی تخلیق کی تھی۔ باپ اور چچا کی بے وقت موت کے باوجود ان کا بچپن ننھیال میں بڑے اللے تللے کے ساتھ رنگ رلیوں میں بسر ہوا۔ تاہم جوانی کی عمر کو پہنچتے پہنچتے وہ علوم متداولہ کی تحصیل کر چکے تھے۔ جوان دنوں شرفاء کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ فارسی کی تکمیل کے علاوہ جس سے انہیں فطری لگاؤ تھا وہ منطق، فلسفہ، تاریخ، طب اور نجوم میں تھوڑی بہت دستگاہ رکھتے تھے۔ وہ عمر بھر شریعت کی قید سے آزاد رہے"

(ڈاکٹر ناظر حسن زیدی "غالب اپنے اشعار کے آئینے میں")

اسکے علاوہ غالب نے بیدل، حزیں، ظہوری، عرفی، نظیری اور میر کا مطالعہ بھی کیا۔ جس نے اسے دماغی وسعت بخشی۔ یہ جو بعض محقق غالب کو "کم پڑھا لکھا آدمی" ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ذیل کا اقتباس انکے لیے ایک جواب کی حیثیت رکھتا ہے:-

"غالب کی ابتدائی تعلیم بالکل رسمی ہو کر رہ جاتی اگر مُلا عبدالصمد نے غالب کو کچھ راہیں نہ دکھائی ہوتیں، ہرمزد جو اصلاً ایران کا زرتشتی تھا مسلمان ہو گیا اور غالب کی خوش قسمتی سے آگرہ پہنچ کر ان کا استاد بن گیا، غالب نے اس سے فارسی زبان اور پارسی مذہب کے متعلق فیض اٹھانے کا تذکرہ بڑی محبت اور گرمجوشی سے کیا ہے۔ غالب کا

ذاتی مطالعہ بھی وسیع معلوم ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس وقت مطالعہ میں مذہب' اخلاق' تصوف' طب' ہیئت' منطق اور قصص وغیرہ کی وہی کتابیں ہوسکتی تھیں جو عرب' ایران اور ہندوستان میں پانچ چھ سو سال سے رائج تھیں۔ یہ جو اکثر آج کے محققانہ معیار سے غالب کو ''کم پڑھا لکھا آدمی'' ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اس وقت بالکل معمولی نظر آنے لگتی ہے جب ہم غالب کو مولانا فضل حق خیرآبادی' مفتی صدرالدین آزردہ' حکیم احسن اللہ خان' نواب مصطفیٰ خان شیفتہ' حکیم مومن خان اور صہبائی وغیرہ کی صحبتوں میں دیکھتے ہیں۔ یہی اس عہد کے بڑے عالم اور دانشور تھے۔ غالب ان سے بہتر نہ سہی ان کے ہم محفل اور باعزت دوست ضرور تھے''

(احتشام حسین ''غالب کا تفکر'')

اسکے علاوہ بیدل کے تتبع کا زمانہ ختم ہوتے ہی مرزا نے اپنے بیان کی ندرت اور تخیل کی جدت کے لیے اپنا الگ طرز ایجاد کیا جو انہی کے لیے مخصوص تھا۔ اس طرز نے مرزا کو اردو زبان کا بے مثل اور کامل شاعر بنا دیا۔

جب ہم غالب کی تصانیف کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم کر کے حیرانگی ہوتی ہے کہ اردو میں صرف ان کے دیوان اور خطوط کے مجموعے ہی موجود ہیں۔ اور یہ کہ انہوں نے اردو سے زیادہ فارسی میں شاعری کی اور نثر بھی لکھی۔ غالب کی تصانیف کی تفصیل درج ذیل ہے:-

دیوان غالب کے نسخے

اردو دیوان غالب کے پانچ ایڈیشن غالب کی زندگی ہی میں چھپ گئے تھے۔ اورانکی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔ بعض میں اشعار کی کل تعداد ۱۰۷۰، بعض میں ۱۱۱۱، کسی میں ۱۷۹۲، کسی میں ۱۸۰۲ اوربعض میں ۱۷۹۶ تھی۔ اردو دیوان غالب کے مشہور نسخے یہ ہیں۔ نسخۂ طاہریہ، نسخۂ عرشی، نسخۂ سردار جعفری اورنسخۂ مالک رام۔

خطوط غالب کے مجموعے:۔

(۱) عودِ ہندی ۱۸۶۸ء
(۲) اردوئے معلیٰ ۱۸۶۹ء
(۳) ادبی خطوط غالب، مرتبہ مرزا محمد عسکری ۱۹۲۹ء
(۴) مکاتیب غالب، مرتبہ امتیاز علی عرشی ۱۹۳۷ء
(۵) نادر خطوط غالب، مرتبہ محمد اسماعیل رسا ہمدانی ۱۹۳۹ء
(۶) خطوط غالب، مرتبہ مولوی مہیش پرشاد ۱۹۴۱ء
(۷) نادرات غالب، مرتبہ آفاق حسین آفاق ۱۹۴۹ء
(۸) خطوط غالب، مرتبہ مالک رام ۱۹۶۲ء
(۹) غالب کی نادر تحریریں، مولوی خلیق انجم ۱۹۶۲ء

تصانیف غالب فارسی

(۱) پنج آہنگ (۲) مہر نیم روز (امیر تیمور سے ہمایوں تک کے حالات)

(۳) قاطع برہان (۴) دستنبو غدر کے حالات

(۵) کلیات نثر غالب (۶) آہنگ پنجم (فارسی مکاتیب)

(۷) کلیات غالب (فارسی نظم کے دس ہزار اشعار)

(۸) سبد چین (نایاب فارسی کلام (۹) متفرقات غالب

(۱۰) ماثر غالب ۔ ۳۲ فارسی خطوط

غالب کی علمیت مسلم ہے۔ انکے کلام میں ارتقائے خیال کے ساتھ بڑی شاعرانہ صناعی بھی پائی جاتی ہے۔ اور استعاروں کی مدد سے بڑی معنی آفرینی کی گئی ہے غالب کے ہاں غزل' مثنوی' قصیدہ' رباعی کی صنعتیں پائی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی مرثیہ نوحہ اور سہرہ بھی لکھتے تھے۔ فارسی کی طرح ان کے اردو کلام کا مجموعہ بھی ضخیم تھا۔ احباب کے مشورے سے انتخاب ہو کر شائع ہوا۔ وہی اب تک تبرک ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ طاہر نبیرہ آزاد دہلوی مرتب نسخہ طاہر یہ غالب کی شخصیت اور شاعری کا مقام یوں متعین کرتے ہیں:-

''بچپن اور لڑکپن اکبر آباد میں گزرا۔ جوانی میں بسلسلہ مناکحت دہلی چلے آئے پھر ساری عمر یہیں رہے۔ مبدءٔ فیاض نے ذوق سلیم عطا کیا۔ فارسی کے ساتھ مناسبت ازلی و سرمدی تھی۔ ذوق خداداد اور تربیت استاد نے کلام کو سدا بہار کر دیا۔ پچاس سال تک محو سخن گزاری

رہے۔ تصوف اور منطقی مسائل کو عجیب سوز وساز سے ادا کیا ہے۔
فارسی میں آسمان کے تارے توڑ کر لاتے ہیں۔ انہی سے اردو نظم میں
بھی قلم لگائے ہیں۔ نثر میں بھی دریا بہائے ہیں"۔

پروفیسر یوسف زاہد غالب کے شاعرانہ لب ولہجہ کی کامیابی سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:-

"ان (غالب) کی شخصیت اور مزاج کے بعض انفرادی اور شخصی پہلو بھی
ہیں جنہوں نے ان کی شاعری کے لب ولہجہ کو متعین کرنے میں بہت کام
کیا۔۔۔۔ غالب چونکہ فطری طور پر جدت پسند واقع ہوئے تھے اور
کسی قسم کی تقلید، رسم ورواج کی پرستش اور ظاہر داری کو برداشت نہ کرتے
تھے۔ اسی لئے انہوں نے تمام تقلیدی راستوں، بے معنی پابندیوں اور غلام
قسم کی ظاہر داریوں کو رد کر دیا۔ اپنے لیے ذاتی غور وخوص اور شخصی تفکر سے
نئی راہیں تلاش کیں۔ ذاتی تجربات سے نئی اقدار کا کھوج لگایا جو رائج
الوقت، زوال آمادہ اقدار سے بالکل مختلف تھیں۔ اسی بنا پر زندگی کے ہر
شعبے میں ان کی مخالفت ہوئی۔ شعر وفن، علم وادب اور لغت نویسی میں بھی
لوگوں کو سند نہ مانتے تھے۔ وہ تمام مخالفتوں کا اکیلے مقابلہ کرتے رہے اور
کسی سے دبے نہیں۔ انہیں اپنے علم پر اتنا یقین تھا کہ بغیر غور وفحص اور
عقل وبرہان سے پرکھنے کے وہ کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے تھے"

(پروفیسر یوسف زاہد "غالب کا شاعرانہ لب ولہجہ")

غالب کے ہاں یہاں وہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جو ہمارے اپنے زمانے کے لگتے ہیں۔ انکی علمیت' قادرالکلامی اور اپنے زمانے سے پہلے پیدا ہونے کی خصوصیت نے ان سے ایسے اشعار کہلوائے:-

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا ' اشارت کیا ' ادا کیا

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

کسی بھی دوسرے شاعر کی طرح غالب نے بھی اپنی علمیت کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

''غالب کی علمیت اور زبان پر گرفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ رمزِ بلیغ کا استعمال بھی بخوبی کرتے تھے۔ غالب کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت جو اس کے اور سترھویں صدی کے انگریز شاعر ڈون (Donne) کے یہاں مشترک ہے رمزِ بلیغ (Conciet) کا استعمال ہے۔ یعنی ایسی دو اشیاء کے درمیان مشابہت و مماثلت قائم اور ظاہر کی جائے جو بادی النظر میں ایک دوسرے سے بمراحل دور ہوں لیکن جن میں غور کرنے پر ایک گہری اندرونی وابستگی متعین کی جا سکے:-

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر''

(اسلوب احمد انصاری ''غالب کی شاعری کے چند بنیادی عناصر'')

گو غالب نے اپنے بڑھاپے میں کم کم شعر کہے۔ مگر کہتے ہیں کہ آج وہ محض اپنے اسی عہد کے کلام کی بدولت زندہ اور جاوداں ہے۔ شیلے نے کیا خوب کہا ہے:-

"Our Sweetest Songs are those that tell of saddest thought, our

singerest Laughter with some pain is fraught"

غالب کو زمانے کی بے قدری کا شکوہ رہا۔ مگر جاتے جاتے بھی یقین تھا کہ ان کی شہرت اور عظمت دنیا پر ظاہر ہو کر رہے گی۔

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

موازنہ

خوشحال و غالب کی ابتدائی تعلیم اور علمیت کا موازنہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بچپن میں علم حاصل کرنے کے مواقع تو ملے مگر انہوں نے اپنی اپنی جودت طبع اور حالات کے مطابق اتنا کچھ حاصل نہ کیا جو انہیں حاصل کرنا چاہیئے تھا گو کہ غالب کو علم حاصل کرنے کے مواقع نسبتاً زیادہ ملے۔ اگر خوشحال کو مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شاہ اویس صدیقی ملتانی جیسے جید استاد نصیب ہوئے تو غالب کو ملا عبدالصمد کی صورت میں ایک نہایت عالم و فاضل استاد ملا۔ بہر حال ان دونوں کی شاعری اور نثر کا معیار انکی ابتدائی تعلیم اور بعد میں زندگی کے تجربات سے حاصل ہونے والی آگہی سے کئی اونچا ہے جس کی وجہ انکی خداداد صلاحیتوں اور الہام الٰہی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ:۔

"نشاۃ الثانیہ (Renissance) کے شاعر بھی شاعری کو عطیہ وہبی سمجھتے تھے۔ سپنسر (Spencer) کے بقول" شاعری ایک عطیہ الٰہی ہے جو مشقت اور مطالعے سے حاصل نہیں ہو سکتا ہاں ان دونوں سے

سنوارا جاتا ہے'' مغرب کے نئے نقادوں میں سے ہر برٹ ریڈ (Herbertreed) نے بھی اپنی تنقیدی کتاب ورڈز ورتھ (Words Worth) میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں اور شاعری کو'' الہامی کیفیت'' کہا ہے''

(اسماعیل حسن خان'' غالب کا نظریہ شعر'')

دونوں نے شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھی یعنی خوشحال نے اپنی مادری زبان پشتو میں شاعری زیادہ کی (چالیس ہزار اشعار چھوڑے ہیں) جبکہ پشتو نثر میں انکی ایک ہی تصنیف (دستارنامہ) ملتی ہے۔ فارسی میں خوشحال نے پچیس غزلیں کہیں جو ۲۵۰ اشعار پر مشتمل ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری'' اس قدر کم شعر کہہ کر بھی خان نے فارسی ادب میں اپنے لیے ایک ایسا مقام پیدا کیا جس کی ایرانی ناقدین تائید کرتے ہیں'' خوشحال نے بعض غزلیں ایسی بھی کہی ہیں جن میں فارسی اور پشتو زبان کے الفاظ شعر کے دوسرے مصرعے میں اکٹھے استعمال کئے ہیں۔ جس سے ایک نئی بات پیدا ہوتی ہے۔ یا جن میں ایک مصرع فارسی کا تو دوسرا پشتو کا ہے۔ غالب نے اردو میں تقریباً دو ہزار اشعار پر مشتمل دیوان چھوڑا ہے جسے وہ'' بے رنگ من است'' کہتے تھے۔ اردو ہی میں خطوط لکھے جو اردو ادب پر ایسے ثبت ہوئے کہ اظہر من الشمس ہو گئے ہیں۔

فارسی میں غالب نے زیادہ لکھا جس میں نظم (دس ہزار اشعار) اور نثر کی تحریریں شامل ہیں۔ اس موازنہ کا آخری نکتہ یہ عرض کرنا ہے کہ جہاں خوشحال نے غیر مادری زبان فارسی

کو ٹھکرا کر اپنی مادری زبان پشتو میں اپنا مافی الضمیر سمجھایا اور کامیاب رہا و ہاں غالب نے فارسی میں جو کچھ لکھا اس پر بہت فخر کرتے تھے۔لیکن انہیں شہرت دوام اٹھارہ سو اشعار پر مشتمل اردو دیوان (جسے وہ اپنی فارسی شاعری سے کم تر سمجھتے تھے) اور اردو نثر (مکتوبات نگاری) سے ملی۔

خوشحال و غالب

مذہب و مسالک

جہاں تک خوشحال و غالب کے مذہب و مسالک کا سوال ہے تو دونوں خدا کی وحدانیت' رسولؐ کی رسالت اور ختم نبوت پر ایمان رکھتے تھے۔ دونوں خلفائے راشدین وصحابہ کرام کے ساتھ ساتھ اہل بیت رسول سے نہایت درجہ کی عقیدت رکھتے تھے۔

خوشحال خان خٹک

خوشحال خان مذہبی عقیدہ میں پکے مسلمان تھے اور اہل سنت والجماعت میں حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک مذہبی قصیدہ میں اپنے مذہبی عقائد کا ذکر یوں کرتے ہیں:۔

> ''میں پشت بہ پشت ایک محمدی مسلمان ہوتا آیا ہوں۔ چاروں یاران نبی (خلفائے راشدین) کو مانتا ہوں۔ اور اسکو بھی صحیح جانتا ہوں کہ چار مذاہب یعنی حنفی' مالکی' شافعی اور حنبلی ہیں۔ ان میں سے میں حنفی مذہب کا دعویٰ رکھتا ہوں۔ اللہ نے میرے دل میں علماء کے لئے بہت زیادہ عزت رکھی ہے مگر موجودہ دور کے شیوخ کے لیے کچھ کم۔ نہ میں خراباتی ہوں نہ قمار باز اور نہ زناکار۔ نہ ہی میں قاضی یا

مفتی ہوں جن کی نظریں چند درہم پر رہتی ہیں''
خوشحال کے چند دوسرے اشعار سے بھی انکے مذہبی عقیدے پر روشنی پڑتی ہے:-

'' میں نے محمدؐ کے عرفان سے اللہ کا عرفان پایا
محمدؐ پاک ہیں اور انکے سبحان (اللہ) بھی پاک ہیں''

'' اگر اللہ کو پہچاننا چاہتے ہو
تو محمدؐ اور علیؓ کی پیروی کرو ''

'' جو لوگ ابوبکرؓ و عمرؓ کو بُرا بھلا کہتے ہیں
اگر وہ منہ سے کلمہ طیبہ کہتے بھی ہوں تب بھی کافر ہیں''

خوشحال خان کی نظر میں خلفائے اربعہ کی قدر، عزت اور احترام کرنا ہر مسلمان کے مذہبی عقائد کا جزولاینفک ہونا چاہئے۔ اور جو ایسا نہ کرے اسکی مسلمانی میں خلل ہے۔ رافضی اور خارجی کے لئے فرمایا:-'' دونوں کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک کی آنکھیں سیخ میں پروئی جائیں اور دوسرے کا کلیجہ''

جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے۔ خوشحال خان کو اہل بیت رسولؐ خصوصاً حضرت علیؓ سے خاص رغبت تھی۔ سنی عقیدے کے چاروں آئمہ کے علاوہ وہ اثنا عشری عقیدہ کے بارہ اماموں کو بھی ہدایت اور احترام کا مستحق جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سوات

کے سفر کے دوران حضرت اخوند درویزہؒ کے خلیفۂ خاص شیخ میاں نور نے خوشحال خان پر رافضی ہونے کا الزام لگایا تھا۔مگر خوشحال خان نے اپنی کتاب سوات نامہ میں بانگ دھل اس الزام کو جھٹلایا۔اور اسکے جواب میں یہی کہا کہ میں سنی العقیدہ حنفی ہوں۔حضرت محمدؐ کو آخری نبی جانتا ہوں۔چہار یاران نبیؐ (خلیفہ راشدین) کو حق جانتا ہوں۔اہل بیت رسولؐ سے حد درجہ محبت رکھتا ہوں۔حضرت علیؓ کے ساتھ خاص رغبت ہے۔خوشحال کے مسلک کو اسکے اپنے ایک شعر میں یوں سمویا گیا ہے۔

''میں پاکیزہ سنی مذہب ہوں اور کچھ نہیں ہوں
جو مجھے کچھ اور سمجھتا ہوتو اس کے سر میں خاک''

غالب

اُدھر مرزا غالب کے شیعہ یا سنی ہونے سے متعلق کافی چہ میگوئیاں ہوتی رہی ہیں۔انہوں نے دو قصائد حضرت علیؓ کی تعریف میں لکھے۔ان قصائد منقبت میں سے ہر ایک کا مطلع ملاحظہ ہو:-

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

د ہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

سید قدرت نقوی اپنے مضمون ''غالب کون ہے''؟ میں غالب کے عقیدہ سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:-

''اس کے علاوہ غزلیات میں تیرہ شعر جناب امیر کی شان میں ہیں۔ جن میں گیارہ شعر معروضی یا خطابی ہیں اور دو شعر اعتقادی حیثیت رکھتے ہیں''

امام ظاہر و باطن ' امیر صورت و معنی
علی ولی ' اسداللہ ' جانشین نبی ہے

غالب ہے رتبہ' فہم و تصور سے کچھ پرے
ہے عجز بندگی جو علی کو خدا کہوں

ایک جگہ مرزا غالب اپنے عقیدے کو امین الدین خان کے نام ایک خط میں کھل کر یوں بیان کرتے ہیں:-

''میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں الا اللہ' لا موثر فی الوجود والا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں مفترض الطاعت تھے۔ محمدؐ پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلینؐ اور رحمت اللعالمینؐ ہیں۔

مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے۔ اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسنؓ۔ ثم حسینؓ اسی طرح مہدی موعود "بریں زیستم ہم بریں بگذرم" ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت و زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے آپ کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ کا ایندھن بنوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا۔ تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفویؐ و امامت مرتضویؑ اس میں جلیں"

(خطوط غالب صفحہ ۸۰)

دوسری طرف مولانا حالی کو انکے مذہبی عقیدے سے متعلق تحقیق کے سلسلے میں اولیت حاصل ہے۔ اور "یادگار غالب" میں ان کی تحریر کو حرف آخر مان لیا گیا ہے۔ لیکن سید قدرت نقوی کو حالی پر بھی اعتراض ہے کہ ان سے بھی بعض مقامات پر سہو ہوا ہے۔ حالی کی بیان کردہ باتوں کا اعادہ مولانا مہر اور شیخ محمد اکرام نے اپنی اپنی تصانیف "غالب" اور "آثار غالب" میں کیا ہے۔ بعد میں مولانا نیاز فتح پوری بھی اس بحث میں شامل ہو گئے۔ ان اور کچھ دوسرے اصحاب کے نظریات کے مطابق غالب کے مذہبی عقیدے کی تصویر کچھ یوں ابھرتی ہے:-

(ا) "اگرچہ مرزا کا اصلی مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا۔ اور جناب امیر کو وہ رسول خدا کے بعد

تمام امت سے افضل جانتے تھے"

(حالی۔ یادگارِ غالب' ص ۹۵)

(۲)" سید صفدر سلطان نبیرہ محمود خاں نے نواب ضیاالدین مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقہ کے موافق ان کی تجہیز و تکفین کریں۔ مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے موافق ادا کئے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ ان کے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہوسکتا تھا"

(حالی۔ یادگارِ غالب' ص ۱۲۳)

(۳)" غالب کی تحریرات میں شیعیت کی جھلک نمایاں تھی اور بلاشبہ ان کا میلان طبع تشیع کی طرف تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شیعیت تفضیل تک محدود تھی"

(مولانا غلام رسول مہر' "غالب" ص ۳۸۲)

(۴)" غالب یوں چاہے رند بادہ خوار رہا ہو یا کچھ اور لیکن اپنے عقائد کے لحاظ سے یقیناً غالی شیعی تھا"

(مولانا نیاز فتح پوری)

(۵)" مرزا عقائد میں شیعہ تھے اور شیعہ بھی سخت قسم کے۔ حضرت

علیؑ کی ذات وصفات کے متعلق انہیں غلو تھا''

(شیخ اکرام الحق' شعر العجم فی الہند' ص ۲۹۰)

(۶) ''عقیدے کی رو سے مرزا اثنا عشری تھے۔ اور جب شاعرانہ رنگ میں حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تو بہت کچھ کہہ جاتے۔ اس کے علاوہ ''وحدانیت خدا اور نبوت ختم الانبیاء'' کے بہ دل معتقد اور بزبان معترف تھے۔ لیکن ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد کی قباان کے بدن پر پوری طرح پھبتی نہ تھی''

(شیخ محمد اکرام' آثار غالب ص ۲۲۲)

(۷) ''پس مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ (غالب) خدا کی وحدانیت پر یقین کامل رکھتے اور نجات کے لیے نبوت پر ایمان کو لازم سمجھتے ہیں۔ نبوت کے بعد امامت مرتضوی کے قائل ہیں۔ اور اسی طرح بارہ اماموں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور امامت من اللہ ہونے کے معتقد ہیں۔ اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ تفضیلی اثنا عشری شیعہ تھے''

(مالک رام' ذکر غالب'' ص ۲۲۲)

(۸) ''ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر (غالب) زیور اسلام اتار کر ملیہ فری میسن (Free Masson) سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اس کے احباب نے حال اس مذہب نو اختیار کرنے کا اور کیفیت فری

میسن ہاؤس کی دھوکہ دیکر بھی دریافت کی پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا' یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو'

(بال گوبند' ذخیرہ' آگرہ' مارچ ۱۸۶۹ء)

ماخوذ از' آجکل' دہلی ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء

(ذکر غالب و احوال غالب)

ان اقتباسات سے یہ کھلا کہ سب نے غالب کو شیعہ عقیدے کی طرف زیادہ جھکا ہوا پایا پر ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ وہ تفضیلی شیعہ تھے۔ اور حضرت علیؓ کے بارے میں ان کو غلو تھا۔ دوسری بات جو سامنے آئی وہ یہ ہے کہ غالب کا مذہب ''صلح کل تھا'' انکے دوستوں میں شیعہ سنی اور ہندو سب پائے جاتے تھے۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ غالب کی تدفین سنی عقیدے کے مطابق کی گئی۔ اور یہ جو آخری حیران کن بات بال گوبند نے غالب کی فری میسن بننے سے متعلق کی ہے اور ساتھ میں اس عمل کو زیور اسلام اتارنے سے تعبیر کیا ہے۔ بالکل بے بنیاد لگتی ہے۔ کیونکہ بقول سید قدرت نقوی فری میسن بننے کے لئے ترک مذہب لازمی شرط نہیں ہے۔

لیکن آخر میں' میں اپنی تحقیق کے مطابق قارئین کی خدمت میں غالب کی دو ایسی رباعیات پیش کرنا چاہتا ہوں جو ''انتخاب اردو کلیات غالب'' از شمس الرحمٰن فاروقی ساہتیہ اکادمی نئی دہلی پہلا ایڈیشن ۱۹۹۳ء کے آخری صفحہ ۱۲۷ پر موجود ہیں۔ یہ رباعیات پڑھنے کے بعد قارئین کرام غالب کے مذہبی عقیدے کے متعلق خود کوئی فیصلہ کریں۔ میں سمجھتا

ہوں کہ غالب کی صرف یہ دو رباعیات جناب قدرت نقوی کے مضمون ''غالب کون ہے'' کا مؤثر جواب ہوسکتی ہیں:-

رباعیات

(۲۵۲)

جن لوگوں کو مجھ سے ہے عداوت گہری
کہتے ہیں وہ مجھ کو رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہو وے صوفی
شیعی کیوں کر ہو ماوراالنہری

(نومبر ۱۸۵۰ء)

(۲۵۳)

یاران نبی سے رکھ تو لا باللہ
ہر ایک ہے کمال دیں میں یکتا باللہ
وہ دوست نبی کے اور تم انکے دشمن!
لا حول ولا قوۃ الا باللہ

(نومبر ۱۸۵۰ء)

خوشحال وغالب

مے پرستی

شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ مے نوش اور پاک باز۔ ایک مے نوش شاعر کے لئے رندانہ کلام لکھنا ایک معمول ہوسکتا ہے لیکن اگر ایک پاکباز شاعر صبوحی اور لال پری کا ذکر اپنے اشعار میں کرے تو یہ ایک غیر معمولی واقعہ شمار کیا جائے گا۔ مگر ایسے شاعر کو داد دینی پڑتی ہے کہ صرف اپنے مطالعہ (کسی قدر مشاہدہ) اور ذہانت و پرواز تخیل کے زور پر میخانے اور مے خواروں کا پورا پورا نقشہ ہمارے سامنے رکھدیتا ہے۔ یہی حادثہ خوشحال و غالب کے ساتھ بھی پیش آیا۔ جہاں غالب مے نوشی کرکے رندانہ کلام لکھتے تھے۔ وہاں خوشحال مے کا ایک قطرہ بھی لبوں پر رکھے بغیر رندانہ اور اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر سرمستانہ کلام چھوڑ گئے ہیں۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

غالب کی مے پرستی

غالب کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ ان کی ننھیال خاصی فارغ البال تھی۔ اسلیے انکو ایک امیرانہ ماحول ملا۔ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ رنگینیوں اور سرمستیوں میں گذرا۔ اس زمانے کے بارے میں غالب خود کہتے ہیں کہ میں "لہو ولعب اور آگے بڑھ کر فسق و

فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہوگیا'' آگے چل کر زندگی بھر اس ماحول کا اثر غالب کی زندگی پر رہا:-

''یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ امارت اور ریاست کے ماحول میں اس صورت حال کو پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔ غالب کی یتیمی کو بھی اس میں دخل تھا۔ بہر حال اس زمانے کے نقوش غالب کی شخصیت پر بڑے گہرے ہیں۔ زندگی بھر ان کا اثر باقی رہا ہے۔ بےفکری، شراب نوشی، یار باشی، عیش پسندی اور خود پرستی کی خصوصیات ان کی شخصیت میں اسی ماحول نے پیدا کی ہیں''

(احوال ونقد غالب)

آگے چل کر شراب پینے کی عادت انکی زندگی کے ساتھ ایک عادت کے طور پر سامنے آئی۔ اور آخر تک ساتھ رہی:-

''مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انہوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہ پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی ہیں اس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی۔ اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے اور نشے کی جھانجھ میں

داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے۔ مگر داروغہ نہایت خیرخواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں کم پیتے تھے دوسرے اس میں وہ دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں:۔

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوئی اوست
آمیختن بہ بادہ صافی گلاب را

(الطاف حسین حالی "اخلاق وعادات")

اپنے نسبی اور خاندانی ماحول کے باعث غالب میں انانیت کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اس انانیت نے انہیں زندگی میں قدم قدم پر نقصان پہنچایا۔ اور وہ غم روزگار کے ہاتھوں نالاں رہنے لگے۔ انہوں نے اپنی عالی ہمتی سے ہر غم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر ساتھ کے ساتھ خدا سے اس امر کی شکایت اس انداز میں کرتے گویا قصور قدرت ہی کا ہے۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

"غم پھر غم ہے۔ غالب نے اس لاعلاج مرض (غم روزگار) کا کافی مقابلہ کیا مگر جب دیکھا کہ مفر محال ہے تو غم ہستی سے بچنے کے لیے مئے ناب کے دامن میں پناہ لی۔ ان کی زندگی میں گریز کی بس یہی

ایک مثال ہے۔ یہ شراب نوشی کی عادت آخر دم تک باقی رہی۔ نہ جانے اس سے ان کی غرض نشاط تھی یا آتشِ سیال کو محض غم غلط کرنے کا سامان سمجھتے تھے مگر وہ اس مشروب کے بے طرح عادی ہو گئے تھے۔ اور اسے ضروریات زندگی میں سے سمجھتے تھے:-

جاں فزاء ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں'

(ڈاکٹر ناظر حسن زیدی۔ "غالب اپنے اشعار کے آئینے میں")

گو کہ غالب اپنی اس عادت اور فعل پر سخت نادم تھے اور اسے کبھی نہ چھپایا' لیکن شراب کے متعلق ظرافت آمیز باتیں بڑا لطف اور مزا لے کر کرتے تھے۔ دو ایک واقعات اس ضمن میں کافی مشہور ہیں۔ مولانا حالی کے مطابق ایک شخص نے ان کے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شرابخور کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا" بھائی جس کو شراب میسر ہے اس کو اور کیا چاہئے جس کے لئے دعا مانگے" اپنے خطوط میں بھی غالب نے اپنی شراب نوشی کا حال لکھا ہے۔ میر مہدی کے نام ایک خط میں کیا زبردست نقشہ کھینچا ہے:-

"میر مہدی! صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔۔۔ آگ میں گرمی سہی مگر ہائے وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا۔ نفس ناطقہ کو تو وجد بہم پہنچایا"

ایک اور خط میں امین الدین خان کو لکھتے ہیں:-

''ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت وزندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور
اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھے دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا
مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ کا ایندھن بنوں گا۔ اور دوزخ کی آنچ کو
تیز کردوں گا''

(خطوط غالب صفحہ ۸۰)

ڈاکٹر یوسف حسین خان کے مطابق غالب کی رندانہ شاعری میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ متانت اور سنجیدگی کو بھی قائم رکھا ہے اسی طرح شعر کی نزاکت اور باریکی اور اجاگر ہوجاتی ہے اور ذوق لطف اندوز ہوتا ہے:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلاسکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

غالب کے صوفیانہ کلام کو دیکھ کر یہ سوال اٹھایا گیا کہ وہ رند ہوتے ہوئے صوفی نہیں ہوسکتے شہناز ہاشمی نے اپنے مضمون'' کیا غالب کا کلام الہامی ہے؟'' میں اس نکتے پر سیر حاصل بحث کی ہے اور غالب ہی کے رندانہ اشعار کی روشنی میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ غالب

صوفی شاعر نہیں ہو سکتا:-

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

وہ چیز جس کے لیے ہو ہمیں بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام و مُشک و بُو کیا ہے

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیائی

مرزا کے کلام میں شراب' شراب نوشی اور اسکے اثرات کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔ آیئے چند ایک ایسے اشعار کا لطف اٹھائیں:-

پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دوچار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

موج گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گرتو دستار

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایکدن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایکدن

چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو
موج گل، موج شفق، موج صبا موج شراب

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

گویا مرزا نے ہر زمان و مکان کے زاویہ نگاہ سے شراب کی بوتل کو گھما کر پیش کیا ہے۔ ایک جگہ بڑا اچھوتا خیال قلمبند کیا ہے۔ گویا قلم پر بھی شراب اثر انداز ہو سکتی ہے۔ آیئے اسی پر اس مضمون کا اختتام کرتے ہیں:-

مے کش مضموں کو حسن ربط خط کیا چاہیئے
لغزش رفتار خامہ ن تحریر ہے

خوشحال اور مے پرستی

خوشحال نے اپنے قبیلے کے سردار اور مغلیہ شہنشاہ جہانگیر کے ایک اہم عہدیدار کے ہاں آنکھ کھولی تھی۔ انہیں بچپن میں ہر قسم کی سہولیات میسر تھیں۔ پشتون کلچر اور اپنے گھرانے کے مذہبی ماحول کی بدولت وہ لہو ولعب' شراب نوشی اور دوسری معاشرتی خرابیوں سے بچے رہے۔ ہاں اس دور کے خوانین کی طرح خوشحال کو بھی بچپن سے شکار کا شوق تھا جو آخر تک انکے ساتھ رہا۔

خوشحال خان کے اخلاق وعادات پر خوشحالیات کے ماہر میاں سید رسول رسا نے مربوط تبصرہ کیا ہے:-

> ''خوشحال خان اونچے اخلاق کے پشتون سردار تھے۔۔۔اس وقت کے پشتون خوانین کی طرح شکار کے دلدادہ تھے۔ باز کے ذریعے شکار کے لیے خاص رغبت رکھتے تھے۔گھوڑے' باز اور شکاری کتے انکو بہت پسند تھے۔۔۔خوشحال خان پیدائشی شاعر' عاشق مزاج اور حسن پرست تھے لیکن عیاش اور اوباش نہیں تھے خود فرماتے ہیں:-

نـه خرابـاتي ، نـه قمار باز ، نـه زناكاريم
نـه قـاضـي ، مفتي چې ئې نظر په څو درمه

ترجمہ:- میں نہ تو خراباتی ہوں' نہ قمار باز ہوں اور نہ زنا کار ہوں اور نہ ہی قاضی اور مفتی ہوں جنکی نظریں چند درہموں پر لگی رہتی ہیں"۔

(میاں سید رسول رسا' مقدمہ ارمغان خوشحال)

اس صورت حال میں یہ دیکھنا ہوگا کہ خوشحال نے مے نوشی کئے بغیر جواعلیٰ ورجے کی رندانہ شاعری کی ہے کیسے ممکن ہوئی۔ غور کرنے پر اس کی دو توجیحات نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے فارسی ادب اور خاص طور پر فارسی شعراء وشاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ پشتو شاعری پر فارسی شاعری کا رنگ چڑھا بلکہ فارسی شاعری سے مے اور مے کشی کے رنگا رنگ خیالات بھی خوشحال کے مشامِ جان ہو گئے جو بعد میں انکے اپنے کلام کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے:-

چې نـه مـئـى نـه معشوقه نه ګشت د ګلو
دغـــه عـــمـــر دے دغـــم او غـــرامـــت

ترجمہ:- جب نہ شراب' نہ معشوقہ ہو اور نہ ہی پھولوں کی سیر ہو۔ تو یہی غم اور تاوان کی عمر ہے۔

د ګلونو په موسم کښې خـوار هغه دے
چې ئې نه پیاله په لاس نه ئې نګار شته

ترجمہ:- موسم گل میں خوار وہی شخص ہے جس کے ہاتھ میں نہ تو پیالہ ہے اور نہ ہی اسکا معشوق موجود ہے۔

خوشحال کی رندانہ شاعری کی دوسری وجہ انکی مجازی اور صوفیانہ شاعری میں پیوست نظر آتی ہے۔ اگر انکے رندانہ اشعار میں سے چند ایک کو اس زاویہءنگاہ سے پڑھا جائے تو یہ بڑی حد تک انکی مجازی شاعری کا حصہ معلوم دیں گے:-

ساقي راشه ډکې ډکې پيالې راکړه
چې د ميو په مستۍ کښې شم سرشار

ترجمہ:- اے ساقی مجھے شراب سے بھرے ہوئے پیالے دے ۔ تاکہ مے کی مستی میں سرشار ہو جاؤں۔

ایک اور شعر کا ترجمہ یوں ہے:-

ترجمہ:- اصلی معنوں میں' میں خود شراب ہوں اور خود ہی ساقی۔
ہیں کوئی شراب کے طلبگار جنہیں میں مدہوش کردوں۔

بہر حال! ہم خوشحال کی رندانہ شاعری کو ظاہری آنکھ سے دیکھیں یا مجازی زاویہءنگاہ سے پرکھیں۔ ان میں خوشحال ایک ایسے رند کی صورت میں بھی ابھرتا ہے جو اعلانیہ مےنوشی کرتا پھرتا ہے اور شراب نہ پینے پر واعظ' محتسب' ملا اور عابد کو خوب خوب لتاڑتا ہے۔

مست یم مے پرست یم رندی کرمه کرمه کرم
واؤره محتسبه باده خورمه خورمه خورم

ترجمہ:- میں مست ہوں مے پرست ہوں' شراب نوشی کرتا ہوں' کرتا ہوں' کرتا ہوں
اے محتسب سن رکھ کہ میں شراب پیتا ہوں' پیتا ہوں' پیتا ہوں۔

له ازله ئي رند رند ' زاهد زاهـد كړو
زه به ډكې پيالې اخلم ته تسبيح كړه

ترجمہ:- خالق نے ازل سے رند کو رند اور زاہد کو زاہد بنایا ہے۔
اسلئے میں تو شراب سے بھرے جام پیتا ہوں اور تو تسبیح پھیر۔

شيخ دې مونځ روژه کا زه به ډكې پيالې اخلم
هـر سـړے پيدا دے خپل خپل كار لره كنه

ترجمہ:- شیخ نماز اور روزے میں مشغول رہے میں تو شراب کے بھرے جام انڈیلونگا۔
کیونکہ ہر شخص اپنے اپنے کام لے لیے پیدا کیا گیا ہے۔
خوشحال کی رندانہ شاعری میں کہیں کہیں طنز ومزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے:

زه خو شرابي يم شيخه ځــهٔ راسره جنګ كړې
برخې ازلي دی کاش که ما د ځان په رنګ کړې

ترجمہ:- اے شیخ تو مجھ شرابی کے ساتھ کیوں لڑتا جھگڑتا رہتا ہے۔ یہ سب تو قدرت کا نظام ہے جو ازل سے چلا آ رہا ہے۔ اے کاش کہ تو مجھے اپنے جیسا بنالے۔

د ســاقـــي د مـيــو هــســې شــان اثــر وٓ
په خـمار كښې مې دستار د سره خپور شو

ترجمہ:-ساقی کی شراب کا کچھ ایسا اثر تھا۔ کہ خمار کی وجہ سے میرے سر سے دستار گر کر بکھر گئی۔

ذکر فکر مونځ روژه طاعت ورلره بویه
شیخ، ملا، زاهد، عابد، صوفي په میو څۀ زده

ترجمہ:-ذکر، فکر، نماز، روزہ اور اطاعت ہی ان کا کام ہے۔ شیخ، ملا، زاہد، عابد اور صوفی کو شراب سے کیا واسطہ۔

محتسب چې په احداد وو د مستانو
د رندانو سره کښېناست باده خور شو

ترجمہ:-جو محتسب مستوں کا دشمن تھا۔ وہ رندوں کی صحبت میں رہ کرے خوار بن گیا۔

کومو شونډو چې درود او تسبیحات وے
راشه اوګوره د میو د مینا شو

ترجمہ:-جو لب درود و تسبیحات میں مصروف رہتے تھے آ دو دیکھو کہ وہ مے و مینا کے ہوکر رہ گئے ہیں۔

جیسا کہ کہہ آئے ہیں خوشحال بابا کی رندانہ شاعری پر فارسی رندانہ شاعری کا اثر ظاہر و باہر ہے۔ان کے بعض اشعار کو ہم عمر خیام اور حافظ شیرازی کے اشعار کے سامنے بخوبی رکھ سکتے ہیں۔ایسے ہی چند ایک اشعار کے ترجمے ملاحظہ کریں:-

ترجمہ:-بلبلوں کی اواز میں یہی خبر ہے کہ مے نوشی کرو۔

یہ پھول ہمیشہ نہیں رہیں گے۔

ترجمہ:۔اگر دیکھو تو یہ بھی ظلم ہے کہ بہار
مے کے بغیر گذر جائے

ترجمہ:۔بہار کے موسم میں کیسے مے سے توبہ کرلوں
جبکہ مغنی کا سرود نوشانوش میں ہے

عمر خیام کی ایک رباعی کا انگریزی ترجمہ یوں کیا گیا ہے:۔

"With a Laof of Bread Beneath the Bough, A Flash of Wine, A Book of verse and thou."

خوشحال کا ایک شعر ہے:۔

مے شته، چنگ ونے شته د خپل یار سره خوشحاله
خپل بیاض پـه لاس کنبـې ځـاګلزار لـره کـنـه

ترجمہ:۔شراب ہے، رباب ہے، بانسری ہے۔اے خوشحال ایسے میں تو اپنے محبوب کو ساتھ لئے، اپنی بیاض کو بغل میں دبائے چمن کا رُخ کر۔

خوشحال کے اسی شعر کا مسٹر ایولن ہاول نے انگریزی میں یوں ترجمہ کیا ہے:۔

"Garden Season, Moment Wine, Music verses all Combine, wherefore tarry Mistress mine"

خوشحال و غالب کا بڑھاپا

خوشحال کا بڑھاپا

جیسا کہ معلوم ہے۔ خوشحال خان نے ۷۶ برس کی عمر پائی لیکن انکی آخری عمر غموں اور مصیبتوں کی ایک طویل داستان ہے۔ گو کہ بچپن اور جوانی میں وہ حوادث کے شکار ہوتے رہے۔ ۱۳ برس کی عمر میں اپنے باپ کے ہمراہ یوسفزیوں کے خلاف ایک معرکہ میں زخمی ہوئے اس سے پہلے صغیر سنی میں ایکدفعہ مکان کا چھپر ان پر گرا جسکے نتیجے میں وہ زخمی ہوئے۔ اور چند دن بے ہوش بھی رہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۸ سال کی عمر میں عین اپنی شادی کے دن انہیں سخت بخار نے آ گھیرا۔ جو بارہویں دن جا کر ٹوٹا۔ یہی نہیں ۵۱ برس کی عمر میں اورنگزیب عالمگیر کے مغل صوبیدار نے انہیں دھوکہ سے گرفتار کیا اور پابہ سلاسل پشاور سے دہلی روانہ کیا۔ جہاں سے انہیں قلعہ رنتھنبور بھیجا گیا اور تقریباً ڈھائی سال قید رکھا گیا۔ قید کے بعد دہلی اور آگرہ میں ڈھائی سال تک نظربند رکھا گیا۔ قید اور نظربندی کے بعد سرائے اکوڑہ واپسی ہوئی تو معلوم ہوا ان کا پورا خاندان بکھر چکا ہے۔ اور یوسفزیوں کی پناہ میں ہے اسکے بعد دکن سے لیکر کابل تک ایک زبردست قحط اور وباء نے سخت تباہی مچادی جس میں خوشحال خان کی بیوی، بیٹے اور ان کے علاوہ بہت سے عزیز و اقارب بھی انتقال کر گئے۔

علاوہ ازیں انہیں اپنے جوان سال بیٹے نظام کی موت کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ اسکے بعد مغلوں کی ایماء پر دولت اور منصب کی خاطر خوشحال خان کی اپنی اولاد اسکے خلاف ہوگئی حتیٰ کہ انہیں اپنا علاقہ چھوڑ کر افریدیوں کے پاس پناہ لینی پڑی۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کے آخری حصے میں تھے۔ ان حالات کو مشہور مؤرخ جادو ناتھ سرشار نے اپنی تاریخ میں یوں سمیٹا ہے:-

"ایک فرد واحد جس کی اتنی بڑی سلطنت (مغلیہ) جان کے درپے ہو۔ اس کا قبیلہ بھی ساتھ چھوڑ دے اپنے بیٹے بھی عملی مخالفت پر اتر آئیں۔ گھر بار سے محروم ہونا پڑے عمر اس کی چھتر (۷۶) سال ہو۔ پھر بھی اس کی ہمت نہ ٹوٹے تو وہ خوشحال خان خٹک ہوگا"

آخری عمر میں خوشحال خان کا شغل قلم اور کتاب پر موقوف تھا۔ لیکن نظر کی کمزوری کی وجہ سے یہ شغل بھی محال ہوا۔ جیسے کہ کہا ہے:-

"میری یاری قلم اور کتاب سے ہے مگر اب یہ مشغلہ بھی نظر کی کمزوری کی وجہ سے ممکن نہیں رہا۔"

میاں سید رسول رسا اپنی معرکۃ الآرا کتاب ارمغان خوشحال میں خوشحال خان کے بڑھاپے اور بذلہ سنجی کا نقشہ خود خوشحال خان کی زبانی یوں کھینچتے ہیں:-

"اگر خوشحال خان بوڑھا ہوگیا ہے تو اے بیوقوف گدھو اس میں کیا عیب ہے۔ کیونکہ مشک وعنبر اور اگربتی جتنے پرانے ہوں ان کی خوشبو

تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ گوہر کے پرانا ہونے پر اسے ادنیٰ نہیں سمجھا جاتا۔ سونا کسی بھی بازار میں لے جایا جائے اس کی قدر کم نہیں ہوتی''

آیئے اس نابغۂ عصر کے بڑھاپے اور دکھوں کا اندازہ انکے مزید اشعار کی روشنی میں کریں:-

ترجمہ:- خدا جانے یہ آسمان کی کون سی آفت ہے جس نے میرے گھر میں جنم لیا ہے۔ آج روئے زمین پر اتنا پریشان اور کوئی نہ ہوگا جتنا میں ہوں۔ اگر بیٹھا رہوں تو عزت و ناموس کو خطرہ درپیش ہے اٹھوں تو طوفان اٹھتا ہے''

ترجمہ:- ''یا اپنی اولاد سے شاہجہان نالاں تھا یا پھر خوشحال فریاد کر رہا ہے۔ میری داڑھی سیاہ تھی تو میں اس حقیقت سے بے خبر تھا۔ اب جبکہ سفید ہوگئی ہے تو معلوم ہوا کہ اگر سمندر کا صدف سچا نہ ہو تو اس سے اچھا گوہر نہیں نکلتا۔''

ترجمہ:- بڑھاپا آ گیا۔ جو میں کمزور اور ناتواں ہوگیا ہوں۔ یا مجھے کوئی بیماری ہوگئی ہے کیونکہ میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ (پورا) نہیں ہوتا۔ ورنہ وہی ملک ہے اور وہی لوگ''

بڑھاپا خوشحال کی حسن پرستی میں کچھ کمی نہ لا سکا:-

ترجمہ:- یہ جو بے وقت مجھ پر سفید داڑھی کی بلا نازل ہوئی ہے۔ تو

اس نے خوشحال سے خوب صورت حسیناؤں کے دل پھیر دیئے ہیں‘‘

ترجمہ:- یہ تم جو سفید داڑھی لگائے ہوئے اس سے بوسہ مانگ رہے ہو۔ تو پاس کھڑے ہوئے نوجوانوں کی ہنسی اڑا رہے ہو۔ اب جو تم بوڑھے ہو گئے تو جوانوں کی سی خواہش بھی مت کر۔ اب تم سے جوانی کی ساری باتیں چلی گئی ہیں رات دن بھی اگر زار و قطار اس کے لیے روتے رہو تب بھی زندگی کا گیا ہوا وقت پھر (لوٹ کر) نہیں آئیگا‘‘

ترجمہ:- عشق جوان کی نسبت بوڑھے کو جلدی زبون کرتا ہے‘ کیونکہ پکی لکڑی آگ سے خوب سوختہ ہوتی ہے‘‘

ترجمہ:- اگر چہ خوشحال کی عمر ستر سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ مگر ہنوز اس کے دل میں حسینوں سے آشنائی کرنے کا جذبہ زندہ ہے‘‘

ترجمہ:- کاش کہ سدا تیس سال کی عمر ہوتی۔ کاش کہ ہم گل لالہ کی طرح تازہ رہتے۔ روز روز حسین عورتوں کے حسن سے لطف اندوز ہوتے۔ اور خدارا ہاتھ میں پیالہ ہوتا‘‘

خوشحال پر بڑھاپا آیا تو اپنی جوانی کو ایک خواب پر معمول کیا:-

ترجمہ:- جوانی میں تو سوتا رہا۔ اب بڑھاپے میں خوشحال کی آنکھیں کھلی ہیں‘

ترجمہ:- اے خوشحال! جوانی کی ساعت ایک خواب کی مانند تھی۔ جسے میں نے دیکھا اور وہ گذر گئی‘

ترجمہ:- ہائے جوانی تو تو ہوا کے کندھوں پر بیٹھ کر چلی گئی۔ تیری کامرانی ایک رات کا خواب تھی۔ میں بیدار ہوا تو پیری سے واسطہ پڑا ہے۔ نہ تو اب تلوار کی تیزی ہے اور نہ خانی''

بڑھاپے نے خوشحال کی حسِ مزاح کو اور تیز کر دیا:-

ترجمہ:- جوانی چلی گئی۔ بڑھاپا آ گیا۔ اب میں باغ کا ایک ننگا پھول ہوں۔ اگر چہ میرے منہ میں دانت نہیں تب بھی بغیر دانتوں کا مست ہاتھی ہوں''

ترجمہ:- لو اب میں عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکا ہوں جسے تم دیکھ رہے ہو۔ سفید داڑھی میری جوانی چھین چکی ہے۔ ایک شکار' دوسرے کتاب اور تیسرے حسینوں کی یاد کے سوا باقی تمام چاہتیں ختم ہو چکی ہیں''

ترجمہ:- بوڑھا چاہے اپنی سفید داڑھی پر کتنا ہی کالا خضاب لگائے اور جوان عورت کے سامنے اپنے آپ کو جوان ظاہر کرے مگر جوان عورت کا دل ایسے شخص سے پک چکا ہوتا ہے۔ چاہے وہ شخص اپنی جوان عورت کو کتنا ہی ناز و نعم میں رکھے ہاں مگر خوشحال کا ذاتی تجربہ یہ کہتا ہے کہ جوان شکر لب عورت کا بوسہ بوڑھے کو جوان کر دیتا ہے''

ترجمہ:-''اے خوشحال تجھ پر بڑھاپا چھا گیا ہے۔ لیکن تیرے دل

میں ابھی تک چند خیالات باقی ہیں۔ ننگ کا خیال' جنگ کا خیال'
حسینوں کا خیال اور خط و خال کا خیال"

ترجمہ:۔ستر سال سے گذر چکا ہوں۔کج چشم ایک کو دو دیکھتا ہے میں
ایک کو سات دیکھتا ہوں۔اسی (۸۰) سال تک اگر پہنچ جاؤں۔تو
صاف نظر آتا ہے کہ ایک کے بیس دکھائی دیں گے"

ترجمہ:۔"اگر بات ڈاڑھی اور دانتوں تک ہے۔تو پھر تو یہ پھول جیسی
نازک اندام حسینائیں مجھ سے رہ گئیں۔البتہ بڑھاپے میں خواجہ خضر
بن کر اور بھی حسین صورتیں دیکھنے کا موقع ملے گا۔

ترجمہ:۔"میری ڈاڑھی اور دانت صاف بتا رہے ہیں کہ میری جوانی
کا دور گذر گیا ہے۔جب میں کسی کو دیکھوں یا ہنسوں تو وہ مجھے دادا'
کاکا اور بابا کہہ کر پکارتا ہے"

یوں بڑھاپے نے قبیلے کے سردار' تلوار۔کے دھنی' شکار اور کتاب کے رسیا شاعر بے بدل خوشحال خان کو کمزور کرنے کی کوشش کی مگر حالات گواہ ہیں کہ اس مرد آہن نے پھر بھی ہمت کے ہتھیار نہ ڈالے اور اپنے گھر بار سے دور افریدی قبیلے کی پناہ میں آخر دم تک اپنے اصولوں پر قائم رہے۔

غالب کا بڑھاپا

غالب نے ۷۲ برس کی عمر پائی۔ بچپن امیرانہ ماحول اور ناز و نعم میں گذارا۔ ۱۳ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ سن شعور کو پہنچتے ہی مالی مشکلات سے دو چار ہوئے جو ہمیشہ غالب کے ساتھ رہیں۔ پنشن بند ہوئی۔ ملازمت حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی۔ اسی دوران ایک اور بلائے ناگہانی سے واسطہ پڑا یعنی قمار بازی کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ جب بہت ہی مجبور ہوئے تو قلعہ شاہی سے متعلق ہو گئے۔ اور یوں وہاں کی تنخواہ اور دربار رامپور کے وظیفے پر گذارا چلتا رہا۔ مقصد یہ ہے کہ غالب تقریباً تمام عمر غم دوران کے ہاتھوں تکالیف اٹھاتے رہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ غالب کے سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ مگر پندرہ مہینے سے زیادہ کوئی نہیں جیا۔ ساٹھ برس کی عمر میں غالب کو جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے ہنگاموں نے اپنے ہی گھر میں مقید ہونے پر مجبور کیا۔ اسی دوران ان کے بھائی مرزا یوسف کا انتقال نہایت نامساعد حالات میں ہوا۔ جنگ آزادی کے ان حالات کا نقشہ غالب نے اپنے کلام میں یوں کھینچا ہے:-

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا

مختلف ادباء نے اپنے اپنے مخصوص پیرائے میں غالب کے بڑھاپے کے ذکر کو یوں سمیٹا ہے:۔

''غالب پر بڑھاپا کیا آیا۔ اپنے ہمراہ دکھ اور تکالیف کا ایک ایسا انبوہ سمیٹ کر لایا جس نے غالب کو وقت سے پہلے ہی زندہ درگور کر دیا۔ ایام پیری میں عذر کی صعوبتیں' عزیز و اقارب کا قتل' جوان سال (بھتیجے) عارف کی موت' پنشن کا بند ہونا' جاگیر کی تباہی' ادبی مخاصمتیں' آخر کہاں تک گنوایا جائے۔ مصیبتوں اور تکلیفوں کا ایک آسماں سر پر ٹوٹ پڑا۔ انہی سے نبرد آزما ہوتے ہوئے غالب نذر اجل ہو گیا''

(شریف رزمی' غالب اور قنوطیت)

''اسی طرح دہلی اور بعض دوسرے مقامات کے حالات ان کے خطوں میں موجود ہیں۔ نواب غلام بابا خان نے جشن کے سلسلے میں

سورت آنے کی دعوت دی جواب میں لکھتے ہیں ''پاؤں سے اپاہج'
کانوں سے بہرا' ضعف دماغ' ضعف دل' ضعف معدہ' ان سب
ضعفوں پر ضعف طالع' کیونکر قصد سفر کروں؟''

(مولانا غلام رسول مہر ''خطوط غالب کی اہمیت'')

سفید بالوں کے نکلنے پر پیری کا تصور یوں دلایا ہے۔

''------ جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے ---- اس
سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ناچار مسی بھی
چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی''

(ڈاکٹر سید عبداللہ ''غالب کی اردو نثر'')

دہلی کی تباہی کے بعد آخر عمر میں غالب مکتوب نگاری کی طرف رجوع ہوئے۔اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔طنز و مزاح ان کے ہر خط کی جان ہے۔وہ برابر اپنے دوستوں' عزیزوں اور ملنے والوں کو خطوط لکھتے اور ان کے خطوں کے جوابات دے کر بڑھاپے کو بہلاتے رہے۔ اپنے ایک عزیز شاگرد منشی ہر گوپال تفتہ کو خط میں لکھتے ہیں:-

''میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے سہارے جیتا ہوں یعنی جس کا
خط آیا میں نے جانا وہ شخص تشریف لایا۔خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن
ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔
بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار خط کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ایک دو

صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے"۔

میر سرفراز حسین کے نام ایک خط میں اپنے بڑھاپے کا سرسری ذکر یوں کیا ہے:۔

"تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پراہن نے یعقوب کے ساتھ کیا۔ یہاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں توانا ہیں یا ناتواں ہیں بڑے بیش قیمت ہیں یعنی بہ ہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بُھنا کہتا ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ"

وہ خط میں اپنے مصائب کا ذکر بھی پُر مزاح انداز میں کرتے:۔

"آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو غیر تصور کیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے"

دہلی کی بربادی کا حال لکھتے لکھتے مرزا غالب نے ایک خط میں اپنی آخری عمر کے ناسازگار حالات کا احساس بھی دلایا ہے:

''بھائی کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ' چاندنی چوک' ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا' ہر ہفتے سیر جمنا پُل کی' ہر سال میلہ پھول والوں کا' یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا''

اپنے بڑھاپے اور ضعف سے متعلق غالب نے متعدد اشعار کہے ہیں۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اے پرتو خورشید جہانتاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگ پیری ہے جوانی میری

ضعف سے نقش پئے مور ہے طوق گردن
ترے کوچہ سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

گنجائش عداوت اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

ستر برس کی عمر میں یہ داغ جاں گداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کردیا تمام

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

شب وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجب آرامِ جان و تن تکیہ

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

قصیدے کے چند اشعار

اور پھر اب کہ ضعف پیری ہے
ہوگیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و نیستی خدا کی پناہ
دست خالی و خاطر غمگیں

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی
مارا زمانہ نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

قطعہ

دکھ جی کے پسند ہوگیا ہے غالب
دل رک رک کر بند ہوگیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہوگیا ہے غالب

ہم نے دیکھا کہ غالب کو بڑھاپے اور عسرت نے کس کس طرح سے عاجز کیئے رکھا۔ مجملہ تمام مصائب کے آخری عمر میں مرزا کی نظر اسقدر کمزور ہوئی کہ مطالعہ ترک کر دیا انکو نسیاں کا مرض بھی اس درجہ ہوا کہ انہیں اپنے اشعار تک یاد نہ رہے۔ کہتے ہیں ایسی حالت میں انکو اپنا ایک شعر اور کسی دوسرے شعر کا ایک مصرعہ ہی یاد رہا۔ جسے وہ اکثر گنگناتے رہتے تھے۔ شعر یہ ہے:-

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

موازنہ

خوشحال اور غالب پر بڑھاپا کن کن حالات میں آیا اور ان دونوں نے زندگی کے اس مرحلہ کو کیسے گذارا۔ اوپر کی سطور میں ہمیں ان سوالوں کے جواب مل چکے ہیں۔ اسی لیے ان

دونوں شخصیات کے بڑھاپے کا موازنہ کرتے ہوئے ہم صاف طور پر محسوس کرسکتے ہیں کہ ناز و نعم میں پلنے والے ان دونوں انسانوں نے بڑھاپے کے دوران اپنے آپ کو نامساعد حالات میں پایا۔ جسمانی کمزوری اور ضعف سے دونوں کو واسطہ پڑا۔ دونوں نے ستر سال سے زیادہ کی عمر پائی۔ اور دونوں میں اپنے اپنے حالات کے مطابق ایک ناہموار اور تکلیف دہ زندگی گذارنے کا سلیقہ اور ہمت موجود رہے۔ خوشحال کے جواں سال بیٹے نظام کی موت ہو یا غالب کے چہیتے بھتیجے عارف کی بے وقت موت۔ قحط کے دوران خوشحال کے عزیز و اقارب کی اموات ہوں یا جنگ آزادی (۱۸۵۷) کی حشر سامانیوں کے درمیان غالب کے بھائی مرزا یوسف کی افسوس ناک موت۔ آخری عمر میں خوشحال کی نظر کی کمزوری ہو یا غالب کو لاحق نسیاں کا مرض ڈاڑھیوں کے سفید ہونے سے لیکر دانتوں کے گرنے تک ان دونوں شخصیات کے حالات میں ہمیں ایک قسم کی موافقت نظر آتی ہے۔ ہاں البتہ دو باتیں ایسی بھی ہیں جن میں ان دونوں کے حالات کا اختلاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ جہاں غالب کو خدا نے اولاد کے فتنے اور نافرمانی سے بچائے رکھا وہاں خوشحال کی اولاد نے اُسکی آخری عمر میں اسے لا انتہا تکالیف اور مصائب سے دوچار رکھا۔ دوسرا اختلاف ان دونوں شخصیتوں کے مغلیہ دربار کے ساتھ وفاداری سے متعلق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں غالب مغلیہ دربار سے منسلک ہو کر شاہی تنخواہ پر آخر تک انحصار کرتے رہے وہاں خوشحال نے مغلیہ دربار کی عطا کی ہوئی سرداری کو لات مار کر آخر دم تک مغلوں کے خلاف علم بغاوت بلند کئے رکھا۔

باب دوم

فن

خوشحال و غالب کا نظریہ شعر

اگر کوئی مجھ سے شعر کی تعریف پوچھے تو میں میاں سید رسول رسا کی کتاب ارمغان خوشحال کے صفحہ ۱۶۰ پر شعر کی دی گئی یہ تعریف بیان کردوں:

"شعر کی صحیح تعریف یہی ہے کہ اگر ایک انسان اپنے احساسات' جذبات وعواطف کا اظہار اس طور کرے کہ اسکو سننے یا پڑھنے والے کے احساسات بھی ویسے ہی ابھریں جیسا کہ شاعر کے احساسات شاعرانہ مشاہدے یا تجربے کے وقت ابھرے تھے۔ تو ایسے کلام کو شعر کہیں گے چاہے اس میں وزن اور قافیہ ہو یا نہ ہو"

غالب نے شعر وسخن کی تعریف یوں کی تھی:

"سخن ایک معشوقہ پری پیکر ہے۔ تقطیع شعر اس کا لباس اور مضامین اس کا زیور ہیں"

لیکن غالب سے پہلے اور خوشحال کے بعد خوشحال ہی کے پڑپوتے اور پشتو زبان کے صاحب دیوان شاعر کاظم خان شیدا جو رامپور میں رہائش رکھتے تھے۔ اپنے اشعار میں شعر و سخن کی تعریف یوں کرتے ہیں:

مضمون د شعر لکه پیکر دی
ښائسته الفاظ ئې رخت و زیور دی
ورله ضرور دی دا دواړه خیزه
پیکر که هر څو دلربا خیزه

ترجمہ:- مضمون شعر کا پیکر ہے اور خوبصورت الفاظ اسکے لباس اور زیور ہیں۔ یہ دونوں چیزیں پیکر کے لیے ضروری ہیں چاہے پیکر کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔

''جیسا کہ معلوم ہے شاعری مضمون اور اسلوب بیان کا مجموعہ ہے۔ انہی کی کمی بیشی اور پستی و بلندی سے شعر اور شاعر کا درجہ متعین ہوتا ہے کوئی جذبہ تجربہ یا واقعہ جس قدر صحیح اور سچا ہو اتنا ہی مضمون اچھا اور خوب ہوگا۔ لیکن اس کو بیان کرنے کے لیے اس کی نوعیت اور شدت کے اعتبار سے سادگی یا رنگینی زور اور قوت، تخیل کی مدد تشبیہات و استعارات وغیرہ کی ضرورت ہوگی۔ اسی لئے اسلوب بیان شاعری میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب ان میں حسین ترتیب اور ان کا برمحل استعمال نہ ہو تو مضمون اپنے درجے سے گر جاتا ہے۔ لیکن نہ تو سب شاعر ایک رتبے کے ہوتے ہیں اور نہ ہر شاعر کے تمام اشعار ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مذکورہ شرائط اور خصوصیات میں کمی بیشی یا پستی و بلندی ہوتی رہتی ہے(۱)''۔

(۱) منتخبات خوشحال خان خٹک، ص ۲۰

کلیم الدین احمد کے مطابق:-

"شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں کچھ شاعر تو نئی راہیں نکالتے ہیں۔ پرانے رستوں پر چلنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں پرانی روش سے ان کا جی گھبراتا ہے اور وہ نئی روش ایجاد کرتے ہیں کچھ شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی نئی راہ کی ضرورت نہیں سمجھتے جو جانے ہوئے راستہ پر چلتے ہیں اسی میں کشادگی پیدا کرتے ہیں یا اپنی چال میں کچھ نئی شان اور بانکپن پیدا کرتے ہیں۔ غالب اسی قسم کے شاعر تھے"

(کلیم الدین احمد "غالب کا آرٹ")

خوشحال اس لحاظ سے نئی راہیں نکالنے والے شاعر تھے۔ انہوں نے پشتو کی پرانی شاعری کو چھوڑ کر نئی پشتو شاعری کی بنیاد رکھی۔ جب یہ صورتحال ہو تو ظاہر ہے خوشحال اور غالب کا نظریہ شعر بھی ایکدوسرے سے چندے مختلف ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں غالب کے نظریہ شعر کا ذکر کرتے ہوئے انکے شعر کے محاسن یعنی روایت، الہام معنویت اور ندرت خیال وغیرہ کے گرد گھوم کر جائزہ لیا جاتا ہے۔ وہاں خوشحال کے ہاں بنیادی طور پر شعر کو ایک ہنر کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آتی ہے۔

غالب کا نظریہ شعر

غالب کا نظریہ شعر و شاعری جانچتے ہوئے شعراء و ادباء نے اکثر الہامی اور وجدانی کیفیت

کا ذکر کیا ہے۔ خود غالب بھی الہام کو مانتے تھے۔ ان کا یہ مشہور شعر اسی احساس کی ترجمانی کرتا ہے:-

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

دوسری بات جو غالب کے ہاں انکے نظریۂ شعر کے سلسلے میں دیکھی گئی ہے وہ انکا روایت سے کٹتے ہوئے بھی اس کا بہر حال احترام لازم رکھنا ہے۔ وہ قافیہ پیمائی کے قائل نہیں تھے۔ اپنے دوست ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں یوں لکھا ہے:-

''لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوانی پیش رکھ لئے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل قصیدہ لکھنے لگا۔۔۔ بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں''۔

ایک اور بات جو غالب کے نظریۂ شعر سے متعلق کہی جاتی ہے۔ وہ معنی آفرینی اور معنویت کے تناظر میں کہی جاتی ہے کہ جب تک غالب نے ظہوری اور بیدل کا راستہ اختیار کیئے رکھا معنی آفرینی اور بال کی کھال نکالنے کو شاعری خیال کرتے تھے۔ جب یہ رنگ اہل دلی کو پسند نہ آیا تو مجبوراً انکو اپنی روش بدل کر معنویت کو اپنی شاعری میں جگہ دینی پڑی ساتھ میں وہ میر کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے اشعار میں جذبہ اور احساس کی شدت نے جگہ بنائی۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

چوتھی بات جو غالب کے ہاں پائی جاتی ہے وہ رمز و کنایہ کا استعمال ہے۔اس سے انکے اشعار میں اچھوتا پن پیدا ہوا۔غالب نے علامتوں کا استعمال کر کے اس اچھوتے پن کو اور زیادہ سنوارا۔اور اپنے کلام کو "گنجینۂ معنی کا طلسم" گردانا۔

غالب الفاظ اور انکے استعمال کے اسلوب کو بھی شعر کی خوبی وبقا کے لئے ضروری سمجھتے تھے مگر انکے شعر میں ندرت خیال کو الفاظ سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ساتھ کے ساتھ وہ شعر کی ظاہری ہیئت سے بھی غافل نہ تھے۔اسماعیل حسن خان کے مطابق انہیں اپنے انداز بیان پر فخر تھا:-

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

موضوعات میں تنوع غالب کی شاعری کی جان ہے۔گو اس تنوع سے انکی شاعری میں وسعت تو آتی ہے مگر میر جیسی گہرائی نہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے نزدیک غالب کا نظریۂ شعر ان عناصر سے بنتا ہے:

ا۔ روایت	۲۔ معنی وبیان
۳۔ الہام	۴۔غم زمانہ (زمانے کی ناقدری کا غم)
۵۔ اثر پذیری	۶۔جذبے کی صداقت

۷۔لفظوں کی تراش خراش

(ڈاکٹر وحید قریشی ''غالب کا نظریۂ شعر'')

غالب کے شعر کی ایک اور خصوصیت کی طرف کلیم الدین احمد نے یوں اشارہ کیا ہے:

''غالب کوشش کرتے ہیں کہ ایک شعر میں مختلف خیالات' جذبات یا ایک خیال' ایک ہی جذبہ کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹ لائیں۔اس ارادے میں جامعیت کے ساتھ تو کامیابی ممکن نہیں لیکن وہ ایک ترکیب استعمال کرتے ہیں جس سے مشکل آسان ہو جاتی ہے۔چند خیالات تو پوری طرح ایک شعر میں نظم نہیں ہو سکتے لیکن غالب ایک بات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسری باتوں کو طرف توجہ جا پڑتی ہے اور شعر پڑھ کر ذہن ان باتوں کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔گویا محشر ستان کا دروازہ کھل جاتا ہے اور غالب کا شعر اس دروازہ کی کلید ہے''۔

(کلیم الدین احمد ''غالب کا آرٹ'')

غالب کے نزدیک اچھے اشعار میں کون سی خوبیاں ہوں۔اسمٰعیل حسن خان نے انہیں یوں سمیٹا ہے:

''مختصر یہ کہ غالب کے نزدیک اچھے اشعار میں لفظاً سلاست و متانت الفاظ' پاکیزگی وصفائی' ندرت و دل پسندی' بندش اور حسن

بیاں' اور معناً بلندئ خیال' نزاکت معنی' عمگئ مضمون' جذبہ وتفکر کا
امتزاج' تاثر' تازگی وطرفگی فکر' اور رمزی وایمائی کیفیت ہونا چاہیئے
اسی کا نام "شیوا بیانی" ہے اور یہی خصوصیات کلام کا جوہر اور شاعری
کی عظمت کی ضامن ہیں"

(اسمٰعیل حسن خان "غالبؔ کا نظریہ شعر")

یہ تو ہوا غالب کا نظریہ شعر اب ہم خوشحال کی طرف چلتے ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے خوشحال کے ہاں شعر کو ایک ہنر سمجھ کر برتا گیا ہے۔ خوشحال نے شاعری میں نئی راہیں نکالی ہیں۔

خوشحال کا نظریہ شعر

خوشحال کے ہاں شعر و شاعری پر نثر اور نظم دونوں میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ان کی نثری کتاب دستار نامہ میں ایک سردار یا بادشاہ کو صاحب دستار ہونے کے لیے بیس خصائل اور بیس ہنروں کا مالک ہونا چاہیئے۔ جب ہم ان بیس ہنروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو چوتھا ہنر شعر یا شاعری کا ہے۔ جس میں سردار یا بادشاہ کو طاق ہونا چاہیئے۔ خوشحال نے اس چوتھے ہنر کے باب میں بیس بڑے بڑے نکات گنوائے ہیں آیئے دیکھیں:-

ا۔ شعر کو نظم کرنے کا ہنر کسب کمال میں شامل ہے۔

۲۔ شعر وہی کہہ سکتا ہے جس کو اللہ نے اسکا شعور دیا ہو۔

۳۔ شعر کہتے وقت شاعر کے اندر خدا خود دخول کئے ہوئے ہوتا ہے۔

۴۔ فنون اور صنعتیں محنت سے حاصل ہوتی ہیں اگر کوئی انسان چاہے کتنا ہی علم حاصل کرلے یا اسے صنائع وبدائع پر عبور ہو۔ وہ شعر نہیں کہہ سکے گا جب تک اسکی جبلت میں شعر نظم کرنا موجود نہ ہو۔

۵۔ دوسری طرف اگر اسکی طبیعت میں شعر کہنے کی اہلیت ہے تو چاہیئے کہ وہ صنائع بدائع بھی سب کے سب سیکھ ڈالے۔ علم بیان اور علم معانی بھی ضروری ہیں۔

۶۔ ان خوبصورتیوں کے علاوہ شعر میں درد اور محبت کا استعمال ہونا چاہیئے۔

۷۔ دراصل لغت میں شعر کلام موزوں کو کہتے ہیں۔ شعر کے دونوں مصرعے تول میں برابر حرفوں میں پورے ہوں۔ عروض اور قافیے کا خیال رکھا جائے۔

۸۔ اگر غزل لکھو تو اس میں معشوق کے خط وخال، گل وگلزار، درد، فراق اور سوز وگداز کا ذکر ہو۔

۹۔ شعر کے ہنر کی ابتداء حکیم افلاطون سے ہوئی۔

۱۰۔ اس (شعر) خانہ برداز سینہ گداز کی کیا تعریف کروں۔ یہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے جو اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو بھسم کر دیتی ہے۔ ایک ایسا مہمان ہے جو سب کچھ ہڑپ کر جاتا ہے۔

۱۱۔ شعر کو سمجھنا دشوار ہے تو اسکا کہنا مشکل۔

۱۲۔ شعر کہنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

۱۳۔ شعر وہ شخص کہے جو سخندان ہو۔

۱۴۔ ایک لفظ کی آراستگی کی خاطر انسان کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔

۱۵۔ خدا اس کے سحر میں کسی کو گرفتار نہ کرے۔

۱۶۔ شعر کی خوبی جھوٹ میں ہے۔ اس میں جتنا جھوٹ بھروگے اتنی ہی اس کی خوبی بڑھے گی۔

۱۷۔ عجیب بات یہ ہے کہ شعر میں جھوٹ کو سچ سمجھ کر اسکی تحسین کی جاتی ہے۔ شعر کی آرائش و زیبائش سب جھوٹ پر مبنی ہے اور ایسا کرنا بھی ایک ہنر ہے جو ہر ایک کے اختیار میں نہیں۔

۱۸۔ شعر ایک تیز آندھی کے مثل ہے۔ صرف بڑے درخت ہی اسکے سامنے ٹھہرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

۱۹۔ شعر کا عیب نکالنے والے جاسوس بہت ہیں۔ جو تمہارے اچھے سے اچھے شعر کو بھی ہنسی میں اڑا دیتے ہیں۔

۲۰۔ شعر وہی اچھا ہے جسے دانا کہے۔ وہ شعر نہیں جسے کوئی تک بندیا قافیہ بند کہے۔

خوشحال نے شعر کے متعلق نثر میں جو کچھ کہا وہ اب ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے نظم میں بھی شعر و شاعری کے متعلق اپنے نظریات و خیالات کا اظہار جا بجا کیا ہے۔ چند ایک ایسے اشعار کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

''شعر کے اچھے استعمال سے دانائی اور علم و حکمت کو فروغ ملتا ہے''

''ہر بحر میں شمار کے حرف ہوتے ہیں۔ عروض میں وہ وہ کارستانی کی جاتی ہے کہ باتوں کی بے مثل دلہن سامنے لا بٹھاتے ہیں''

''دلبروں کی آنکھوں، ابرووں، زلفوں اور خال کی تعریف میں غزلیں لکھی جاتی ہیں''

''اے خوشحال یہ رنگین معانی کہاں سے پھولوں کی شکل میں میری بیاض پر اتر رہے ہیں''

''جب کسی شاعر کو نماز کے دوران شعر کی فکر لگ جاتی ہے تو وہ اعوذ کے ذال کو دال سے بدل ڈالتا ہے''

''دنیا میں شاعری سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں۔ خدا کسی کو اس جنجال میں نہ ڈالے''

''شاعر کا دل ایک تو لوگوں سے جدا ہو جاتا ہے اور دوسرے فکر شعر میں مصروف رہتا ہے''

''کبھی کبھی تو شاعر کا چہرہ اتنا فکر مند نظر آتا ہے کہ لوگوں کو اسکے پاگل ہونے کا احتمال ہو جاتا ہے''

''رات کو دوسرے لوگ تو نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں مگر شاعر اپنے پلنگ پر لیٹے ہونے کے باوجود نیند سے کوسوں دور رہتا ہے''

خوشحالؔ نے نثر اور نظم میں شعر کے متعلق جو کچھ کہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شعر کہنا ایک ہنر ہے۔ اور صرف وہی شخص یہ ہنر حاصل کر سکتا ہے۔ جسے اللہ نے اسکا شعور دیا ہو۔ ایک نہایت حکیمانہ بات جو خوشحال نے اس سلسلے میں کی ہے۔ وہ یہ کہ شعر کے ہنر کی ابتداء حکیم افلاطون سے ہوئی۔ ان کے اس کہنے کو لفظ نہیں لینا چاہئے۔ اس بات کی توضیح میں

خوشحال نے اپنے کلام میں ایک جگہ کہا ہے کہ ''شعر گوئی فاسق اور بدعمل شخص کا کام نہیں ہے۔اور نہ ہی یہ ہر صاحب دل وچشم کے بس کا روگ ہے۔شعر گوئی سالک اور مالک کا کام ہے یہ عاشق اور دردمند کا کام ہے۔اولیاء اور ابدالوں کا کام ہے۔اس شاعر کی زبان پر چھالے نکل آئیں جو دنیا کے مال کی خاطر اشعار کہتا ہے''۔

خوشحال کا نظریہ شعر اسکی ایک غزل میں بکمال خوبی بیان کر دیا گیا ہے:

''جیسے تیر کے لیے ایک تیرانداز کی ضرورت ہوتی ہے
ایسے ہی شعر کے لیے ایک سحر کار درکار ہوتا ہے
دل کے ہاتھ میں ہمیشہ ''اوزان'' کی میزان ہوتی ہے
جس میں ایک حرف کی کمی بیشی بھی غماز بن جاتی ہے
کالے گھوڑے پر حقیقت کی ایسی دلہن کو سوار کرتے ہیں
جس نے اپنے گورے چہرے پر مجاز کا گھونگٹ ڈال رکھا ہے
سوجلوے، سوانداز اور سوغمزے
نگاہوں میں آنکھوں کی ادائیں جھلکتی ہوئی
صنعت کے کئی قسم کے زیور پہنے ہوئے
تشبیہ کے چندن، چووے سے آراستہ
تجنیس کی پائل چوڑیاں پاؤں میں پہنے ہوئے
ترصیع کا لمبا چوڑا ہار گلے میں ڈالے

مضامین کی نزاکت کے غمزے لئے ہوئے
سر سے پاؤں تک تمام جسم سڈول
اگر نظم میں کوے اور گدھ کا ذکر کرو گے
تو وہ بھی یوں جیسے باز دلوں کے شکار کی تاک میں پھرتا ہو۔
جب ایک بات کر چکے تو ہوشیار وہ ہے
جو اختصار سے کام لے
جب خوشحال نے پشتو میں شعر کہنا شروع کیا
تو پشتو زبان میں بڑی بڑی خوبیاں پیدا کر دیں'

خوشحال وغالب کی غزل

پشتو شاعری نے ۱۳۹ھ میں امیر کروڑ کی لکھی ہوئی ایک نظم سے اپنا سفر شروع کیا اس نظم کو اگر خالص پشتو نظم کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اس میں عربی اور فارسی کا کوئی لفظ نہیں ملتا۔ پشتو زبان کا دوسرا قابل ذکر شاعر اکبر زمینداروی آٹھویں صدی ہجری میں گذرا ہے۔ گو کہ اس سے پہلے بھی امیر کروڑ کے بعد دوسرے پشتون شعراء کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جب ہم پشتو شاعری میں مختلف سنگ ہائے میل کی بات کرتے ہیں۔ تو پشتو کا تحریری اور ادبی دور امیر کروڑ کی نظم سے شروع ہوا اور پشتو غزل کی ابتداء آٹھویں صدی ہجری میں اکبر زمینداروی کے کلام سے ہوئی ۔ پروفیسر شاہ جہان خان مصنف "خوشحال خان خٹک بابائے پشتو شاعری" اکبر زمینداروی کی پہلی غزل کو سادہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق اکبر زمینداروی کے اس کلام میں پرشکوہ الفاظ' پرواز تخیل' تشبیہ اور استعارے بہت کم ہیں۔ اس کا عرضی رنگ' گہرے خیالات اور پشتو کے ملی خصوصیات کا حامل ہے۔ پشتو شاعری کا اگلا دور دسویں صدی ہجری میں آیا۔ جسکے دوران پشتو ادب میں فارسی اور عربی الفاظ کا نفوذ ہوا۔ اور فارسی شاعری کے اصناف مثلاً غزل'

رباعی وغیرہ کا رواج عام ہوا۔ فارسی اور عربی بحور و قوافی کا بھی رواج بڑھا۔ پشتو شاعری کے اس دور میں صوفیانہ کلام کی بھی ابتداء ہوئی۔ بایزید انصاری نے اپنی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے پشتو نثر میں ایک مذہبی رسالہ خیر البیان کے نام سے لکھا۔ ان تعلیمات کو مرزا انصاری، مخلص، ارزانی، قادر داد، دولت اور میاں داد نے اپنے کلام کے ذریعے پھیلایا ان سب کے کلام پر زیادہ غلبہ صوفیانہ افکار کا تھا لیکن عشقیہ شاعری بھی ملتی ہے۔ آخر کار زمانے نے پلٹ کھایا۔ پشتو ادب کی قسمت جاگی اور گیارہویں صدی ہجری میں روشن و تاباں تعلیمات و افکار کو پیش کرنے کے لیے ایک مرد دانا و بینا خوشحال خان خٹک کی صورت میں نمودار ہوا(۱)۔

ادھر اردو شاعری کی ابتداء جنوبی ہندوستان کے خطہ دکن و بیجاپور سے ہوئی۔ ولی دکھنی کو اردو کے پہلے شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ شمالی ہندوستان میں لکھنؤ، دلی اور کسی حد تک لاہور اردو شاعری کے مراکز مانے جاتے ہیں۔ ان مراکز میں اردو غزل اور دوسری اصناف سخن کا سلسلہ میر تقی میر، سودا، انشا، جرأت، مصحفی، ناسخ، ذوق اور مومن سے ہوتا ہوا غالب تک پہنچا اور اسکے بعد داغ اور اقبال نے اردو شاعری کو آگے بڑھایا۔ اصغر، حسرت، فانی، جگر، فیض، اور موجودہ دور میں احمد ندیم قاسمی، احمد فراز اور دوسرے کئی نامی شعراء نے اردو غزل کی آبیاری کی۔

---

(۱) بابائے پشتو شاعری، ص ۱۲

تاریخ اردو شاعری کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو شاعری خصوصاً غزل گوئی کا پہلا دور غالب سے فوراً پہلے ختم ہوا۔ دوسرا اور جدید دور غالب کے ساتھ شروع ہوگیا۔ لیکن ان ادوار کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں اردو غزل کی ہیئت اور معنویت پر نظر رکھنی ہوگی۔

''غزل کی ہیئت ایک بندھی ٹکی ہیئت ہے۔ اس میں ہمارے کسی فنکار نے کوئی ترمیم نہیں کی ہے نہ اس میں ترمیم کی گنجائش ہی ہے کیونکہ غزل ایک مخصوص ہیئت ہی کا نام بھی ہے لیکن جہاں تک غزل کی معنویت کا تعلق ہے یہ فارسی کی دین قطعاً نہیں ہے۔ اس میں ہمارا اپنا کلچر اور اپنی ثقافت ملتی ہے۔ یہ ہمارے مخصوص انداز نظر اور قومی عروج و زوال کی جملہ منزلوں کی نشاندہی کرتی ہے ہمارے تمدن کی شیرینی اور ہمارے عقیدہ و عمل کی تصویریں اردو غزل کے پردوں پر منقش ہیں''۔

(عطا محمد شعلہ ''غزل پر غالب کے احسانات'')

جب ہم غالب کے کلام کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان کے دور سے پہلے یعنی میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے زمانے میں اردو غزل کی بنت میں عشقیہ خیالات کی بھرمار ہوتی تھی۔ یہ دراصل فارسی غزل کی تقلید تھی۔ رہی ولیؔ دکھنی کی بات تو اس کا کلام خالصتاً ہندوستانی تھا جس میں فارسی غزل کے اثرات نہیں ملتے۔

''غالب کی شاعری بقول اکرام، شروع سے آخر تک مک و اصلاح کی ایک مسلسل کوشش ہے ان کا فن نہ میرؔ کی طرح شخصی دائرے میں گردش کرتا ہے اور نہ مومنؔ کی طرح وہ اسالیب پر قدرت حاصل کر کے مطمئن ہوتے

ہیں۔ حالیؔ نے ان کے کلام کی چھ خوبیاں گنائی ہیں:

ا۔ جدت مضامین وطرفگی خیالات

۲۔ نادر تشبیہات عام اور متبذل تشبیہوں سے گریز

۳۔ استعارے کنائے اور تمثیل کا خوبصورت استعمال

۴۔ شوخی وظرافت

۵۔ پہلو دار اشعار

۶۔ سیدھے سادھے خیالات اور معمولی اسالیب میں لفظی ومعنوی تصرفات کرکے ان میں ندرت اور طرفگی پیدا کرنا''

(شجاع احمد زیبا ''اردو غزل اور غالب'')

اب آیئے دیکھیں کہ خوشحال خان خٹک کے منشۂ شہود پر آنے کے بعد پشتو غزل پر کیا بیتی لیکن اس سے پہلے یہ بات اب صاف ہوتی ہوئی نظر آنے لگی ہے کہ اگر خوشحال پشتو شاعری کے پہلے ادوار کے آخری اور نئے دور کے پہلے سرے پر کھڑے ہیں۔ تو غالب اردو شاعری کے پرانے دور کے آخری اور نئے دور کے پہلے شاعر ہیں۔ اس طرح اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ قدرت نے ان دو نابغہ شخصیتوں کو اپنے اپنے ادب میں نمایاں کام کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ اور آج یہ جو ہم پشتو اور اردو شاعری اور نثر کی جدید صورت دیکھ رہے ہیں۔ یہ ان ہی باکمال انسانوں کی بصیرت اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ پشتو زبان وادب کی ترقی میں جو کاوشیں خوشحال خان خٹک نے کی ہیں۔ وہ ان

سے پہلے گذرے ہوئے تمام پشتو شعراء اور ادباء کی مشترکہ کاوشوں سے کئی گناہ زیادہ ہیں۔ اس حقیقت کی طرف خوشحال بابا نے خود یوں اشارہ کیا ہے۔(۱)

''میں نے پشتو زبان کی نظم ونثر بلکہ تحریر کے ہر میدان میں بے پناہ کام کیا ہے لہٰذا اس زبان پر میرا بڑا حق بنتا ہے۔ اس میں پہلے نہ کوئی کتاب تھی اور نہ کوئی رسم الخط یہ تو میں نے اس زبان میں کئی کتابیں تصنیف کر ڈالیں''

جناب پروفیسر شاہ جہان خان نے اپنی کتاب بابائے پشتو شاعری کے صفحہ ۲۷ پر جناب میر عبدالصمد کا یہ اقتباس تحریر کیا ہے (۲):-

> ''خوشحال خان ایک متنوع شاعر تھا۔ اس سے پہلے پشتو شاعری میں غزل کے سوا دوسری اصناف بہت کم تھیں اور خود غزل کا دامن بھی بہت تنگ اور محدود تھا۔ اس نے غزل کا مقام بلند اور وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ رباعی، قطعہ، مثنوی، مخمس، مسدس الغرض فارسی شاعری کی تمام اصناف کو پشتو شاعری میں داخل کر کے اسے درجہ کمال تک پہنچایا۔ آگے چلکر لکھتے ہیں:
>
> ''خوشحال خان کی شاعری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ محرک اور

(۱) بابائے پشتو شاعری، ص ۲۶
(۲) خوشحال و اقبال، ص ۸۶ تا ۸۸

متحرک ہے اس میں قوت اور زور بیاں ہے جس سے جذبات میں بلندی' خیالات میں وسعت اور عزائم میں رفعت پیدا ہوتی ہے۔ پشتو شعراء میں اولیت خوشحال ہی کو حاصل ہے کہ اس نے حسن وعشق' وصال وفراق' اور گل بلبل کے تذکروں کے ساتھ ساتھ معاشرتی ' تمدنی' اخلاقی وسیاسی حتیٰ کہ طب وصحت اور فلسفہ وحکمت پر بھی دل کھول کر طبع از مائی کی'

معلوم ہوا کہ خوشحال اسوقت پشتو زبان کے ادبی افق پر ظاہر ہوئے جب یہ ادب محدود تھا خوشحال نے اسے توسیع دی اور ادبی تنوع کے ذریعے اس میں ایک نئی زندگی پھونک ڈالی۔ پشتو زبان کے معروف ادیب جناب فضل حق شیدا کا خوشحال کی شاعری کے متعلق یہ خیال ہے:-

'' خوشحال خان کی شاعری میں اسقدر جامعیت اور تنوع ہے' اتنے موضوعات' اسالیب بیان اور اصناف سخن ہیں کہ صرف ایک قادر الکلام ادیب ہی ان کے مختلف پہلوؤں کا صحیح جائزہ لے سکتا ہے۔ اس کے حسن اظہار' زور بیاں' علو تخیل' رنگینیوں اور باریکیوں سے وہی شخص لطف اندوز ہوسکتا ہے جو خود باریک بین اور صاحب ذوق سلیم ہو۔ خوشحال خان پشتو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ وہ خیال وتصور کے عالم بالا سے حقیقی دنیا میں نیچے اُتر آتا ہے۔ اُس کے

تلخ حقائق کا مزا چکھتا ہے اور اپنے تاثرات سیدھے سادھے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں جان ہے جوش اور ولولہ ہے زندگی ہے اور سب سے بڑھکر ایک حیات افروز پیغام ہے(ا)''۔

آیئے اب غالب کی طرف چلتے ہیں۔ اور اردو غزل کے لیے انکی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں اپنی بات دوبارہ سے اردو غزل کی ہیئت سے شروع کرنی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حسن و عشق کا ایک محدود علاقہ تھا۔ جس کے اندر رہ کر تقریباً تمام تر مضامین کو غزل پر آزمایا جا چکا تھا۔ غالب سے پہلے غزل مخصوص موضوعات کے گرد گھومتی تھی۔ یعنی ہجر' وصال' آہ و نالے' وفا' بے وفائی' امید' نا امیدی' کوچۂ یار' محبوب کے جسم کے مختلف پُرکشش حصوں یعنی زلف' رخسار' لب' دندان' مژگان' بھوئیں' خط اور دوسرے اس قسم کے خد و خال' گلشن' بلبل' صید و صیاد ان کے علاوہ تھے۔ ان سب کا تعلق غزل کی ہیئت سے ہے جہاں تک معنویت کا سوال ہے تو اس دور میں غزل کی معنویت پر کچھ زیادہ زور نہ دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب تک آتے آتے غزل اپنی معنویت کھو چکی تھی۔ اسکی صرف ساخت ہی رہ گئی تھی۔ مزید برآں ہیئت و ساخت سے متعلق مضامین کے بے دریغ استعمال کی وجہ سے غزل میں استعمال کے لیے کوئی نیا مضمون کہنے کے لیے نہیں رہ گیا تھا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ غزل میں معنویت لانے کے ساتھ ساتھ عشق و حسن کے دائرے سے نکل کر

(ا) بابائے پشتو شاعری ص ۷۲ از خوشحال خان خٹک تصنیف دوست محمد کامل۔

معاشرے کو درپیش دوسرے مسائل کو بھی غزل کے موضوعات میں شامل کیا جاتا۔ یہی وہ وقت ہے جب غالب نے غزل کی بگڑی بنانے کا بیڑہ اٹھایا۔ یہاں ہم جناب شجاع احمد زیبا کے خیالات' غالب اور اردو غزل سے متعلق پیش کرنا چاہیں گے کہ اس سے بہتر تبصرہ اس مضمون پر ہماری نظر سے آج تک نہیں گذرا:۔

''حسن و عشق کے محدود دائرے میں رہ کر جدت مضامین و اسلوب کے جو جوہر دکھائے جانے ممکن تھے وہ غالب کے وقت تک ظاہر ہو چکے تھے۔ اب ایک ہی صورت غزل کو زندہ رکھنے کی باقی تھی کہ اس کے موضوع کو وسعت بخشی جائے اسے حسن و عشق کے تنگ دائرے سے جس میں یہ اب تک قید تھی باہر نکالا جائے اور محبت کے علاوہ دیگر احساسات و جذبات انسانی کے لئے بھی اس میں گنجائش نکالی جائے۔ چنانچہ غالب نے اپنی زبردست انفرادیت پسندی کے ہتھیار سے مسلح ہوکر غزل کی مفروضہ چہار دیواری کو پاش پاش کر دیا۔ جس کی' بت بنا کر پوجا کی جارہی تھی۔ اس نے غزل کو کائنات وحیات کے بنیادی مسائل اور انسان کی ذہنی و جذباتی زندگی کی عکاسی کے لئے نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ اگرچہ غالب اردو غزل کے ارتقائی الفاظ کا منطقی نتیجہ ہے مگر اس دور کے شاعروں میں قدرت نے فضیلت کا یہ تاج اسی کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے غزل کے امکانات کا جائزہ لیا۔ شروع

شروع میں اپنی طبع معنی آفرینی کے کمال کو آزمایا مگر معلوم ہوا کہ بیدلؔ اور صائبؔ کا رنگ اس سانچے پر نہیں کھپتا۔ چنانچہ اس نے غم عشق کو غم روزگار بنا دیا۔ جذبے میں فکر کی آمیزش کی اور غزل کو جواب تک دل کے پھپھولے پھوڑنے یا تفنن طبع کے کام آتی تھی۔ ابدی اور ازلی حقیقتوں کا ترجمان بنایا"

(شجاع احمد زیبا "اردو غزل اور غالب")

چونکہ یہ بحث صرف خوشحال و غالب کی غزل گوئی سے متعلق ہے۔ اس لیے ان نابغۂ شعراء کی شاعری کے دوسرے اصناف پر بحث نہیں کی جا رہی۔ خلاصہ اس تمام بحث کا یہ کہ خوشحال و غالب اپنی اپنی زبان و ادب کے جن ادوار میں منظر پر آئے۔ وہ تقریباً ایک جیسے ہیں۔ جہاں غالب کو اپنی شاعری میں فارسی کی امیزش کم کرنی پڑی وہاں خوشحال نے فارسی غزل کی ہیئت کا مطالعہ و مشاہدہ کر کے اسے پشتو غزل کی ہیئت میں آمیز کیا اور اسکے علاوہ پشتو غزل کو گھسے پٹے موضوعات کے چنگل سے نکال کر غم دوراں کے موضوعات بھی آزمائے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہمارے ان ہر دو شعراء نے حسن و عشق کو غزل کے لئے بالکل متروک کر دیا ہے۔ ان کے کلام میں غم جاناں کے علاوہ غم دوراں کے موضوعات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثلاً خوشحال کی غزلوں کے موضوعات میں حمد، شکایت شاہ، خدا کی صناعی، قناعت، اپنے کلام کی تعریف، زاہد، شراب، سچائی، جھوٹ، ستمگر حکمران کے ستم زدہ عوام، ریاست و حکومت، انسانیت، حیوانیت، اچھائی، ننگ، غیرت، طنز، تنہائی، فلسفہ، حکمت،

تصوف سائنس' بڑھاپا' دولت' عبادت' ہمت' مظاہر قدرت' کار حکومت' بخت' امید و بیم' مذہب' تعلیم و تعلم' تقدیر' جنگ' ہندوستان میں قید کی یادیں' ہندی عورتیں' آفریدی حسینائیں' وطن کی یاد' مغلوں کی ہجو' اتفاق' خوشحال سپاہی' چیونٹی' اللہ بادشاہ' توبہ' عاجزی' دعا' فلک' فتنے' دستار کا مرتبہ' شہباز' شیر' حج' نادان کی دوستی' دولت کی خوبیاں' شکار' نعت رسول مقبولؐ موت' مردانگی کے اصول' خوشحال کے اساتذہ' اطاعت' حقیقی' قلم' قضا و قدر' غم اپنوں کی دشمنی' ہند ایک دوزخ ہے' اچھی عورت کی خوبیاں' احمق کی دوستی' خود اعتصابی' زہر حیات' ہند کی تعریف' صحبت کا اثر اور سینکڑوں دوسرے موضوعات شامل ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ خوشحال بابا نے غم جانان کے موضوعات اپنی غزل میں برتے ہی نہیں مثال کے طور پر چند عشقی اور رومانی موضوعات یہ ہیں: عورت' جور و ستم' عاشق' معشوقہ' محبوب کی دید' رقیب و رقابت' پیچ از لفیں' گل لالہ اور رخسار' محبوب کی کالی آنکھوں کی قسم' بال سے باریک پتلی کمر کی قسم' قاصد' پیامبر' گل و بلبل' نور و غم' آگ اور پروانہ' خال کی خاطر بخارا بخشنا' نقاب' مژگاں' بے خودی' فرزانگی' دیوانگی' خوبصورتی' حسن پرستی' کوچہ یار' ناک میں نتھنی' گورا چہرہ' گلزار میں پھول' مطرب' چنگ و نے' بہار' شکر لب' سیاہ خال اور وصال و ہجراں۔ جہاں تک غزل کی ہئیت کا تعلق ہے تو خوشحال نے اس میں بھی تجربے کئے ہیں۔ مثلاً ایک پشتو غزل میں قافیہ ردیف کے طور پر اپنے دور کے اردو کے الفاظ استعمال کئے ہیں:-

کلـه کلـه ئـي لـه حـالـه خبر اخلـه

بیچاره خوشحال خپل زړه درپسي هاریا

ترجمہ:۔کبھی کبھی اسکی حالت کی خبر لیتے رہو کہ بیچارہ خوشحال اپنا دل تیرے ہاتھوں ہار چکا ہے۔

دوسری خاص تبدیلی جو خوشحال کی دو ایک غزلوں میں ملتی ہے وہ عاشق اور معشوق کا آپس میں سوال و جواب کے ذریعے اپنے دلوں کا حال کہنا اور گلے شکوے کرنا ہے۔ تیسری خوبی جو خوشحال کی بعض غزلوں میں دیکھی گئی ہے اسے "قسمیہ شاعری" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔ لیکن سب سے پہلے کلیات خوشحال سے ایک نمائندہ غزل نذر قارئین ہے۔ اس غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے منفرد وزن اور قافیہ ردیف کی تکرار نے غزل کی لے کو دو آتشہ بنا دیا ہے:

زۀ هم چیرې فـرزانـه وم، فـرزانـه یم لا تر اوسَ

تـل بـې خـوده دیـوانـه وم، دیـوانـه یم لا تر اوسَ

جدائی نشتـه وصـال دے ځـنې بُعد هم خیـال دے

لـه هغـه چې همخـانه وم، همخانه یم لا تر اوسَ

چې راغلے په جهان یم خبر شوے په خپل ځان یم

د رازونـو خـزانـه وم، خـزانـه یم لا تـر اوسَ

چې د مخ پلؤ ئې واشو يو مشال وه چې نماشو
هغه دم پرې پروانه وم ، پروانه يم لا تر اوسَ
هغه شان لـه خپلـه يـاره بې وکيلـه بې ريباره
زۂ خوشحال چې بيګانه وم ، بيګانه يم لا تر اوسَ

ترجمہ:۔میں بھی کبھی فرزانہ تھا تو ابھی تک فرزانہ ہوں
ہمیشہ سے بےخود دیوانہ تھا تو ابھی تک بےخود دیوانہ ہوں
یہ جدائی نہیں وصال ہے اس سے دوری بس ایک خیال ہے
میں جیسا اس سے ہم خانہ تھا تو ابھی تک ہم خانہ ہوں
جب سے اس دنیا میں آیا ہوں اور اپنے آپ سے باخبر ہوا ہوں
میں جیسا رازوں کا خزانہ تھا تو ابھی تک وہی خزانہ ہوں
جب اسکے چہرے کا گھونگٹ کھلا تو اک مشعل تھی جو نظر آئی
میں اسی دم اس کا پروانہ بن گیا تھا تو ابھی تک وہی پروانہ ہوں
اپنے دوست سے بغیر وکیل اور بغیر قاصد کے
میں خوشحال جیسے پہلے بیگانہ تھا ابھی تک بیگانہ ہوں

اب ہم ان تجربات کا ذکر کریں گے جو خوشحال نے غزل کی بنت کے سلسلے میں کئے۔ایک ایسی غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں جس میں عاشق اور محبوبہ کے درمیان سوال جواب کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے:

وے مې کـه څـه درشـم ستـا تر څایه خولهٔ به راکړ
وے ئـې سکـه هزار سره لرې چې دا ویـنا کړ
وے مې چـې کـوم تـوکـې بـه تـا وتـه نـزدې شم
وے ئې چې کـه سر لـه تـنـه بې تیغـه جدا کړ
وے مې چې هر گوره کبریا شوې خدائے دې وینی
وے ئې چې که کبر کړم ستا څهٔ دی چې غوغا کړ
وے مې چې د سپینې زیبا خولې عاشق دې زهٔ یم
وے ئـې چـې خدائے څهٔ دا عاشقی هم ویریا کړ
وے مې چـې لـه نتـې دې چارگل په پوزه زیب کا
وے ئـې دا خـبرې کـړه هـالـه کـه چا پـه تا کړ
وے مې که زه ستاپه کوے کېنې ومرم ستا رضا ده
وے ئې کشکې خلاص له درد سره سپې زما کړ
وے مې چې په څو رنگه خوشحال په تا مین دے
وے ئـې د ختـک سړی د میـنـې څـهٔ ویـنا کړ

ترجمہ:- میں نے کہا ''میں تمہارے پاس آجاؤں مجھے بوسہ دوگی''؟
کہا ''کیا ایک ہزار سر رکھتے ہو جو ایسا کہہ رہے ہو''؟
میں نے کہا ''میں کس صورت تمہارے قریب آسکوں گا''؟
کہا ''اگر بغیر تیغ کے اپنے سر کو اپنے تن سے جدا کر سکوتو''

میں نے کہا ''دیکھو تم مغرور ہو گئی ہو خدا تو دیکھنے والا ہے''

کہا ''میں اگر غرور کرتی ہوں تو تمہیں کیا تم کیوں شور مچاتے ہو''

میں نے کہا ''میں تمہارے اس گورے چہرے کا عاشق ہوں''

کہا ''خدا نے عاشقی بھی کیا سہل کر دی ہے''

میں نے کہا ''تمہاری ناک میں نتھنی سے زیادہ لونگ سجتی ہے''

کہا ''اپنی رائے اس وقت دو جب کوئی تم سے پوچھے''

میں نے کہا ''اگر میں تمہارے کوچے میں مرجاؤں تو تمہاری مرضی ہے''

کہا ''کاش تم میرے کتوں کو اس دردسر سے نجات دلا دو''

میں نے کہا ''خوشحال ہر طرح سے تم پر فدا ہے''

کہا ''ایک خٹک آدمی کی محبت کی کیا تعریفیں کرتے ہو''

قسمیہ شاعری میں خوشحال نے اپنی غزلوں میں دنیا جہان کی چیزوں اور لوگوں اور مظاہر قدرت کی قسمیں کھا کر غزل کے آخر میں اپنی محبوبہ کو اپنے دل کی بات بتائی ہے۔غزل کی دنیا میں یہ ایک منفرد ہیئت ہے کم از کم پشتو غزل میں اس سے پہلے قسمیہ شاعری کی مثال نہیں ملتی۔قارئین کی دلچسپی کے لیے خوشحال کی ایسی ایک غزل پیش خدمت ہے جو چھوٹی بحر میں ہونے کی وجہ سے اور زیادہ اثر انگیز ہو گئی ہے۔یاد رہے کہ یہ آج سے کم وبیش ساڑھے تین سو سال پہلے کہی گئی ہے۔

د ښادمنو په خندا کو　　د غمژنو په ژړا کو
د بهار په ښو ګلونو　　د بلبلو په نوا کو
چې مکحولې دي له نازه　　په هغه سترګو شهلا کو
چې نرۍ تر وېښته ده　　په هغه باریکه ملا کو
چې راځي د یار له لوریه　　په هغه باد صبا کو
چې پیغام راوړي د وصل　　د هغه قاصد په پا کو
په دا هومره سوګندونه　　صد هزار ځله بیا بیا کو
چې تر ځان په تا مئین یم　　زه خوشحال ختک په تا کو

(جاري دے)

راته مه وایه په تا کو　　چې په تا نه کو په چا کو
ته زما د سترګو تورئې　　په دا تورو سترګو ستا کو
مخ دِ ورځ زلفې دِ شپه دي　　په سبا کو په مسا کو
تمنا لرم ستا ډېره　　په دا خپله تمنا کو
تر خندا پورې دِ هیڅ دي　　لال او دُر ستا په خندا کو
یار خو ستا یم د چا نه یم
زه خوشحال ستا په لقا کو

ترجمہ:- خوشدلوں کی ہنسی کی قسم　　غمزدوں کے رونے کی قسم

بہار کے اچھے پھولوں کی قسم اور بلبلوں کے نغموں کی قسم
جن میں بڑے ناز سے سرمہ لگا ہے' ان شہلا آنکھوں کی قسم
جو بال سے زیادہ باریک ہے' اس پتلی کمر کی قسم
جو محبوبہ کی طرف سے آئے' اس بادصبا کی قسم
جو وصل کا پیغام لائے' اس قاصد کے پاؤں کی قسم
اور ان اتنی قسموں کے بعد بھی' صد ہزار بار قسم اور پھر قسم
کہ میں اپنی جان سے زیادہ تم پہ عاشق ہوں مجھ خوشحال خٹک کو خود تیری ہی قسم
(جاری ہے)
(تو کہتی ہے) یہ مت کہہ کہ تری قسم' اچھا تیری قسم نہیں تو پھر کس کی قسم
تو میری آنکھوں کی کالی پتلی (نور) ہے' تیری ان کالی آنکھوں کی قسم
تیرا چہرہ دن اور زلفیں رات ہیں' اس صبح کی قسم' اس شام کی قسم
مجھے تیری بڑی تمنا ہے' اپنی اس تمنا ہی کی قسم
تیری ہنسی کے آگے لعل اور موتی ہیچ ہیں' تیری ہنسی کی قسم
میں تیرا ہی دوست ہوں اور کسی کا نہیں
مجھ خوشحال کو تیری ملاقات کی قسم

یوں خوشحال نے غزل کی ہیئت کے ساتھ ساتھ اسکی معنویت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے غزل کو نئے مضامین سے روشناس کر کے جدید پشتو شاعری کی بنیاد رکھدی

بلکہ انکے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے غزل میں مضامین کے تنوع کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا اظہار بخوبیٔ تمام کیا ہے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خوشحال نے فارسی زبان سے غزل کی روایات کو اس خوبی سے پشتو غزل میں سمویا کہ وہ فارسی غزل کی ہمسری کرنے لگی۔خوشحال نے پشتو غزل کی ہیئت میں جو کامیاب تجربات کیئے وہ اس پر مستزاد ہیں۔ اور بہ حیثیت مجموعی یہی پشتو غزل پر خوشحال کا احسان ہے۔

غالب کی غزل

اس مقام پر جب ہم غالب کی اردو غزل کو زندہ رکھنے کی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اردو غزل میں غم دوراں سے متعلق بے شمار مضامین شامل کر کے اسے معدوم ہونے سے بچایا:-

> ''غالب ہی کا فیضان ہے کہ غزل جو ہر نئے دور کے آغاز پر ظالم و بے درد نکتہ چینیوں کے اعتراضات کا ہدف بنتی ہے گر کر سنبھال لیتی ہے اور ہر بار مرنے سے بچ جاتی ہے۔غالب نے اسے ایسی ڈگر پر ڈال دیا ہے کہ اگر اس نے زمانے کی ضروریات کے مطابق نئے نئے موضوعات کو قبول کرنے میں پس و پیش نہ کیا اور ہر عہد کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی تو یہ کبھی فنا نہیں ہوسکتی''

(شجاع احمد زیبا۔ ''اردو غزل اور غالب'')

ظاہر ہے غالب نے روایت سے ہٹ کر جو غزل کو غم دوراں کی ڈگر پر ڈالنے کی کوشش کی تو اس میں نئے موضوعات کو شامل کرنا پڑا۔ اردو غزل میں غالب نے جو بے شمار نئے موضوعات شامل کئے ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

تصوف' فلسفہ' مذہب' نفسیات' سائنس' موسمیات' کعبہ و جنت' جدیدیت' ضعیفی' موت' قیامت' مزاح' شوخی' آزاد خیالی' ہمت' وحشت' ڈھول دھپا' اہل کشف' عیسے' زمزم و احرام' ستم ہائے روزگار' مسجد' عقل' گوہر اور بہت سے دوسرے۔ ان سب پر مستزاد غالب نے دو ایک غزلوں میں قانونی اصطلاحیں بھی استعمال کی ہیں۔ اور یہ انکے سفر کلکتہ کی بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ہئیت' بحر' مضمون' سادگی' پرکاری اور معنویت کے لحاظ سے دیوان غالب کی ایک نمائندہ غزل کی نشاندہی کروں تو میں غالب کی اس غزل پر صاد کہوں گا۔

غزل

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

غالب کے تغزل کی تاثیر چھوٹی بحر کے استعمال سے دوچند ہوئی ہے۔ آپ ان کی چھوٹی بحر کی کوئی سی غزل اٹھالیں اسکے سحر میں ڈوبتے چلے جائیں گے۔ مثلاً ایسی چند غزلوں کے پہلے مصرعے یہ ہیں:-

درد منت کش دوا نہ ہوا

یا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

یا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

یا

ابن مریم ہوا کرے کوئی

یا

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

یا

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے

غالب نے ان غزلوں میں نہایت سادگی اور پُرکاری سے کام لیتے ہوئے ان میں فارسی الفاظ کا استعمال نہ ہونے کی حد تک کیا ہے۔ کمال کی بات یہ بھی ہے کہ ان غزلوں میں زبان زدِ عام اشعار خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ جہاں خوشحال نے پشتو میں "قسمیہ" غزل کی طرح ڈالی وہاں غالب نے اردو میں "سوالیہ" غزلیں چھوڑی ہیں ہم غالب کی اس کاوش کو تجربہ کی ذیل میں شمار کرتے ہوئے یہاں ان غزلوں کے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا ؟
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں کیا ؟
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟
ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے کھائیں کیا ؟

دوسری غزل کے چند اشعار:-

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا؟
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں
یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا ؟
بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا' اشارت کیا' ادا کیا ؟

دیوان غالب میں ایک ایسی غزل بھی وارد ہوئی ہے: کہ جس کے مقطع میں مطلع کی تکرار موجود ہے۔

مطلع:- پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب
دے بطے کو دل دوست شنا موج شراب

مقطع:- ہوش اڑتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھ اسد
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب

غالب نے غزل میں سادگی' سلاست' پرکاری سے کام لیکر جو غزلیں کہی ہیں۔ ان میں ایک نمائندہ غزل پیش خدمت ہے:

درد منت کش دوانہ ہوا میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزمانہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گردب گیا لہو نہ تھا
کام گر رک گیا روانہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے
لے کے دل دلستان روانہ ہوا
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرانہ ہوا

مولانا حالی غالب کے شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ انکے نقاد بھی تھے۔ غالب کی شاعری کے بارے میں انکی رائے پر یہ بحث ختم کرتے ہیں:

''میر وسودا اوران کے متقدمین کے کلام میں ایک قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں اور اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے۔ اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے اسی طرح مرزا کے کلام میں

ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے"

(مولانا حالی "یادگارِ غالب")

موازنہ

یوں خوشحال و غالب نے اپنی اپنی زبان میں غزل کو نہ صرف ایک نئی ڈگر پر ڈالا بلکہ اسے اتنی قوت بخشی کہ وہ رہتی دنیا تک اپنے پاؤں پر کھڑی رہ سکے۔ علاوہ ازیں ان دونوں نے اپنی اپنی غزل کو جدید طرز سے نوازا۔

بقول مولانا حالی: "نئی طرز اس وقت تک ایجاد نہیں ہوتی جب تک ضرورتیں اہلِ فن کو مجبور نہ کردیں" اسی لئے نئی طرز جو بقول ڈاکٹر محمد حسن' فارسی میں چار سو سال بعد ظہور میں آئی تھی ریختے میں ڈیڑھ سو سال کے اندر اندر پیدا ہوگئی اور مومن' شیفتہ' سالک' عارف' تسکین' اور داغ نے اسے رواج دیا۔ فارسی کی اسی نئی طرز نے مرزا کے خیالات میں انوکھا پن' شوخی' ظرافت' استعارے اور کنائے کا چونکا دینے والی حد تک دلکش استعمال اور انکے ذومعنی اشعار کو جنم دیا۔ یہی کچھ غالب سے پونے دو صدیاں پہلے خوشحال کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اور یہی ہمارے ان دونوں نابغۂ شعراء کا موازنہ ہے۔ اسی لئے عصر جدید کی پشتو اور اردو غزل خوشحال و غالب کی احسان مند ہیں۔

خوشحال و غالب کی قصیدہ گوئی

خوشحال اور غالب دونوں نے اپنے اپنے ماحول کے مطابق قصیدہ گوئی کی ۔ خوشحال اور غالب کے قصائد اور انکو لکھنے کے ڈھنگ میں جوفرق پایا جاتا ہے۔اس کے مطابق جہاں خوشحال نے دنیاجہان کے عنوانات پر قابل قدر تعداد میں قصیدے لکھے۔اور اورنگزیب کے خلاف ہجو بھی قصیدے ہی کے ذیل میں لکھی ۔وہاں غالب کے ہاں بقول خواجہ محمد ذکریا اردو کے صرف چار قصیدے ملتے ہیں۔ان میں دو حضرت علی کی شان میں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔مگر خواجہ محمد ذکریا کے اس دعوے کی تائید نہیں کی جاسکتی۔ میری اپنی تحقیق کے مطابق دیوان غالب (نسخہ طاہر) میں کم وبیش سات اردو قصائد کی موجودگی ذکریا صاحب کے دعوے کی تردید کے لیے کافی ہے۔(دیکھیئے دیوان غالب نسخہ طاہر،سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۸) غالب نے فارسی میں جو قصیدہ گوئی کی ہے وہ ہماری آج کی بحث کا عنوان نہیں ہے۔

خوشحال کے کلام میں یہ اشعار ملتے ہیں جن میں قصیدے کا ذکر بھی مل جاتا ہے:-

”میں نے ہر موضوع پر۔۔۔۔قصیدے بھی لکھے اور حکمت و پند و نصائح سے بھر پور واقعات بھی قلم بند کئے ۔دلبروں کی شان میں

غزلیں بھی لکھیں اور آنکھوں اور آبروں کو زلفوں کا اسیر بھی کیا۔
رباعی، قطعہ اور مثنوی میں ہیرے، لعل، موتی اور جواہر بھی جڑے۔
اگر فارسی میں کوئی شخص مجھ سے بہتر ہے تو پشتو ادب میں، میں بے
مثال ہوں"

(جمیل صدیقی "جمہوریت کا علمبردار از خوشحال نامہ")

خوشحال بابا نے لاتعداد عنوانات پر قصائد لکھے۔ آپ اسکے قصائد پڑھتے جائیں تو ان میں وبا کا ذکر، بہار کی آمد، پند و حکمت کی باتیں، پشتو شاعری پر بابا کے احسانات، شاعری کی لت، اورنگزیب اور اسکے امراء کی ہجو، تاریخ نویسی یعنی دہلی کے پشتون اور مغل بادشاہوں اور شہر دہلی کی تاریخ، چمن کی سیر، دن اور رات کا مکالمہ، قید کے حالات، بہار میں رومان، استاد کی نصیحتیں، دو بیٹوں کی بہادری کا بیان، ایک بیٹے کی ہجو، بڑھاپا اور ذاتی نقصان، اپنے عقیدہ اور مسلک کا بیان، ہند سے نفرت اور جنگی حالات جیسے عنوانات پر قصائد ملیں گے۔ ایک قصیدہ ایسا بھی ملے گا جسے میں پر اسرار قصیدہ کہنا پسند کرتا ہوں کہ یہ محبوبہ کی طرف سے محبوب کے نام لکھا گیا ہے۔ نہ جانے خوشحال نے یہ قصیدہ لکھنے کے لیے کیسے اپنا موڈ بنایا ہوگا۔

خوشحال نے جو چند تعریفی قصیدے لکھے وہ دہلی کے دو ایک خدا ترس پشتون بادشاہان یعنی بہلول لودھی اور شیر شاہ سوری وغیرہ کے متعلق ہیں۔ جو خوشحال کی پیدائش سے پہلے ہندوستان پر حکومت کر چکے تھے۔

خوشحال کے اورنگزیب بادشاہ کی قید و بند کے دوران اس کے خلاف ہجونما قصیدے تاریخی تناظر میں لکھے گئے ۔ اور خوشحال و اورنگزیب کی آپس کی پرخاش اور خوشحال پر اورنگزیب کے ظلم وستم کی حقیقت کو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مرقوم کرنے کی ایک کوشش تھی ۔ خوشحال کے ان تاریخی قصائد میں سے چند اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ ایک قصیدے میں خوشحال بابا اپنے تعریف کرنے اور ہجو کہنے کا فلسفہ یوں بیان کرتے ہیں:-

''میں حسینوں کے سوااور کسی کا مداح نہیں ۔ مجھے کسی اور کی تعریف میں ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔

میں کیا خود خدائے تعالیٰ کو حسن پسند ہے۔ دلیل میں ذرا سورۂ یوسف غور سے پڑھو۔

نہ تو مجھے کسی سے کوئی لالچ ہے کہ میں اس کا مداح بن جاؤں نہ کسی سے ظاہرداری ہے اور نہ مجھے دغا یا فریب سے کوئی علاقہ ہے۔

اگر ہجو اور عیب گوئی پہ آجاؤں تو میں تمہیں بتاؤں کہ فردوسی بھی اس کام میں میرا ہمسر نہیں۔

فردوسی نے محمود کی ہجو میں زیادہ سے زیادہ دو چار شعر کہے ہونگے اور میرے پاس اورنگزیب کی مذمت کے اشعار سے بورا بھرا پڑا ہے اور جب بادشاہ وقت ذم کے لائق ہوگیا تو پھر ہر چھوٹا بڑا مذمت کے

قابل ہوگیا۔ میں نے کسی کی عیب گوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور
اس کا سارا وبال بھی اورنگزیب ہی کی گردن پر ہے''

ایک اور قصیدے میں شاہ جہان بادشاہ کی تعریف کرتے کرتے بادشاہ وقت اورنگزیب کو یوں نشانہ بنایا ہے:-

''میرے کام کی قدر بس شاہ جہان کے دل میں تھی (ورنہ)
اورنگزیب کا حال تو ظاہر ہی ہے۔ جس کے خیر خواہ اور بدخواہ دونوں
ایک سے ہیں۔ خود اسے نہ عدل کی تمیز ہے نہ اعتدال کی۔
جب سے اسکی بادشاہت کا دور شروع ہوا ہے بس اس کے عہد میں ہر
طرف خلل اور فساد مچا ہوا ہے۔ اسکے زمانے میں تمام ملک تہہ و بالا
ہو کے رہ گیا۔ گویا کہ دجال کا زمانہ آ گیا۔
جس نے اپنے باپ تک کو نہ چھوڑا اسے دوسروں پر ظلم کرنے میں کیا
تامل ہوسکتا ہے۔ جیسے وہ میرے زوال کے دیکھنے کا خواہشمند ہے
میں ابھی اسکے لئے ایسا زوال نہیں چاہتا''

اورنگزیب بادشاہ کے ظلم اور اسکے امراء کی نالائقی کو اپنے ایک قصیدے میں خوشحال نے یوں بیان کیا ہے:-

''اور یہ تنہا مجھ پر ہی نہیں اگر زندہ رہا تو اورنگزیب بہت سوں کو پائمال
کر ڈالے گا۔ اس نے بخت نصر کا ظلم شروع کر رکھا ہے۔ اور میں

دانیال کی طرح، سکے ہاتھوں میں قید ہوں۔
جو کوئی بھی اسکے ہاتھ آ جائے' جاوبے جا اسے خوار کرتا ہے اور وبال کی پرواہ نہیں کرتا جب اس نے اپنے باپ کو نہ بخشا تو اوروں پر زیادتی کرنا اسکے لئے کیا مشکل ہے۔ سچ پوچھو تو یہ کام بادشاہوں کے نہیں۔ یہ تو ایک رہزن اور ڈاکو کے کام ہیں۔
ایک ظلم میں دوسرے مکر میں کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہیں۔ اگر ہے تو حجاج ہے یا یزید۔ ایسے بادشاہ کی نماز بھی' جس میں عدل اور میانہ روی نہ ہو۔ اسکے گلے کا ہار ہو جائیگی۔ نہ انصاف ہے نہ تمیز' نہ عدل کا اجالا۔ بس اسکے دربار پہ ایک تاریکی چھائی ہوئی ہے اور اس میں وحشی درندے (رہتے) ہیں۔
اسکے امراء بھی سب اسی جیسے ہیں۔ سب ہر طرح سے اپنی من مانی کرتے ہیں۔ اگر ان کا حسب نسب دیکھو' تو ان میں تھوڑے اصیل نکلیں گے اور زیادہ کم ذات''

اپنی شاعری اور بادشاہ وقت کی مدح سے متعلق خوشحال کا یہ مشہور شعر بھی اسی جذبے کے تحت لکھا گیا:۔

''اگر میں نے اپنی شاعری چرکانی ہوتی تو اپنے بادشاہ کی ڈھیر ساری تعریفیں لکھتا''

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

''اس شاعر کا منہ کالا ہو جو طمع اور لالچ کی وجہ سے ہر در اور ہر دربار کے پاس کھڑا رہتا ہے''

خوشحال کے فن قصیدہ گوئی کا اندازہ لگانے کے لیے انکے مشہور قصیدے ''بہار کی آمد'' سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:-

''پھر کہاں سے آ گئی یہ بہار' کہ تمام وطن کو گل وگلزار بنا دیا۔ ارغوان (سرخ رنگ کے پھول) ضمیران (نازبو) سوسن (اودے اور نیلے رنگ کے پھول) اور ریحان کھلے ہوئے ہیں۔ یاسمین (چنبیلی) نسترن (سیوتی) نرگس اور انار کے پھول۔

بہار کے پھول ہر قسم کے بے شمار ہیں مگر لال بھبو کا لالہ ان میں بہت نمایاں ہے۔ لڑکیاں ڈھیر سارے پھول اپنے گریبانوں میں ٹوم رہی ہیں اور نوجوان اپنی پگڑیوں میں گلدستے لگا رہے ہیں۔

مطرب سارنگی بجانا شروع کر' ہر ہر تار اور پردے سے نغمے نکال' ساقی' آ اور بھر بھر کے پیالے دے کہ شراب کے نشے میں سرشار ہو جاؤں''

خوشحال کا ایک قصیدہ اپنے اندر دن اور رات کا مکالمہ سمیٹے ہوئے ہے۔ قصیدہ گوئی میں یہ بھی خوشحال کا ایک تجربہ ہی گردانا جائے گا۔ اس قصیدہ کے چند اشعار یوں ہیں:-

''یہ دن اور رات کی بحث ہے اے ہمدم ذرا کان لگا کر سن اگر تو

اسپر غور کیا تو اپنے دل کو مصیبت سے چھڑالے گا۔

دن نے رات سے بحث چھیڑی پہلے تو (دونوں نے) ایک دوسرے کی تعریف کی پھر ان کی گفتگو پھیل کر ایک دوسرے کی مدح و ذم تک پہنچ گئی۔

رات نے دن سے کہا۔ اے دن میری فضیلت تجھ سے زیادہ ہے اسلئے کہ میں ازل سے تجھ سے آگے ہوں۔

سب متقی اور خدا دوست رات ہی کو عبادت کیا کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ بھی اپنی قوم سے الگ ہو کر رات کے وقت ہی کوہ طور پر گئے تھے۔

حضرت احمد مجتبیٰ (صلعم) نے بھی رات کے وقت چاند کو اتارا تھا اور معراج کے لئے رات ہی کو تشریف لے گئے تھے۔

دن میں آسمان کی طرف دیکھو تو ایک نیلا گنبد دکھائی دیتا ہے۔ رات کو دیکھو تو جنت سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔

میں عیبوں پر پردہ ڈالنے والی ہوں اور تو عیب فاش کرنے والا ہے مجھ سے لوگ راحت پاتے ہیں اور تو مصیبتوں اور غموں سے بھرا ہوا ہے۔

جب دن نے رات سے اپنی یہ "تعریفیں" سن لیں تو آہستہ سے کہا

لے اب مذمت ختم کر اور چپ ہو جا۔
جو باایمان روزہ رکھتے ہیں وہ سب دن کے وقت ہی رکھتے ہیں اور عرفات میں بھی دن ہی کے وقت جمع ہوتے ہیں۔
قیامت میں لوگوں کا حشر نشر بھی دن ہی کے وقت ہوگا۔ اور انس وجن کی تخلیق بھی پہلے پہل دن کو ہی ہوئی تھی۔
مجھے دیکھ کر دنیا کی آنکھیں روشن اور تجھے دیکھ کے تاریک ہو جاتی ہیں۔ میرا بشرہ اسلام سے منسوب ہے اور تیرا کفر سے۔ میرا لباس عید کا ہے اور تیرا ماتم کا۔
مانا کہ تو بادشاہ کی مانند ہے اور چاند ستارے تیرا لشکر ہیں مگر جونہی دن نکلتا ہے تیرا یہ سارا لشکر تتر بتر ہو جاتا ہے۔
سورج اگر بادلوں میں چھپا ہوا ہو تب بھی چاند سے زیادہ روشن ہوتا ہے اور یہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ سونا چاندی کے درہم سے اچھا ہوتا ہے۔
چمن کے پھولوں کی سیر یا شکار کے لیے رات کبھی دن کی طرح موزوں نہیں ہو سکتی۔
فرض نمازیں مجھ میں زیادہ اور تجھ میں کم۔ یہ کم اس لیے ہیں کہ تو خود(رتبے میں) مجھ سے کم ہے"

غالب کی قصیدہ گوئی

غالب کے زمانہ میں قصیدہ گوئی کے فن پر فارسی قصیدہ گوئی کی چھاپ باقی تھی۔ ہجو لکھنے کا فن قصیدے سے الگ سمجھا جاتا تھا۔ خواجہ محمد زکریا نے ان حالات پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''فارسی اور اردو کے بڑے بڑے قصیدہ نگار مثلاً انوری، خاقانی، ظہیر فاریابی، عرفی اور سودا وغیرہ نے قصیدوں میں سنگلاخ زمینیں اختیار کیں اور علوم وفنون کی اصطلاحوں سے انہیں گرانبار کرویا۔ خود غالب کے ہمعصروں میں ذوق کے قصیدے بھی دقیق اور ثقیل ہیں۔ غالب نے قصیدہ گوئی کے اس انداز کو ترک کردیا اور نہایت اسان زمینیں منتخب کیں''

(خواجہ محمد زکریا ''غالب کے اردو قصیدے'')

خواجہ محمد زکریا کے مطابق غالب نے جو ابتدائی دو قصائد لکھے ان میں فارسی تراکیب اور الفاظ کا وہی انداز ہے جو غالب کے پہلے دور کی غزلیات میں ہے۔ باقی دو قصائد آسان اور سہل اور رواں دواں زبان میں لکھے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ غالب کو اردو قصیدہ نگاری میں کوئی خاص مقام نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ ان کے قصیدے فن قصیدہ گوئی پر پورے نہیں اترتے۔ لیکن نقادوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس جدت

کی وجہ سے غالب کے قصائد کا مداح ہے۔ ان میں عبدالسلام ندوی اور سید عابد علی عابد ایسے نقاد بھی شامل ہیں۔ عبدالسلام ندوی شعر الہند جلد دوم میں لکھتے ہیں کہ غالب نے بعض قصائد لکھے جو اردو شاعری کا سرمایہ ناز ہیں۔ مثلاً

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام

یہ قصیدہ اگر چہ ایشیائی قصیدہ گوئی کے تمام رسمی محاسن سے خالی ہے لیکن اس کی سلاست، روانی، متانت، جزالت اور تشبیب نے اردو قصیدہ گوئی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

غالب کے قصائد کی خاص بات یہ ہے کہ ان کی تمہید میں زور تخیل سے نئے نئے مضامین پیدا کئے گئے ہیں۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ قصیدے کے پہلے شعر ہی سے ممدوح اور اسکی مدح کے انداز کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اور آگے چلکر گریز کا شعر آتے ہی پوری بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

غالب نے اردو میں جتنے بھی قصائد لکھے وہ مدحیہ ہیں۔ ان میں یا تو حضرت علی کی یا بادشاہ وقت اور دوسرے راجاؤں مہاراجاؤں حتیٰ کہ پنجاب کے ایک گورنر مسٹر منگوؤ کی تعریف کی گئی ہے۔ یہاں آ کر یہ سوال ضرور کھٹکتا ہے کہ غالب کو ان لوگوں کی مدح کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ پروفیسر فتح محمد ملک کا خیال ہے کہ:-

”شاعر (غالب) کے دل و دماغ پر مابعد الطبیعاتی تصورات سائے ہوئے تھے۔ مگر عالم آب و بادہ خاک کے خالصتاً طبعی تقاضوں نے

سنگین حالات کو سنگین تر بنا دیا۔ تو پسپائی کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔
تب حالات نے غالب کے اندر اس خود دار شخص کو موت کے گھاٹ
اتار دیا۔ جس نے سخت تنگ دستی کے عالم میں بھی دلی کالج کی
پروفیسری کو محض اس لیے ٹھکرا دیا تھا کہ اس کا استقبال مغلیہ روایات
کے مطابق نہ ہوا تھا"

آگے چلکر پروفیسر فتح محمد ملک کہتے ہیں:-

"یہ شخص (غالب) رزمگاہ حیات میں حالات کا مقابلہ کمال دلداری
اور مردانگی سے کرتا رہا مگر تا کجے جب حالات نے اس پر یہ حقیقت
واضح کردی کہ وضعداری اور خودداری کے سہارے زندگی کا ایک پل
گزارنا بھی جوئے شیر لانا ہے۔ تو وہ اس معنی آتش نفس کو ڈھونڈ نے
لگا جس کی صدا اسے جلوہ برق فنا ہو اب اس کا محبوب موت بن گئی۔
اور وہ مرنے کی آرزو میں مرنے لگا۔ لیکن جب اس کی آنکھیں اس
طرف سے بھی کھل گئیں کہ موت تو آنے کی نہیں تو اپنی وضعداری کا
گلا گھوٹ کر اس نے جوا کھیلنا شروع کر دیا۔ جب اس سے بھی
اندیشہ ہائے دور دراز ختم ہوتے نظر نہ آئے تو

ے بزم شہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا"

(پروفیسر فتح محمد ملک "غالب۔۔۔غزل سے قصیدے تک")

غالب کی تعریف شاہ میں کی گئی قصیدہ گوئی اس کی سخت تنگ دستی اور معاشی مجبوری کا نتیجہ تھی ورنہ وہ بنیادی طور پر ایک وضعدار اور خوددار انسان تھا۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اس ضمن میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بیدل اور غالب کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"عظمت آدم کا راز دونوں کے یہاں جدوجہد' عزم و استقلال' حرکت وعمل میں پوشیدہ ہے۔ دونوں کی طبیعت مشکل پسند ہے۔ دونوں اپنی راہیں شارع عام سے الگ نکالتے ہیں۔ دونوں خوددار اور غیرت مند ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ حالات اور واقعات نے مرزا غالب کو زندگی میں عالی ظرفی' غیرت اور شکوہ کی بجائے جوان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا بادشاہوں' شہزادوں' ولی عہدوں' نوابوں بلکہ معمولی انگریز عہدہ داروں کی مدح سرائی اور دریوزہ گری پر مجبور کر دیا"

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "نقش ہائے رنگ رنگ"

مگر یہاں یہ حقیقت بھی جاننے کے لائق ہے کہ غالب کو اپنے فارسی قصیدے پر ناز تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی

لکھنے والوں کی مجھے نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع
کردیں ۔ میرے (فارسی) قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت
پاؤ گے اور مدح کے بہت کم ۔ نثر میں بھی یہی حال ہے"

انکے فارسی قصیدوں میں مدح سرائی کے کم ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ فارسی کے چونسٹھ قصیدوں میں سے بارہ قصیدے، حمد و نعت اور منقبت اہل بیت سے متعلق ہیں ۔ گو کہ چند قصیدے دنیاوی ممدوحوں یعنی بہادر شاہ ظفر اور ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں بھی لکھے ہیں ۔ بہر حال غالب کو اس لئے بھی یاد رکھا جائے گا کہ فارسی قصیدے میں انہوں نے مدح سے زیادہ تشبیب پر زور دیا۔

غالب کی قصیدہ گوئی کے کچھ بھی محرکات رہے ہوں ۔ انہوں نے کمال کے قصیدے لکھے ۔ حضرت علیؓ کی شان میں جو دو قصائد لکھے ۔ ان میں سے چیدہ چیدہ اشعار پیش ہیں:-

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
سایۂ لالہ بے داغ سویدائے بہار
لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار
وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیر سرا
چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
سلک اختر میں مہ نو مژۂ گوہر بار
ہم عبادت کو ترا نقش قدم مہر نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلہ سے استظہار
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعت نبی
جام سے تیرے عیاں بادہ جوش اسرار

دوسرے قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز
کس نے پایا اثر نالۂ دلہائے حزیں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارج آداب وقار و تمکیں
نقش لا حول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علیؓ عرض کر اے فطرت وسواس قریں
مظہر فیض خدا جان و دل ختم رسلؐ
قبلۂ آل نبی کعبۂ ایجاد و یقیں

آخر میں مدح شاہ میں لکھے گئے قصائد میں سے چند اشعار یوں ہیں:-

اے شہنشاہ فلک منظر بے مثل و نظیر
اے جہاندار کرم شیوہ و بے شبہہ عدیل
تیرا انداز سخن شانۂ زلف الہام
تیری رفتار قلم جنبش بال جبریل

غالب کے سب سے بےنظیر قصیدے کے چند اشعار کے بغیر یہ مضمون ادھورا رہ جائے گا:-

ہاں مہ نوسنیں ہم اس کا نام
جس کو تو کر رہا ہے جھک کے سلام
دو دن آیا ہے تونظر دم صبح
یہی انداز اور یہی اندام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور تیرا انجام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نام شاہنشہ بلند مقام

خوشحال وغالب اور سائنس

خوشحال اور سائنس

بادی النظر میں خوشحال وغالب کا سائنس کے ساتھ کچھ تعلق ہونا ایک عجیب امر لگتا ہے مگر ہے دلچسپ۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس پر طبع آزمائی کرنے کی ٹھانی۔ اس کا نتیجہ آپکے سامنے ہے۔ خوشحال کا زمانہ سترھویں صدی کا حصہ تھا۔ تب بندوق کے سوا کوئی دوسری قابل ذکر سائنسی ایجاد کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر غالب کا دور انیسویں صدی میں آتا ہے اور نسبتاً زیادہ جدید تھا۔ جب برطانیہ میں پٹری پر چلنے والا پہلا ریلوے انجن ۱۸۰۴ء میں ایجاد ہوا تو غالب کی عمر اس وقت سات برس کی تھی۔ انکے زمانے میں بھاپ سے چلنے والے بحری جہاز بھی موجود تھے۔ ہاں اگر مرزا اپنی طبعی عمر سے اٹھائیس برس اور زندہ رہ لیتے تو انہیں فینس کے علاوہ موٹر کار میں بھی سفر کرنے کا موقعہ مل جاتا۔ کیونکہ یورپ میں موٹر کار کی ایجاد ۱۸۹۷ء میں ہوئی۔ جبکہ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔

یوں تو خوشحال وغالب دونوں نے جائے مولود سے باہر مختلف وجوہات کی بنا پر اسفار اختیار کئے لیکن ہر ایک کو سفر کے دوران اپنے اپنے زمان ومکان کے لحاظ سے مختلف مشکلات اور تجربات کا سامنا کرنا پڑا جن کے اثرات بھی دونوں پر مختلف مرتب ہوئے۔

خوشحال نے اپنی زندگی میں بدخشاں، بلخ، کابل، تارا گڑھ، دہلی، رتھنبور (نزد جے پور) سوات، درہ آدم خیل اور تیراہ کے سفر کئے۔ ان اسفار کے نتیجے میں خوشحال کے کلام میں وسعت اور گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ خوشحال ایک جنگجو سردار اور شاعر ہونے کے علاوہ بنیادی سُدھ بُدھ رکھنے والے ایک حکیم، ماہر فلکیات اور جغرافیہ دان بھی تھے۔ حکمت سے دلچسپی کے نتیجے میں لکھی جانے والی خوشحال کی کتاب ''طب نامہ'' انکے زمانے کے لوگوں کے لیے خاصے کی چیز رہی ہوگی۔ اس کا مطالعہ آج بھی کئی لحاظ سے منفرد اور مفید ہے۔ اسے خوشحال کے زمانے کا لوکل فارما کوپیا کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اور اس لحاظ سے ''طب نامہ'' کے مندرجات کو سائنسی بنیاد مل سکتی ہے۔

آیئے اب ذرا جغرافیہ دان خوشحال کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ پروفیسر محمد نواز طائر سابق ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کہتے ہیں:-

> ''چاہے کوئی مفکر، فلسفی ہو، ادیب، شاعر، سائنسدان یا مصور ہو، اسکے ذہن پر اپنے ماحول کا خاصہ اثر رہتا ہے۔ اور وہ اسی اثر کے سائے میں اپنے افکار، اشعار یا فن دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایک نہایت اونچے پایۂ کے مفکر اور صاحب نظر انسان کے لئے اسکے محدود ماحول میں بھی پوری کائنات کے رازعیاں ہوتے ہیں''۔

آگے چل کر پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:-

> ''ہمارے نامور شاعر، خوشحال خان خٹک نے بھی اپنے بڑے اور

فراغ مکان (دنیا) کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ اور ایک اونچے درجہ کے ہئیت دان کی حیثیت سے اسکے جزیات پر الگ الگ بحث کی ہے۔ زمین کی گردش، اجرام فلکی، سیاروں کا بغور مطالعہ، پرانے زمانہ کے اہل علم اور ماہرین کی عادت رہی ہے۔ خوشحال نے بھی ان علوم پر بہت کچھ لکھا ہے۔ موسموں، شب وروز کی طوالت یا کمی اور چاند اور سورج کی مختلف حالتوں پر اس نے بڑے اچھے طریقے سے اپنے کلام میں روشنی ڈالی ہے۔ یہاں تک کہ خوشحال بابا نے آسمانوں کے بارہ بُروج کے نام بھی پشتو میں تجویز کئے ہیں۔ خوشحال کے مطابق یہ بارہ بُروج بارہ مہینے ہیں۔ اور تین بُروج یا مہینوں میں ایک موسم ہوتا ہے۔ یوں پورے سال میں چار موسم ہوتے ہیں خوشحال کہتا ہے:

''شبنم کے موسم کے بعد بہار کے پھولوں کا موسم آتا ہے''

''بارہ برجوں پر سورج پورے بارہ مہینوں میں اپنا سفر پورا کرتا ہے''

''اگر سردیوں میں درخت کی شاخ تراشی کرلی جائے''

تو بہار کے موسم میں اسکے پروبال خوب نکلتے ہیں''

پھر علاقوں کی سطح سمندر سے کم یا زیادہ اونچائی کے اثرات اور آب وہوا کے متعلق خوشحال نے یہ نقشہ کھینچا ہے:۔

''باقی باغات تو نوروز (بہار) میں سرسبز ہوتے ہیں مگر کابل کا باغ

اھاڑ (جون) میں سرسبز ہوتا ہے''

''سنبلہ کی آٹھ تاریخ (۱۳ اگست) کو شبنم ختم ہوجاتی ہے بدن پر پسینہ خشک ہوجاتا ہے۔اور دھان کی بالیاں نکل آتی ہیں''

''سمرقند کی ناشپاتی کا پودا ہند کی زمین میں بونے سے جو پھل حاصل ہوگا اگر اسے شہد میں بھی ڈبو کر کھاؤ۔ تو بے مزہ ہوگا۔ ہر پھل پر اپنی ہی سرزمین کی آب وہوا کا اثر ہوتا ہے''

(پروفیسر محمد طائر' جغرافیہ دان خوشحال'')

اس ضمن میں خوشحال کے چند اشعار کا ترجمہ یوں ہے:-

'' پھل پھلاری غلے پھول اور قسم قسم کی نعمتیں زمیں سے پیدا ہوتی ہیں۔اور خوز مین گارا مٹی ہے''

اس جہان میں ہوا چاروں طرف گشت کرتی رہتی ہے۔اس بات سے بے خبر کہ وہ کیا ناپ رہی ہے کیا طے کرتی ہے۔اور کہاں چلتی ہے''

خوشحال کے کلام میں حکمت اور جغرافیہ سے متعلق یہی اشعار موجود نہیں بلکہ اس نے یہاں وہاں ایسے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔جس سے اسکی سائنسی سوچ کا پتہ چلتا ہے۔اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ کریں:-

''انسان کو قدرت نے جس ڈھنگ سے بنایا ہے۔اگر غور کرو تو ایک سربراز ہے''

انسان کی بناوٹ میں خاص طور سے آنکھوں کی بناوٹ میں جو سائنسی اصول کار بند ہے

اس کے متعلق خوشحال کے تخیل کا نقشہ جناب محمد نواز سرحدی نے یوں کھینچا ہے:-

''عموماً شعراء اور ادیب سائنس کے خشک کلیوں کو اپنے کلام میں جگہ نہیں دیتے بلکہ ان کے ہاں ایسا کرنا رنگ میں بھنگ ڈالنے کے مترادف ہے۔ خصوصاً شاعری کے نازک تخیل میں سائنس کے خشک کلیے سمونا گویا کرنے کی بات ہی نہیں ہے۔ لیکن خوشحال خان کے تخیلات کے گلستان کا دروازہ ہر ایک خیال کے لئے ہر دم وا نظر آتا ہے۔ ان کا گلستان تخیل اگر ایک طرف ملی، روحانی اور اخلاقی پھولوں سے مزین ہے تو دوسری طرف سائنس کے پھولوں کی کلیاں بھی چٹکتی نظر آتی ہیں۔ اس نے سائنسی اور تخلیقی قوت کا اظہار بہت خوبی سے یوں کیا ہے:-

''محبوب کے چہرے کے سوا میں کسی چیز کو اپنی پتلی سے نہیں دیکھتا۔
آنکھ کی دونوں پتلیاں سورج کی روشنی سے ملک کا نظارہ کرتی ہیں''

''لگ بھگ ساڑھے تین سو سال پہلے ایسے باریک سائنسی نکتے سے آگاہی خان بابا کے فہم وادراک پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک نابغہ انسان تھا۔ اگر کوئی اسی شعر کو باریکی سے دیکھے تو پتہ چلے گا کہ انہوں نے کس خوبصورتی کے ساتھ دو متضاد خیالات یعنی رومان اور سائنس کو ایسے یکجا کیا ہے کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ آپ محبوب کے چہرے کو سورج سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دیکھنے کی طاقت سورج کی روشنی کی محتاج ہے۔ اگر سورج نہ ہو تو

دید کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے محبوب کو نہیں دیکھ پاتا تو اس کی نظر نہیں لگتی یعنی اگر اسے کچھ دکھائی دیتا ہے تو وہ چہرۂ یاد ہے۔ یہی خیال اگر ایک طرف عظیم رومانی کیفیت رکھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی سائنسی نظریے کا ایک تصور سامنے آ جاتا ہے اور وہ یوں کہ بقول انکے یہ آنکھ کی پتلی کا کمال ہے کہ پہلے سورج کی شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے اور پھر واپس منعکس کرتی ہے۔ یہ روشنی جس چیز پر پڑے وہ نظر آ جاتی ہے۔ موجودہ طبعی سائنس کا نظریہ انعکاس نور ہو بہو خوشحال بابا کے اوپر بیان شدہ شعر کی ترجمانی کرتا ہے''۔

(محمد نواز خٹک۔''بابائے انسانیت'' ص ۱۹۸ 'خوشحال نامہ ۱۹۸۰ء پشاور)

ہوائی جہاز اور راکٹ کسی دھاگے یا رسی کی مدد کے بغیر بھی اڑتے ہیں یہی اشارہ آج سے ساڑھے تین سو سال (پہلے جب کہ ہوائی جہاز اور راکٹ ابھی ایجاد بھی نہیں ہوئے تھے) خوشحال بابا نے اپنے چند اشعار میں یوں کیا ہے:۔

ترجمہ:۔''اگر یہ سچ ہے کہ کاغذ کی پتنگ اوپر اڑ سکتی ہے تو وہ بغیر ڈور کے بھی اڑا کرے''۔

ترجمہ:۔''میں نے پوچھا میں اڑ کر آسمان تک کیسے جا سکونگا؟

کہا: یہ کام ہمت کے بال و پر کے ذریعے ہوتا ہے''

ترجمہ:۔ 'ہمت کے بال و پر لگا کر میں آسمانوں سے ہو آتا ہوں'

خوشحال نے اپنے دوسرے چند اشعار میں سائنسی نکتے یوں بیان کئے ہیں:۔

ترجمہ:- اے خوشحال چاروں عناصر تو (فقط) نوکر ہیں اور نوکر وہی کام کرتا ہے جس کا آقا حکم دیتا ہے"۔

ترجمہ:- "فرشتے نور سے اور جنات آگ سے ہیں"

ترجمہ:- "آدمی چار عناصر سے مرکب ہے۔ (اگر تمہیں معلوم ہو) اسکی ذات سے اس لیے فتنے اٹھتے ہیں کہ وہ آگ، پانی، ہوا اور مٹی کا مرکب ہے"۔

ترجمہ:- "سونا کچھ اور چیز ہے اور گندھک کچھ اور۔ کیا ہوا اگر گندھک میں سونے کا رنگ اور آب وتاب بڑھ جاتا ہے"

کیمیا دان خوشحال کا یہ شعر ایک عجیب تاثر پیدا کرتا ہے:-

ترجمہ:- اگر اسے آگ کے شعلوں میں جلاؤ اور راکھ ہو جائے تب بھی سیماب (پارہ) سے زندہ رہنے کا ہنر کوئی نہیں چھین سکتا"

خوشحال "تاریخ نویس" بھی تھے اور "تاریخ گو" بھی تھے۔ تاریخ گوئی کے متعلق خورشید اقبال خٹک یوں رقمطراز ہیں:-

"علمی اور فنی دونوں لحاظ سے تاریخ گوئی مختصر مگر جامع اور سائنسی طریقہ استخراج کے نزدیک ایک فن ہے۔ اس کو تاریخ نویسی پر اس لئے برتری حاصل ہے کہ اس میں ایک اہم تاریخی واقعہ نہایت مختصر ہندسوں میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کوزے میں سمندر کو بند کرنے کے مترادف ہے۔ یہ علم فنی طور پر [illegible] خ نویسی پر اسی [illegible] ی ہے کہ اس میں علم ریاضی کے حروف کی عددی قیمتوں کے ذریعہ خاص اصولوں اور قواعد کے تحت ایک [illegible]

واقعہ کے وقت کا تعین کیا جاتا ہے۔اس زاویہ سے دیکھا جائے تو تاریخ گو خوشحال کے سائنسی تخیل کی طرف ایک واضح اشارہ ملتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے کلام میں تاریخ گوئی کے ذریعے جگہ جگہ اہم واقعات کی تاریخیں کہی ہیں اور یوں اپنے زمانے کے اہم تاریخی واقعات کو اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر دیا ہے"۔

خوشحال نے آج سے کم و بیش ساڑھے تین صدیاں پہلے DNA کے مسئلہ پر یوں روشنی ڈالی تھی۔

هر وېښتهٔ چې په صورت باندې ليده شي
که پر غير شي، د شناخت ور به درتــه واکا

ترجمہ:- ایک ایک بال جو بدن پر نظر آتا ہے۔اگر اس پر غور کرو گے تو تم پر شناخت کا دروازہ کھل جائے گا۔

آخر میں سر اولف کیرو اور ایولن ہاؤل کی کتاب The Poems of Khushal khan Khattak(1963) سے خوشحال کی نظم "پانی کے بلبلے" کے ایک شعر کا انگریزی ترجمہ ملاحظہ کریں۔اس میں بھی ایک سائنسی نکتہ پنہاں ہے:-

"Blowing bubbles bubbles blown
Are no sooner Blown than flown
Scarcely sooner flown than ended
Bubbles burst when they are distended
And can never more be mended"

غالب اور سائنس

ظاہر ہے کہ خوشحال نے غالب سے لگ بھگ پونے دوصدیاں پہلے سائنسی تخیل کا مظاہرہ کیا۔ غالب کے زمانے تک مغربی سائنسی ترقی اور سائنسی ایجادات کی شروعات ہوچکی تھیں۔ اسلئے جب غالب نے اپنے چچا کی جاگیر کے صلے میں ملنے والی پنشن کا قضیہ نمٹانے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر اختیار کیا۔ تو اس سلسلے میں انہیں انگریزی عدالتوں سے واسطہ پڑا اور انگریزی طرز حکومت کا اندازہ ہوا۔ وہ لکھنو، بنارس اور دوسرے مقامات اور حالات سے بھی واقف ہوئے۔ کلکتہ میں غالب نے جدید عمارتیں دیکھیں اور ایک نیا بنتا ہوا تمدن دیکھا۔ سید احتشام حسین نے بڑی خوبی سے کلکتہ اور غالب کے ذہنی تعلق پر یوں روشنی ڈالی ہے:-

''تاج محل اور لال قلعے کی عمارتوں کے لاشریک حسن کی یکتائی اور بے ہمگی سے محروم ہوتے ہوئے بھی یہ انگریزی تعمیرات ایک الگ کیفیت رکھتی تھیں۔ بادشاہی دور کے آخری شاعر کی ذکاوت ذہن ایک نئے جمہوری فن تعمیر کی زیبائش اور پوری شہر سازی کے اجتماعی آہنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔۔۔اس نیم فرنگی نیم ایشائی شہر میں مشرقی اور مغربی معاشرت کا عجیب امتزاج نظر آتا تھا انگریز اگر عطر، الائچی اور پان کے استعمال سے بے خبر نہ تھے۔ تو ہندوستانی بھی وسکی اور اولڈ ٹام سے مانوس ہوتے جاتے تھے''

(احتشام حسین خان، ''غالب کا تفکر'')

غالب کلکتہ سے جو خیالات اور تصورات اپنے ساتھ واپس لائے۔ وہ ان کے دہلی کے

حریفوں اور ہم عصروں کے ''سرحد ادراک'' سے باہر تھے۔ غالب نے اس سفر میں نہ صرف ایک نئے طرز حکومت اور طرز سلطنت سے واقفیت حاصل کی۔ بلکہ سید احتشام حسین خان کے مطابق وہ سائنس کی حیرت زائیوں اور برکتوں کا بھی اندازہ کر چکے تھے۔ اس ضمن میں سید احتشام حسین خان کہتے ہیں:-

''غالب کی عظمت اس میں ہے کہ انہوں نے ترقی کی علامتوں اور سائنس کے امکانات کو اپنے دائرۂ تخیل میں جگہ دی۔ ان سے یہ مطالبہ فضول ہے کہ انہوں نے بادشاہت کی کھلم کھلا مخالفت کیوں نہیں کی۔ محنت کش طبقہ کی رہنمائی کے لیے کچھ کیوں نہیں لکھا۔ دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے بدلتے زمانے کو کس نظر سے دیکھا۔ اس وقت کتنے شاعر تھے۔ جو اسٹیم انجن' ٹیلیفون' ریلوئے اور بجلی کا نام جانتے تھے۔ غالب نے آئین اکبری کے مقابلے میں اس نظام کو سراہا جو سائنس کی ان برکتوں سے مالا مال کر سکتا تھا''

(سید احتشام حسین''غالب کا تفکر'')

کچھ ہمارے نابغہ عصر غالب کی اپنی ذہنی اُپج اور کچھ کلکتہ میں دوسالہ قیام کے دوران جدید سائنس کے تعارفی دور کے احساس نے ملکر انکے کلام میں جابجا ایسے اشعار کا روپ دھارا جس سے انکے سائنسی تخیل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:-

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اہل علم اس شعر کے روحانی، صوفیانہ اور نہ جانے کس کس زاویئے سے توضیح کرتے رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر کا محرک غالب کے ذہن میں کائنات کے وجود میں آنے اور دوبارہ فنا ہو جانے کے سوا اور کچھ نہ تھا گو کہ جدید سائنس کی The Big Bang تھیوری غالب سے بہت عرصہ بعد پیش کی گئی۔ ہمیں غالب کے اس شعر میں یہ تھیوری پوری آب و تاب کے ساتھ کارفرما نظر آتی ہے پہلے مادے کا شیرازہ بکھرا اور ان اجزائے پریشان نے زمین اور دوسرے اجرام فلکی وجود میں آئے۔ قیامت میں یہ سب کچھ بھی تباہ ہو جائے گا اس تباہی کی طرف بڑھنے کے عمل کو غالب نے کس فراست اور چابکدستی سے جادہ راہ فنا سے تعبیر کیا ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

جب غالب کے دور کے دوسرے شعراء کا کلام صنف نازک کے ناز و ادا سے مغلوب نظر آتا ہے۔ وہاں غالب کے کلام میں سائنسی استفہام کا یہ نمونہ ایک عجیب تاثر دیتا ہے۔ غالب جاننا چاہتے ہیں کہ سبزہ و گل کیا ہیں کہاں سے اور کیسے آئے۔ پھر دوسرے مصرعے میں خود ہی بالواسطہ طریقے سے اس سوال کا جواب دے دیتے ہیں۔ یعنی آسمان سے ابر برسا، زمین کو آبیار کیا۔ اور ہوا نے اس زمین میں سبزہ و گل کی پیدائش و افزائش میں مدد دی۔ غالب اگلے شعر میں ابر بننے کے عمل کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:-

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

ذیل میں دیئے گئے شعر میں غالب ہمکو اپنے سائنسی تخیل کی بھول بھلیول میں یوں لاکھینچتے ہیں:-

تا کہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

ہم غالب کو آئن سٹائن کا پیش رو بھی کہہ سکتے ہیں۔ایٹم اور اسکی کارفرمائیوں کا علم غالب کو بھی تھا۔یہ نیوٹرانز کی بے قراری نہیں تو اور کیا ہے:-

بے پردہ سوئے وادی مجنوں گذر نہ کر
ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہے

یوں لگتا ہے کہ غالب نے اس قبیل کے اکثر اشعار کے پہلے مصرعے میں اشاروں سے کام لینے پر اکتفا کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں کھل کر سائنس سے متعلق بات کی ہے۔گو کہ ان تمام اشعار کو بھی خوشحال کے اسی قسم کے اشعار کیساتھ رکھا جاسکتا ہے۔مگر آگے جو اشعار آتے ہیں انکا موازنہ خوشحال کے دیئے گئے اشعار سے کرنا سودمند ہوسکتا ہے۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب بھی کوئی کم تر جغرافیہ دان ماہر فلکیات اور ماہر موسیات نہ تھے۔

ہے تجلی تری سامان وجود
ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

کچھ نہ کی اپنے جنون نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکش خورشید عالم تاب تھا

چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگ گل پہ آب
اے عندلیب وقت وداع بہار ہے

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

•

اے عندلیب یک کف خس بہر آشیاں
طوفان آمد آمد فصلِ بہار ہے

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار بادیاں

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روانہ ہوا

فرانسیسی سائنسدان پاسکل نے روانی خون کی تھیوری غالب سے برسوں بعد پیش کی مگرایسا لگتا ہے کہ غالب کو انسانی رگوں میں روانی خون اسکے رکنے اور جاری ہوجانے کے مضمرات سے بخوبی آگاہی تھی۔

خوشحال کی طرح غالب بھی تاریخ نویس تھا۔اس نے مہر نیمروز اور دستنبولکھ کراپنے تاریخ نویس ہونے کا بین ثبوت دیا ہے۔ چونکہ تاریخ نویسی بھی سائنسی اصولوں کے تحت کی جاتی ہے اس لیے اس فن کو خوشحال اور غالب کی سائنسی علمیت ہی گردانا جائے گا۔

موازنہ

آخر میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ خوشحال و غالب دونوں کے کلام میں جابجا سائنسی تخیل کی کارفرمائی محسوس کی جاسکتی ہے جس سے ان دونوں شخصیتوں کے نابغہ عصر ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔

خوشحال وغالب کا فلسفۂ غم

خوشحال کا فلسفۂ غم

"یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک جوانمرد صاحب کمال اور خود آگاہ شخص کی شخصیت کی بلندی اور ترقی کا راز فتنوں اور امتحانوں میں مضمر ہوتا ہے۔ ایسا شخص اپنی عالی فطرتی کے بل بوتے پر خارجی شر اور مصیبت کو خیر اور برکت میں بدل دیتا ہے۔ خوشحال خان بابا کے نزدیک غم، مصیبت، تکلیف اور شر ایک انسان کی قدر و قیمت کو اجاگر کرنے کی ایک کسوٹی ہے"

(دوست محمد خان کامل مرحوم "خوشحال مطالعہ ص ۸۰")

ہمارے عظیم شاعر خوشحال کا فلسفۂ غم انکی رجائیت سے وابستہ و پیوستہ ہے۔ یہاں غموں سے مراد وہ غم ہیں جو اولوالعزم لوگوں کو مہمات عظیم سر کرتے وقت پیش آتے ہیں۔ اور جو انکو

زندگی کی ڈگر پر آگے بڑھنے میں مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ خوشحال اپنی پُر شور زندگی کے متعلق خود فرماتے ہیں:-

''مجھ سے ابھی ایک شور رخصت نہیں ہوا ہوتا کہ دوسرا شور مجھے آلیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں شور و شر کے دن پیدا ہوا ہوں''

جس بچے پر آٹھ سال کی عمر میں مکان کا چھپر آ گرے اور وہ اسکے نتیجے میں چند دن بے ہوش رہے۔ جو ۱۳ سال کی عمر میں اپنے باپ کے ہمراہ یوسفزیوں کے خلاف ایک معرکہ میں زخمی ہو جائے۔ جسے جوان ہونے پر ۱۸ برس کی عمر میں عین اپنی شادی کے دن سخت بخار آ گھیرے جو بارھویں دن جا کر ٹوٹے۔ جسے ۲۸ برس کی عمر میں یتیم ہو جانا پڑے اور اپنے قبیلے کی سرداری سنبھالنی پڑے۔ جو پچاس برس کی عمر تک یہ ذمہ داری احسن طریقے سے پوری کرتے ہوئے مغل بادشاہوں کے لیے بلخ، بدخشاں اور کانگڑہ (قلعہ تارہ گڑھ) کی مہمات میں حصہ لیتا رہا ہو۔ جسے ۵۱ برس کی عمر میں مغل گورنر کابل کی ایک سازش کے تحت گرفتار کر کے پابہ سلاسل پشاور سے دلی لے جایا گیا ہو۔ اور پانچ برس تک قید و نظر بند رکھا گیا ہو۔ جس دوران میں اسکے اہل خاندان اور قبیلے کو بے انتہا تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ جس نے قید و بند سے آزادی کے بعد مغل تاجدار کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے چند معرکوں میں مغل فوج کو پے در پے شکستوں سے دوچار کیا ہو۔ جس کے خلاف مغلوں کے اُکسانے پر اسکے اپنے بیٹے اُٹھ کھڑے ہوئے ہوں اور آخر کار انکے ہاتھوں زچ ہو کر جلاوطنی پر مجبور ہونا پڑا ہو۔ جس کو آخری داؤ کے طور پر پشتون قبائل کو مغلوں کے خلاف متحد

کرنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہوا ہو۔ اور ان تمام مصائب پر مستزاد اس نے اپنی زبان کے ادب میں ایک نئی روح پھونک دی ہو تو وہ خوشحال خان خٹک ہوگا۔ خوشحال اپنے بارغم پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:۔

''خوشحال کا بارغم اگر پہاڑ پر ڈالو تو وہ بھی بال جیسا باریک ہو جائے''

اپنے نصیب کو دوش دینے کی بجائے خوشحال بابا ایک نیا ڈھنگ اختیار کرتے ہوئے غم ہی کو اپنی مصیبتوں کا دوش دیتے ہیں:۔

''اے غم! دنیا میں تیرے لائق کوئی اور بھی ہے۔ یا تم بس خوشحال ہی کے بن کر رہ گئے ہو''

غم کے ساتھ انسان کا دوہرا رشتہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو انسان کو بنیادی طور پر غم کی انفرادی حیثیت اور اسکے ہونے کی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے' گویا غم کی موجودگی کے احساس کے ساتھ زندگی کے گذارنے پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اگلے مرحلے میں ہر انسان کو اپنی اپنی جبلت' فطرت اور حواس کے مطابق غم کے ساتھ ایک سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے یا تو غم کو غم کے طور پر من وعن تسلیم کرلیا جاتا ہے یا اس کے سامنے سینہ تان کر اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ یا پھر رجائیت کے اسلحہ سے لیس ہو کر غم کو مار بھگایا جاتا ہے۔ خوشحال بابا نے غم کا مقابلہ سینہ تان کر بھی کیا اور اس کے خلاف رجائیت کا اسلحہ بھی استعمال کیا اس سلسلے میں خوشحال کے کہے ہوئے چند اشعار پیش خدمت ہیں:۔

''اس دنیا میں بانت بانت کی باتیں ہیں اور جگہ جگہ لشکر پڑے ہوئے

ہیں۔لیکن میرا دل پُرسکون ہے اور اپنی جگہ سے نہیں ہل رہا۔پہاڑ تو ایسا ہی ہوتا ہے"۔

"اے خوشحال پہاڑ کا چہرہ سورج کی گرمی برداشت نہیں کرسکتا۔کیا ہوا جو وہ کچھ دنوں کے لیے برف سے منجمد ہو جائے"

"خدا نے غم کو بغیر کسی حکمت کے پیدا نہیں کیا۔کیونکہ غم مرد اور نامرد میں تمیز کرنے کی کسوٹی ہے"۔

"اس دنیا میں وہی جوان (بہادر) کہلانے کے لائق ہیں۔جو سختی اور مصیبت کے سامنے سینہ سپر ہونا جانتے ہوں"۔

خوشحال نے ہمیشہ غم کو گلے لگایا اور پچھاڑ دیا۔انکے نزدیک انسان میں غموں کو گلے لگانے اور پچھاڑنے کی خاصیت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔جب وہ غیرت منداور باہمت ہو۔اسی لیے خوشحال نے اپنے کلام میں ہمت کو اپنانے پر بہت زور دیا ہے فرماتے ہیں:-

"اگر آسمان تمہیں شیر کے منہ میں بھی دے دے تو وہاں بھی اپنی ہمت کو قائم رکھ"

"مرد وہ اچھا جو باہمت اور بابرکت ہو۔اور دنیا کے ساتھ اچھے بُرے وقت میں زندہ رہ سکے"

"بلند ہمت انسان اوپر ہی اوپر ترقی کرتا جاتا ہے۔پست ہمتی انسان کو پاتال میں گرا دیتی ہے"

خوشحال کا فلسفہ رجائیت کی طرف مائل ہے۔بڑے سے بڑا غم بھی انہیں شکست خوردہ نہیں

کر سکتا۔ وہ مصیبتوں کے درمیان رہ کر جینے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ جناب میر عبدالصمد خان اس حقیقت کا ثبوت خوشحال کے کلام کی روشنی میں ذیل کے اشعار سے دیتے ہیں:۔

"مسرت اور شادمانی کے دنوں میں تو ہر شخص کا دل پُر سکون اور مسرور ہوتا ہے۔ لیکن (اصل) دل وہ ہوتا ہے جو ایامِ غم میں مردانہ اور شیر ہو"۔

"ہر شام کے بعد صبح ہوتی ہے۔ جو غمگین ہونگے وہ بالآخر مسرور و شادان بھی ہونگے"

"اگر میں منحوس ستارے کی گردش میں آ گیا ہوں تو کیا ہوا۔ ہلال بھی تو کبھی کبھی گہنا جاتا ہے"

"خدا مجھے دنیا میں بے غم نہ کرے۔ غم اور خوشحال تو آپس میں دیرینہ دوست ہیں"۔

"میرا دل پُر سکون ہے۔ کیونکہ غم اور خوشی دونوں گذر جانے والی چیزیں ہیں"

(میر عبدالصمد خان "رجائیت پسند خوشحال")

خوشحال کے کلام میں غم کے سلسلے کا ایک عجیب شعر وارد ہوا ہے۔ میں چاہونگا کہ آپ اس سے ضرور لطف اندوز ہوں:۔

"ناسمجھوں کے مزے ہیں کہ انہیں غم واندوہ نہیں ہوتا۔ دنیا میں جو بھی غم ہیں ہوشیاروں اور عقلمندوں کے لیے ہیں"۔

غالب کا فلسفۂ غم

"غالب کی ساری زندگی بلاشبہ اس بات کی گواہ ہے کہ وہ عمر بھر بے اطمینانی کے شدید احساس سے دوچار رہے۔ ان کے سامنے غم کا ایک پہلو دار تصور سن شعور سے لیکر زیست کے آخری لمحوں تک موجود رہا۔ غم تنہائی، غم عشق، غم بے مہرئ احباب، غم ستم ہائے روزگار، غرض انہیں ہر دکھ سہنے اور ہر رنج اٹھانے کی توفیق ملی۔

غم درحقیقت فن کار کی تخلیقی قوت کے لئے بہت بڑا محرک بن جاتا ہے لیکن اس بے اطمینانی کو بعض فنکار اپنی ذات پر اس قدر طاری کر لیتے ہیں کہ اس سے مغلوب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن غالب ہر ایسی انفعالیت کی بجائے ایک اثباتی کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے فن میں ان کے ذاتی رجحانات سے آخری حد تک ہم آہنگی موجود ہے۔ ان کے لب ولہجہ کی تندی اس نشاط آرزو کی پیداوار ہے جو لذت درد وغم کے نتیجہ میں انہیں حاصل ہوئی"۔

(سمیع اللہ قریشی "غالب اور غم دوراں")

ڈاکٹر محمد حسن کہتے ہیں کہ غالب نے زندگی کی حسرتوں میں تابنا کی ڈھونڈی ہے۔ ناکامیوں کے باوجود آرزومندی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تصور غم انہیں اپنے دور کی فکر

سے علیحدہ اور ممتاز کرتا ہے:-

''درد و غم کی طرف یہی رویہ ہے جو غالب کو جدید ذہن کے لیے قابل قبول بناتا ہے۔ غالب غم آشنا ہیں لیکن غم پرست نہیں۔ وہ آرزو کرنا جانتے ہیں۔ اور اپنی دوروزہ جوانی کی شکستوں کا شمار بھی پورے درد و غم کے ساتھ کرسکتے ہیں۔ لیکن اس سے تھک کر نہ وہ دنیا اور اس کی آرزو ترک کرسکتے ہیں اور نہ ذہن کو غم پرستی کے حوالے کرتے ہیں۔ وہ نہ آتش ہیں نہ میر، غم کی یہ سرمستی اور جان نوازی، غالب کے کلام کا بنیادی نغمہ ہے۔ غالب نے اس رویہ کو خود اس طرح یکجا کردیا ہے:-

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

(ڈاکٹر محمد حسن۔''غالب کا تصور غم'')

غالب کو بچپن میں جو آسائشیں میسر تھیں۔ وہ انہیں تاعمر چاہئیں تھیں مگر حالات نے انہیں یہ آسائشیں تو میسر نہیں کیں مگر اس سے ایک قدم آگے بڑھکر انہیں معاشی تنگ دو دو میں گرفتار کردیا مگر ان کی فطری عالی ہمتی نے اسے زندگی کرنے کا حصہ جانا اور اپنی ڈگر پر خوشدلی سے آگے بڑھتے رہے:-

''عام زندگی میں غالب کو اتنے مصائب اور صدمات سے دوچار ہونا پڑا کہ اسکی قوت برداشت بہت بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ وہ مصائب کو خندہ و استہزا میں اڑا دینے کے قابل ہوگیا

تھا۔ اس سے اس کا وہ فلسفۂ حیات مرتب ہوا جس کے مطابق درد جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو دوا بن جاتا ہے:

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

بعض دوسرے ادباء کے نزدیک غالب حوادث زمانہ سے بُری طرح متاثر ہوکر پورے سنسار کو دکھیا تصور کرلیتے ہیں۔ گو کہ وہ غم کا خوگر ہوکر اسے اپنے اوپر طاری کرتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت ذیل کے اشعار میں بھی جھلکتی ہے:-

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے دوچار ہے

غالب کے تصور غم' فلسفہ' غم اور قنوطیت کا مطالعہ کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ان کے تغزل میں نہ یہ کہ شوخی کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ بلکہ انہیں اس شوخی کلام کی وجہ سے حیوان ظریف کا درجہ بھی عطا کیا گیا۔ یہ سب غالب کی فنکاری اور جدت ادا سے ہی ممکن ہوا۔ آیئے اس ضمن میں چند آراء ملاحظہ کریں:-

"غالب کی شاعری کی ساری فضا پہ انہی حزینہ ارتسامات اور غمگین ارتعاشات کی دبیز چادر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس چادر کو آپ جب بھی اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔ غالب کے لب چاہے کتنے ہی آشنائے خندہ کیوں نہ نظر آئیں لیکن اس کا دل ہمیشہ محیط

گریہ ہی دکھلائی دے گا۔۔۔۔ غالب کا کلام ایسے جواہر پاروں سے بھرا پڑا ہے جن کی چمک دمک رہتی دنیا تک ماند نہیں پڑ سکتی:۔

غنچہ لگا پھر کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے"

(شریف رزمی "غالب اور قنوطیت")

اسکے برعکس جب حالی نے اپنے استاد محترم یعنی غالب کو حیوان ظریف لکھا تو گویا ہمیں غالب کی فطرت کے راز سے آگاہ کر دیا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حسن فاروقی کا خیال ہے۔

"غالب کو نہ معلوم کیا کیا کہا گیا ہے۔ مگر سب غلط۔ وہ حیوان ظریف کے سوا اور کچھ ہیں ہی نہیں۔ ان کو مفکر، المیہ نگار، غزل خواں، مدح سرا، تنقید نگار اور نہ معلوم کیا کچھ ثابت کیا گیا۔ وہ یہ سب ہیں مگر یہ سب باتیں ان کی ظریف حیوانیت کا حصہ ہیں۔ وہ مکمل حیوان ظریف ہیں جو اپنی ظرافت میں تمام کائنات کو ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے جذباتی تاثرات کو لے لیتے ہیں"۔

آگے چلکر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

''میتھیو آرنلڈ نے شیکسپیئر کے بابت جو دقیق ترین تنقیدی بات کہی ہے۔ وہ یہ ہے: Thou Smiles and Art Still تو مسکراتا ہے اور خاموش ہے۔ یہ بنیادی مسکراہٹ ہی شیکسپیئر کی ہر تخلیق کی جان ہے اور یہی غالب کے ہر شعر میں موجود ہے۔ غالب کا ادراک بھی آفاقی ہے۔ جس میں دردناک سے دردناک بات کے پس منظر میں بھی ایک شگفتگی ہے جو درد کے پیچھے ایک عجیب دائمی مسکراہٹ کو چھپا ہوا دکھاتی ہے''۔

(ڈاکٹر احسن فاروقی ''حیوان ظریف'')

غالب نے اپنے ایک شعر میں قدرت سے بظاہر ایک گلہ کیا ہے مگر اس میں چھپی ہوئی غالب کی ظرافت ہم سے چھپ نہیں سکتی:-

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

غالب کے فلسفۂ غم پر ڈاکٹر عبادت بریلوی نے گویا حرفِ آخر کے طور پر فرمایا ہے:-

''یوں غالب کی شخصیت میں بڑا غم ہے۔ زندگی سے ان کے جو تقاضے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ انہوں نے جس بات کی تمنا کی تھی وہ تکمیل سے ہمکنار نہیں ہوئی۔ ان کے ارمان اگر چہ بہت نکلے ہیں لیکن پھر بھی کم نکلے ہیں۔ ان کے دل میں حسرت ہستی کا

داغ ہے اور اس صورت حال کو انہوں نے کچھ زیادہ ہی محسوس کیا ہے۔ کیونکہ ان کا دل غم کھانے میں بہت بودا ہے۔ لیکن داغ حسرت ہستی سے پیدا ہونے والے غم اور مے گل فام کی کمی سے پیدا ہونے والے رنج نے ان کے یہاں اداسی کی تاریکی پیدا نہیں کی ہے۔ اس اداسی کے باوجود ان کے یہاں روشنی کا احساس ہوتا ہے ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس غم کے باوجود زندگی سے دلچسپی لے سکتے ہیں۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر ہنس سکتے ہیں مسکرا سکتے ہیں۔ وہ روتے ہیں لیکن انہیں رونا نہیں آتا۔ اسی لئے وہ رونے میں بھی ہنستے ہیں۔ انہیں ہنسنے پر رونا نہیں رونے پر ہنسنا ضرور آتا ہے۔ ان کی شخصیت کی یہ خصوصیت بڑی حد تک اس سماجی، تہذیبی اور فکری ماحول کی پیدا کردہ ہے۔ جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اور جس میں ان کے ذوق و شعور کا نشو و نما ہوا''

(ڈاکٹر عبادت بریلوی ''غالب کے تغزل میں شوخی کا پہلو'')

مگر کیا کیجئے کہ غالب کی نوک خامہ سے یہ شعر بھی نکلا ہے:-

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

موازنہ

خوشحال و غالب ہر دو کے کلام میں دو ایسے اشعار وارد ہوئے ہیں جو ان نابغہ شعراء کے تصورات غم کو صاف طور پر سامنے لاتے ہیں اور ان کا فرق اجاگر ہو جاتا ہے۔ جہاں خوشحال نے کہا:-

که آسمان د مزکې خله و بله ور وړی
د خوشحال خاطر به نه وی بې سروره

ترجمہ:-''اگر آسمان اور زمین باہم پیوست ہو جائیں تو بھی خوشحال کا دل مسرت سے تہی نہ ہوگا''۔

وہاں غالب حوادث کا مقابلہ اس طور کرتے ہیں:-

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
خدا نے ہم کو دیا ہے وہ دل کہ شاد نہیں

لیکن بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو جہاں خوشحال اپنے غموں کے سامنے پہاڑ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہاں غالب بھی غم سے شکست نہیں کھاتے اور اپنے غم واندوہ کو مزاح و ظرافت کی ڈھال سے روکتے ہیں۔ یوں یہ دونوں اپنے اپنے طور پر غم دوراں کا مقابلہ کرتے رہے۔

خوشحال و غالب کی نثر

اگر خوشحال جدید پشتو نثر کے بانی ہیں تو غالب جدید اردو نثر کے بانی ہیں۔ آیئے ان دونوں کی نثر پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

خوشحال کی نثر

خوشحال سے پہلے پشتو ادب میں نثر کی چند ہی تحریریں موجود تھیں۔ پشتو کے اولین نثر نگار ابو محمد ہاشم (۲۲۳ھ تا ۲۹۷ھ) تھے۔ جس نے ایک نثری کتاب ''د سالو وږمه'' کے نام سے لکھی۔ اس کتاب کی نثر پر عربی کا اثر نمایاں تھا۔ کیونکہ یہ عربی شاعری کی فصاحت و بلاغت سے متعلق تھی۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔

ابو محمد ہاشم کے بعد جس پشتو نثر نگار کا نام سامنے آتا ہے وہ قندھار کا سلیمان ماکو ہے۔ جس نے ۶۱۲ھ میں تذکرۃ الاولیاء کے نام سے ایک کتاب پشتو نثر میں لکھی۔ یہ کتاب پشتونوں کے اولیاء اور شعراء کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ افغان محقق صدیق اللہ رشتین کے مطابق یہ کتاب پشتو زبان کی پہلی نثری کتاب ہے۔

سلیمان ماکو کے تقریباً دو صدیوں بعد ۸۲۰ھ میں مشہور یوسفزئی شخصیت شیخ ملی

نے دفتر شیخ ملی کے نام سے ایک نثری کتاب لکھی جس میں زمین کے بندوبست کی تفاصیل اور ہدایات دی گئی ہیں۔

شیخ ملی کے بعد ایک دوسرے یوسفزئی ادیب کجو خان رانی زئی نے ۹۰۰ھ میں تاریخ کجو خان کے نام سے ایک نثری کتاب لکھی۔ جس میں اس نے پشتونوں کی تاریخ اور حالات لکھے ہیں۔

اس کے بعد ۹۷۸ھ میں بایزید انصاری نے خیر البیان کے نام سے اک نثری کتاب چھوڑی ہے جس کا موضوع مذہب تھا۔ اس کتاب کے جواب میں ایک اور عالم حضرت اخون درویزہ نے بایزید انصاری کے خیر البیان میں دیئے گئے مذہبی عقائد کو جھٹلانے کے لئے ۱۰۱۵ھ میں مخزن اسلام کے نام سے ایک نثری کتاب لکھی۔ جناب خاطر غزنوی ان دونوں کتابوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:-

"خیر البیان اور مخزن دونوں کتابوں کی نثر مسجع اور مقفی ہے"

(خاطر غزنوی "خوشحال نامہ")

خیر البیان اور مخزن کے بعد ۱۰۷۶ھ میں خوشحال خان کی نثری کتاب دستار نامہ منظر عام پر آئی۔ جسکی نثر خیر البیان اور مخزن کی نثر کے مقابلہ میں غیر مسجع اور سادہ تھی۔ دستار نامہ سے جدید پشتو نثر کا آغاز ہوا۔ میاں سید رسول رسا کے مطابق (پشتو میں) دستار نامہ کی نثر سے بہتر نثر کسی نے نہیں لکھی۔

خوشحال بابا نے اس کتاب کے لکھنے کی وجہ اور مقصد کو کتاب کے شروع میں یوں بیان کیا

ہے:-

ترجمہ:-اس انشاء اور املا کا بانی کہ اس تصنیف کے لکھنے کا باعث ہوا یہ شعر ہے:-

دستار باندھنے والے تو ہزاروں ہوتے ہیں

لیکن صاحب دستار چند ایک ہی ہوتے ہیں

یہ شعر فراق نامہ میں وارد ہوا ہے۔ اس شعر کی دو بحریں اور دو قافیے ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ ایک ایسا مختصر رسالہ لکھوں جس کی عبارت رواں ہو۔ قریب الفہم ہو۔ نام 'دستار نامہ' اس شعر کے معنیٰ کی نسبت سے رکھوں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس مشغلے کے ذریعے اپنی فکر کو خرچ کروں اور یوں اپنی دلگیری کو دفع کروں اور یہ کہ اس کے لکھنے سے کسی کا فائدہ ہو جائے ان اسباب نے میرا ارادہ اس کتاب کو لکھنے کے لیے مصمم کیا"

اس کتاب میں خوشحال خان نے یہ بتایا ہے کہ ایک قومی رہنما کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیے۔ دستار نامہ پہلی بار ۱۹۵۲ء میں پشاور سے اور ۱۹٦٦ء میں کابل سے شائع ہوئی۔ قیام الدین خادم نے بھی دستار نامہ چھپوایا۔ دستار نامہ کا اردو ترجمہ جناب خاطر غزنوی نے کیا اور ۱۹۸۰ء میں پشتو اکیڈیمی نے شائع کیا۔

محمد زبیر حسرت کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب ۱۰۷٦ھ بمطابق ۱٦٦۵ء میں لکھی گئی۔ محترمہ بی بی مریم نے لکھا ہے کہ محترمہ خدیجہ فیروز الدین نے خوشحال خان خٹک کی

زندگی پر اپنے پی ایچ ڈی (ڈی لٹ) کے مقالہ میں دستار نامہ کی تکمیل کا سال ۱٦۸۵ء بتایا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ محمد زبیر حسرت آگے چل کر کہتے ہیں:-

"پشتو نثری ادب میں اس کتاب کو پہلی جدید نثری کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسے خوشحال خان نے رنتھنبور میں اپنی اسیری کے دوران لکھا۔ اور یہ کہ اس کتاب کو لکھنے کے دوران خوشحال بابا کے پاس نہ تو مطالعہ کے لیے کوئی کتب موجود تھیں اور نہ ہی کوئی دوسرے ذرائع میسر تھے۔ خوشحال خان خٹک خود اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ کتاب اپنے پچھلے مطالعہ اور اپنی علمیت کے زور پر لکھی ہے"

(محمد زبیر حسرت "دخوشحال نامے")

جناب خاطر غزنوی مترجم دستار نامہ اس کتاب کی افادیت اور نثری محاسن پر یوں رقمطراز ہیں:-

"خوشحال نے اپنی کتاب میں لائق دستار کے لفظ پر پوری توجہ دی ہے اور دو ابواب میں سرداری کی صفات کی نشاندہی کی ہے۔۔۔۔ اپنی افادیت کے لحاظ سے دستار نامہ کو افلاطون کی کتاب جمہوریہ، شیخ سعدی کی گلستان سعدی، امیر کیکاوس بن سکندر قابوس کی قابوس نامہ اور میکاولی کی شہرہ آفاق کتاب The Prince (شہزادہ) کے

مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔مگر دستار نامہ ایک الگ رجحان اور مختلف نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔خوشحال خان نے بیس خصلتوں کو تفصیل سے بیان کر کے بادشاہوں اور سرداروں کو اخلاقی بلندیوں کا راستہ دکھایا ہے۔اپنے موضوع کی رفعت و وسعت اور آفاقیت کے ساتھ ساتھ دستار نامہ پشتو نثر کا نادر اولین نمونہ ہے۔اس کی نثر سادہ اور رواں ہے جبکہ اس سے پیشتر بایزید انصاری اور آخون درویزہ کی تصنیفات مسجع مقفیٰ اور گنجلک عبارات کی حامل ہیں۔یوں ہم دستار نامہ کو پشتو کی جدید نثر کا اولین حسین نقش کہہ سکتے ہیں۔اس انداز نے آئندہ پشتو نثر پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور پشتو ادب کے دامن کو ایسے جواہر پاروں سے نوازا''

(خاطر غزنوی ''خوشحال نامہ'')

خوشحال کی پشتو نثر سے متعلق چند دوسرے شعراء وادباء کی آراء سے معلوم ہوتا ہے کہ:-

''خوشحال خان خٹک نے نثر میں دو تصانیف چھوڑی ہیں۔ایک ان کی بیاض یا روزنامچہ تھا جس کا کچھ حصہ خوشحال خان کے پوتے افضل خان خٹک نے اپنی کتاب تاریخ مرصع میں شامل کیا ہے۔مگر باقی (روزنامچہ) اب دستیاب نہیں دوسری تصنیف دستار نامہ ہے''

(ڈاکٹر خالد خٹک ''خوشحال نامہ ۱۹۸۰ء ص ۲۱۸'')

''خوشحال بابا کی گفتار اور کردار کی تعریف اور اعتراف ہر وہ شخص کرے گا۔ جس نے دستار نامہ میں دیئے ہیں ہنر اور بیس خصائل کا مطالعہ گہری فکر و نظر کیساتھ کیا ہو''

(روخان یوسفزئی ''تاترہ' اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۱ء ' ص ۱۹۷)

پروفیسر محمد قاسم مظہر اس بارے میں یوں رقمطراز ہیں:-

''گوکہ خوشحال نثر میں عربی فارسی سے متاثر ہے۔ اور مسجع و مقفیٰ تحریر کو اس وقت کے رواج کے مطابق بہتر سمجھا ہے۔ لیکن اس کی نثر ایسی نہیں کہ اس پر ''بلینک ورس'' کا گمان کیا جا سکے۔ خوشحال نے اپنے بعد آنے والوں کو سادگی سے لکھنے کی راہ سُجھائی یعنی ایک Pioneer کا کردار ادا کیا ہے''

(پروفیسر محمد قاسم مظہر ''خوشحال مطالعہ'')

''خوشحال جدید پشتو نثر کا بانی ہے اس نے پشتو نثر کو نیا موڑ دیا۔ اسے مقفیٰ مسجع تکلفات سے چھڑا کر بے تکلف' سادہ اور عام فہم اسلوب دیا۔ اور اس طرح اس پر ترویج و ترقی کے راستے کھول دیئے''

(فارغ بخاری' رضا ہمدانی ''خوشحال خان خٹک'' مطبوعہ لوک ورثہ اسلام آباد ص ۱۵)

''خان علیین مکان کی نثر پشتو ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے وہ پہلا افغان ادیب ہے جس نے پشتو نثر کو بڑی حد تک

غیر ضروری تکلفات اور عربی فارسی کے نامانوس الفاظ سے آزاد کیا
اور عام پشتو انداز گفتگو اور روزمرہ محاورہ کے بالکل قریب لے آیا''
(دوست محمد خان کامل مرحوم [1])

آخر میں دستار نامہ کے آغاز کا ذکر خوشحال خان کے الفاظ میں بطور نمونہ پیش خدمت ہے۔ جناب خاطر غزنوی مترجم دستار نامہ نے انہیں پشتو سے اردو میں یوں ترجمہ کیا ہے:-

''معلوم ہونا چاہیے کہ سر پر دستار باندھنے کا مطلب نمود و نمائش نہیں۔ دستار آدمی کی حیا اور عزت کا نشان ہے۔ مرد کی حیا تمام تر دستار میں ہے۔ دستار کی اہلیت ان خصائل اور فنون پر موقوف ہے جن کے عدم حصول کی صورت میں سراسر نقصان ہے۔ ہنر، پیشے، فنون، صنعت و حرفت، عادات و خصائل بے حد و بے شمار ہیں۔ ان کا احاطہ کرنے کے لئے عمر نوح درکار ہے۔ ان کا حصول تصور سے بعید لیکن پھر بھی جس قدر ان کی تحصیل سے انسان اہل کہلا سکے ان کا حصول لازمی ہے۔ اگر اتنا بھی نہ ہو سکے تو ایسے شخص کو نا اہل قرار دیا جائے گا۔ وہ لائق دستار نہیں گردانا جائے گا''۔

اس مضمون کو ہم اس نوٹ پر ختم کرتے ہیں کہ خوشحال بابا نے فارسی نثر میں کوئی قابل ذکر تحریر نہیں چھوڑی گو کہ صرف ان کا فارسی شعری کلام ہم تک پہنچا ہے۔

---

[1] خوشحال خان خٹک از ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک، پښتو رسالہ پشاور، جون، جولائی۔ اگست ۲۰۰۱ء

غالب کی نثر

اپنی فارسی نثر اور شاعری کو اپنی اردو نثر اور شاعری سے بہتر سمجھنے والے غالب کو انکی اردو نثر اور شاعری نے ہی شہرت دوام بخشی۔ غالب صرف اردو شاعری میں ہی اعلیٰ مقام نہیں رکھتے بلکہ اردو نثر میں بھی صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ انکی جدت پسندی نے ان کے خطوط کو مراسلے سے مکالمہ بنادیا۔ طنز و مزاح ان کے ہر خط کی جان ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں:-

> ''غالب کے زمانے تک اردو نثر نے ترقی کی دو بڑی منزلیں طے کی تھیں۔ ایک ملا وجہی سے فورٹ ولیم کالج تک اور دوسری فورٹ ولیم کالج سے غالب تک۔ جب مرزا غالب نے اردو میں مکتوب نگاری شروع کی تو ان کے سامنے نثر نگاری کے دو انداز موجود تھے ایک وہ پُرتکلف انداز جو فارسی انشاپردازی کے تتبع میں اردو میں رواج پاچکا تھا۔ دوسرا سادہ اور سلیس طریقہ جس کو فورٹ ولیم کے نثر نگاروں نے رائج کیا۔ مرزا غالب نے ان دونوں طرزوں کے امتزاج سے نثر نگاری کی ایک نئی طرز ایجاد کی''

(ڈاکٹر سید عبداللہ ''غالب کی اردو نثر'')

فورٹ ولیم کالج سے پہلے اردو نثر میں جو پرتکلف انداز اپنایا جاتا تھا اس میں واقعیت اور اصلیت سے زیادہ شاعرانہ رنگ کی بہتات ہوتی پُرشکوہ الفاظ کو انکے معانی پر ترجیح دی جاتی ۔مقصدیت کا عنصر کم ہوتا اور اس کے مقابلے میں عبارت کی آرائش اور زیبائش پر زیادہ دھیان دیا جاتا۔فورٹ ولیم سے پہلے کے اردو کے دو بڑے نثری کارنامے ملاوجہی کی سب رس اور تحسین کی نوطرز مرصع اسی طرز انشا کی حامل کتابیں ہیں۔

جہاں تک سادہ اور سلیس اردو نثر کا تعلق ہے تو اس کی تحریک اور ترقی فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی مرحون منت ہے۔جیسا کہ معلوم ہے فورٹ ولیم کالج کی بنا انگریزوں کو اردو سکھانے کی غرض سے رکھی گئی تھی۔ اس کے بڑے بڑے نمائندے میر امن دہلوی' حیدربخش حیدری اور میر شیر علی افسوس تھے۔ان ادیبوں نے اردو نثر میں فارسی اور عربی ترکیبوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔مگرانکی تحریروں میں بھی مسجع نگاری (یعنی قافیہ بندی جس سے نثر پرنظم کا گمان ہو) موجودتھی۔اس دور کی نمائندہ کتاب کے طور پر میر امن کی ''باغ و بہار'' کو رکھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق :-

> ''فورٹ ولیم سے غالب تک کے عرصے میں فورٹ ولیم کے طرز کی سادہ اردو نثر کو عوام میں قبولیت نہ ملی کیونکہ یہ تحریک کلکتہ میں ظہور پذیر ہوئی۔ جو اردو کے دوسرے دو دبستانوں یعنی دہلی اور لکھنؤ سے دور واقع تھا۔لکھنو کے ادبی دبستان میں ان دنوں تکلف اور طمطراق سے

کام لیا جاتا اسلئے اس کے سامنے فورٹ ولیم کی سادگی اور سلاست کا چراغ نہ جل سکا۔ رجب علی بیگ سرور کی ''فسانہ عجائب'' اس دور کی نمائندہ تحریر ہے۔ جس میں اس دور کا پُر تکلف طرز موجود ہے۔ فسانہ عجائب ''سادگی'' کی تحریک کے خلاف ایک ایسا احتجاج ہے جو مرغوب کن ہونے کے باوجود کامیاب نہیں ہوا''۔

ان حالات میں غالب نے اردو خطوط نویسی کو ایک ایسے اسلوب سے روشناس کیا جس میں قدیم پرتکلف انداز اور فورٹ ولیم کالج کی سادہ نگاری کو یکجا کر دیا گیا۔ سادگی' بول چال کی بے تکلفی' نثر کی ضرورتوں کے احساس' مکتوب نویسی۔ جزئیات نگاری' جذبات' اثر آفرینی' شوخی' ظرافت اور ذومعنی الفاظ کے استعمال جیسے امتیازی خصائص کی وجہ سے غالب کی نثر اردو ادب کے بہترین کارناموں میں شمار ہوتی ہے۔

''غالب نے اگرچہ اردو شاعری کو نیا رنگ' نیا آہنگ دیا مگر اردو نثر کو انہوں نے ایک معنی میں نئی زندگی دی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اردو نثر کی اہمیت فارسی نثر سے زیادہ ہے۔ فارسی میں وہ ایک صاحب طرز انشاپرداز اور کہنہ مشق استاد ہیں مگر اردو میں وہ جدید نثر کے بانی اور مکتوب نویسی کے راہ نما ہیں''

(آل احمد سرور ''غالب کی عظمت'')

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مطابق:۔

''غالب کی باد بہار طبیعت کی حسن آرائی کا تماشا دیکھنا ہو تو ان کے خطوط پڑھیئے۔ خطوط میں اپنے یار دوستوں سے دوستانہ چھیڑ چھاڑ یوں جاری رہتی تھی۔

''سنو میاں سرفراز حسین، ہزار برس میں تم نے مجھے ایک خط لکھا۔ اس خط کو پڑھتا ہوں اور ڈھونڈتا ہوں کہ میرے واسطے کونسی بات ہے مجھ کو کیا پیام ہے کچھ نہیں شاید دوسرے صفحے میں کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر، یا رب سرنامہ میرے نام کا۔ آغاز تقریر میں القاب میرا، پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا، یہ کیا سر ہے؟ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور میرنؔ صاحب کا نام اور ان کے لیے سلام تک بھی اس میں نہ ہوگا تو میں اس کا جواب آنکھوں سے لکھوں گا''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

''مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جئے جاتا ہوں، باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ پیتا ہوں جب موت آئے گی مر رہونگا، شکر ہے نہ شکایت، جو تقریر ہے بر سبیل حکایت''

غالب اپنے گرد و پیش کا نقشہ اپنے خطوط میں اس طور کھینچتے کہ اپنے مکتوب الیہ کو اپنے

ماحول میں کھینچ لاتے:-

''کوٹھڑی میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا
جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں تم سے باتیں
کرنے کو جی چاہا یہ باتیں کر لیں''

غالب سے پہلے مکتوب نگار اپنی شخصیت اور سیرت کو چھپانے میں کامیاب رہتے تھے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مطابق ''غالب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بے باکی کے ساتھ اس آئینہ کے سامنے آ کر آنچہ می نمایم ہستم کہتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ اس لئے ان کی خوبیاں ہی نہیں ان کی برائیاں بھی ہمیں صاف صاف نظر آئیں۔ ان کی توانائیاں ہی نہیں ان کی کمزوریاں بھی ہم نے دیکھیں''۔

(ڈاکٹر شوکت سبزواری ''غالب خطوط کے آئینے میں'')

مالک رام نے اپنے مضمون آزاد بنام غالب میں غالب کی اردو نثر کو مولانا محمد حسین آزاد کی تنقیدی نظر سے یوں دیکھا ہے:-

''یہاں تک تو نظم کا بیان تھا۔ اب ذرا نثر کا بھی سن لیجئے۔ جس کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ نئی اردو کا بانی بلکہ موجد غالب ہے۔ اور اردوئے معلٰی اس دین کی ''ایزدی'' کتاب ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد غالب کے اردو خطوط کے مجموعے اردوئے معلٰی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''اس مجموعے کا نام مرزا نے خود اردوئے معلٰی رکھا۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا

سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں۔ مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی تھیں۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو وہ جانیں یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے چنانچہ (غالب) فرماتے ہیں:-

''اب ورنگ ورزی کی تقصیر معاف کیجئے''

''یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے''

مولانا آزاد کے مطابق غالب اردو نثر میں فارسی ترکیبوں اور محاوروں کا ترجمہ لکھتے تھے۔ جو اردو کے اہل زبان کے روزمرہ کے خلاف ہوتا ہے۔ ان کی اردو سوائے غیر سنجیدہ تحریر کے اور کسی مصرف کی نہیں اور ان کے اردو خطوط عام قاری کے لیے بے مزہ ہیں۔

(مالک رام آزاد بنام غالب آجکل۔ دہلی)

آیئے اب زاویہ بدلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ معروف غالب شناس ڈاکٹر اعجاز حسین غالب کی نثر کے متعلق کیا تاثر رکھتے ہیں:-

''غالب کی علمی جولان گاہ سے متصل ایک نیا میدان نظر آتا ہے۔ شعر و شاعری کے گلستان سے نکل کر وہ نثر کی دنیا میں بھی خراماں خراماں چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اردو میں انہوں نے مکتوب نگاری کا وہ انداز پیدا کیا جو عدیم المثال تھا۔ جو شہرت اور انفرادیت ان کے اردو خطوط کو نصیب ہوئی وہ نہایت اہم و ہمہ گیر تھی۔ یہ خطوط اپنی ندرت کی وجہ سے

بہت جلد مقبول ہو گئے۔ یہاں ان کی مکتوب نگاری کی خصوصیات پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں۔ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے کہنا صرف یہ ہے کہ ان کے اشعار کی طرح خطوط میں بھی ندرت و جاذبیت تھی بلکہ ایک لحاظ سے یہ نثری خدمت شعری کاوش سے بہتر ثابت ہوئی۔۔۔ یہ عجیب بات تھی کہ جو شخص نظم کے میدان میں اتنا مشکل پسند ہو وہی شخص نثر کی دنیا میں قدم رکھتے ہی اتنا سہل پسند و بے تکلف ہو جائے کہ ہر کس و ناکس اس کو بغیر کسی دماغی کاوش کے آسانی سے سمجھ لے۔ انداز بیان دیکھ کر یقین کرنا پڑے کہ سچ مچ مرزا نے۔۔۔ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا"

(ڈاکٹر اعجاز حسین ''غالب اپنے زمانے میں'')

خطوط غالب کے متعدد مجموعے مختلف اوقات میں مختلف ناموں سے چھاپے گئے۔ یعنی عود ہندی، اردوئے معلیٰ، ادبی خطوط غالب، مکاتیب غالب، خطوط غالب، نادرات غالب، نادر خطوط غالب اور غالب کی نادر تحریریں۔ ان مجموعوں کی طباعت کا عرصہ غالب کی وفات کے سال ۱۸۶۹ء سے لیکر ۱۹۶۲ء تک پھیلا ہوا ہے۔

غالب کا بہترین خط۔ میری نظر میں

یوں تو غالب کے خطوط دلچسپ کھلے لہجے اور سادگی کی اکمل مثالیں ہیں۔لیکن وہ جو ہم کہتے ہیں کہ غالب نے فن خطوط نویسی کو مکالمے کا فن بنا دیا ہے۔تو اس کی بہترین مثال اب تک میری نظر سے گذری وہ اردوئے معلیٰ (مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل، پبلشر مجلس ترقی اردو لاہور) میں ص ۴۳۹ پر موجود غالب کا یہ خط ہے۔آپ بھی پڑھیئے اور حظ اٹھایئے:

خط بنام ظہیر الدین خان صاحب

پنج شنبہ ۲ نومبر ۱۸۶۵ء

''اقبال نشاں، حکیم ظہیر الدین احمد خان کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہونچے۔کہوں میاں تمہارا مزاج کیسا ہے؟ اور تمہارے بھائی تفضل حسین خاں کیسے ہیں؟ اگر ملو تو میری دعا کہنا اور مزاج کی خیر پوچھنا اور اپنے والد ماجد کو بھی میری دعا کہنا۔

سنو میاں ظہیر الدین تم اپنی دادی کے پاس چلے جاؤ اور ان سے میری اور دونوں لڑکوں کی عافیت کہو۔اور پوچھو کہ شہاب الدین خان نے اکتوبر مہینے کی تنخواہ کے پچاس روپے پہنچا دیئے یا نہیں؟ کیدار ناتھ ڈیوڑھی پر آ کر جعفر بیگ وفادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا یا نہیں؟ اچھا میرا بیٹا! یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھیو۔دیر نہ کیجیو۔

خط کے جواب کا طالب ''فقیر غالب

آخر میں غالب کی اردو نثری طرزِ تحریر میں سفر نصیبی' انسان دوستی اور بے تکلفی کے عناصر کو اجاگر کرنے کی غرض سے ایک خط کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے:-

"قلندری و آزادگی وایثار و کرم کے جو دعاوی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا معہ سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چلدوں' کبھی شیراز جانکلا' کبھی مصر میں جاٹھہرا ' کبھی نجف جا پہنچا' نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں' اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی' جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو ننگا بھوکا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور' خلق کا مردود' بوڑھا' ناتواں بیمار' فقیر' نکبت میں گرفتار میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے' وہ میں ہوں"

موازنہ

جب ہم خوشحال و غالب جیسی نابغہ شخصیتوں کی نثر کا موازنہ کرتے ہیں تو کھلتا ہے کہ دونوں کی نثری کاوشوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ غالب نے خوشحال کی نسبت اپنی نثر میں زیادہ بوقلمونی دکھائی ہے۔ دوسرے زاویئے سے دیکھا جائے تو دونوں نے اپنی اپنی زبان کی جدید نثر کی بنیاد رکھی۔

خوشحال و غالب کے کلام میں تصوف

خوشحال و غالب کے کلام میں تصوف پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ تصوف کے نظریہ کے بنیادی نکات ذہن نشین کر لئے جائیں۔ جب ہم تصوف کی بات کرتے ہیں تو یونانی تصوف، عجمی تصوف یا اسلامی تصوف کی بات کر رہے ہوتے ہیں اور جب عجمی یا اسلامی تصوف پر بات چھیڑتے ہیں تو شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت، مجاز، وحدت الوجود اور وحدت الشہو جیسے الفاظ سامنے آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب کچھ آپس میں اس طرح سے گڈ مڈ ہیں کہ قاری کو ایک پیچیدگی کا احساس دلائے بغیر نہیں رہتے۔ آیئے سب سے پہلے تصوف کے متعلق جانیں۔ ماہر خوشحالیات اور پشتو کے معروف ادیب میاں سید رسول رسا نے اسکی تفصیل یوں دی ہے:-

''افلاطون کو یونانی تصوف کا بابا کہا جاتا ہے افلاطون کا نظریہ امثال اور نظریہ حسن محض عجمی تصوف کی بنیاد ہیں۔ اگر چہ ظاہراً مسئلہ وحدت الوجود عجمی تصوف کی روح نظر آتا ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ جو دنیا ہماری نظروں کے سامنے موجود ہے یہ حقیقی دنیا نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی دنیا کوئی اور ہے۔ وہ عالم امثال کی دنیا ہے اور ہماری دنیا جیسا کہ ہمکو نظر آتی ہے عالم امثال کی دنیا یا حقیقی دنیا کا سایہ یا عکس ہے۔ افلاطون اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ

اگر ایک شخص کسی غار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جائے اور اسکی پیٹھ پیچھے سے قسماقسم مخلوقات گذریں اور وہ شخص غار کی اندرونی دیوار پران مخلوقات کا محض سایہ ہی دیکھ پاتا ہو اور اصلی مخلوقات اسکی نظروں سے اوجھل ہی رہیں۔ تو یہ افلاطون کے نظریہ امثال کا ثبوت ہوگا۔ یا آجکل کے زمانے میں سینما ہال کی مثال لیں۔ آپ ایک پروے کی طرف منہ کر کے بیٹھے ہیں اور آپکے پیچھے ایک مشین میں سے اصلی تصاویر کو گذار کر روشنی کی شعاعوں کے ذریعے ان کا عکس پروے پر ڈالا جاتا ہے۔ تو آپ اصلی تصاویر نہیں بلکہ ان کا عکس دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ افلاطون کا نظریہ حسن محض یہ تھا کہ جمال حقیقی کی خوبصورتی انسان کو ایک حسین چہرے میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اور پھر یہ جمال انسان کو ہر چہرے پر نظر آنے لگتا ہے۔ بلکہ اسے یہ پوری کائنات اس جمال کے نور سے منور نظر آتی ہے۔ افلاطون کے حسن محض کا نظریہ اس پشتو شعر میں بند نظر آتا ہے:-

اول خوبں مې د يار حسن بيا مې خوبں همه حسين وو
اوس په داسې ځائے مقيم يم چې مې خوبں دى خيال د حسن

ترجمہ:- پہلے پہل مجھے یار کا حسن پسند آیا بعد میں تمام حسین اچھے لگنے لگے۔ اور اب میں ایک ایسے مقام پر مقیم ہوں کہ مجھے حسن کا خیال تک بھاتا ہے۔

آگے چلکر میاں سید رسول رسا وحدت الوجود پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:-

”وحدت الوجود کا نظریہ سپین کے محی الدین العربی نے دیا ہے۔
تصوف کے اس مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس عالم میں ہزاروں لاکھوں

مختلف چیزیں نظر آتی ہیں۔ یہ ظاہری کثرت دراصل ایک وحدت محض ہے۔ یا وحدت محض کی مختلف شکلیں یا رنگ ہیں۔ ان تمام چیزوں میں وہی ایک ذات جاری وساری ہے اور ہر چیز میں اس کا حسن جھلکتا ہے۔ یا اس کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں۔ تمام موجودات اور ممکنات اس وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا کرشمہ ہیں۔ وحدت الوجود کے اس فلسفہ سے صوفیاء نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ دنیا اور مافیہا کی کچھ وقعت نہیں کیونکہ اس دنیا کی کوئی چیز حقیقی نہیں ہے۔ اسی لیے دنیا کی چیزوں میں دل لگانا ایک عبث کام ہے ۔۔۔ ہندوستان میں مسئلہ وحدت الوجود کی اصطلاح حضرت مجدد الف ثانی نے سب سے پہلے استعمال کی اور فرمایا کہ یہ حقیقی تصوف میں ایک مقام ہے اور چاہیئے کہ سالک اس مقام سے نکل آئے کیونکہ اگر وہ اس مقام پر پھنس کر رہ جائے تو وہ راستہ بھول جائے گا اور بھٹک جائے گا۔ اسلامی تصوف میں دنیا کی زندگی آخرت کا توشہ ہے۔ یہ زندگی بیکار نہیں ہے دنیا حقیقی ہے''۔

(میاں سید رسول رسا ''مقدمہ ارمغان خوشحال'')

معلوم ہوا کہ اسلامی تصوف میں دنیا کو چھوڑنا یا اس سے منہ موڑنا منع ہے۔ مسلمان اپنی دنیاوی زندگی اسلام کے اصولوں اور تعلیمات کے مطابق گذارتا ہے اور ہر دم اس کی نظر

اللہ کی ذات پر ہوتی ہے۔ اگر مسلمان دنیاوی کاروبار چھوڑ دے تو اسلامی تصوف کی نظر میں یہ ایک غیر اسلامی قدم ہوگا۔

لیکن شاعری میں حقیقت اور مجاز کے الفاظ کا سرچشمہ تصوف ہے۔ شاعری جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ اور تصوف کی برکت سے ان جذبات میں پاکیزگی اور شدت پیدا ہوتی ہے۔ اور چونکہ تصوف کا خمیر عشق حقیقی یا عشق الٰہی ہے اور عشق حقیقی ایک نہایت ہی پاک جوش اور بڑے مطہر اور مقدس جذبے کا نام ہے کہ یہ جذبہ انسان میں اولیٰ اخلاق اور روحانی زندگی اور آگہی پیدا کرتا ہے۔ اس لئے جب شاعری میں تصوف کا مضمون جاگزیں ہوا تو عشق مجازی کی باتوں میں بھی ایک مزہ پیدا ہوگیا۔ اور عجمی شعر میں بہ حیثیت مجموعی ایک زندہ ادب کی روح دوڑ گئی۔ اور یوں عجم کی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اس لمبی بحث کو سمیٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خوشحال وغالب کی شاعری میں تصوف کا کیا مقام ہے۔ آیئے پہلے خوشحال کی دنیا میں چلیں۔

خوشحال کی شاعری میں تصوف

خوشحال کے زمانے میں پشتو شاعری تصوف کے نام سے آشنا ہوچکی تھی۔ خوشحال خود تو صوفی مشرب انسان نہ تھے۔ مگر ان کے کلام کے مطالعہ سے ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ ان کو تصوف کی باریکیوں کا علم حاصل تھا۔ جن میں سقراط کا نظریہ حسن مطلق بھی شامل ہے۔ جس کے مطابق حسن زندگی کا مقصد بھی ہے اور حاصل بھی۔ اور یہ کہ مرد کامل کی پہچان بھی یہی ہے کہ اس کے قول وفعل میں حسن ہو۔ اس کے تصورات حسین ہوں اور اسے حسن مطلق کا عرفان حاصل ہو۔ ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک حسن مطلق یا حسن ازل اور خوشحال کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:-

"خوشحال نے جب اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ تو اپنے ساتھ ایک حسن بین نظر اور حسن شناس مزاج بھی لائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر نے حسن کے ہر پہلو سے پردہ اٹھایا۔ نباتاتی اور انسانی حسن سے لیکر حسن ازل تک کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر خوشحال نے اپنے جمالیاتی افکار یا تاثرات کا اظہار نہ کیا ہو"

ڈاکٹر صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں:-

"حسن ازل کے متعلق خوشحال کا نظریہ اسلامی تصورات پر مبنی ہے کیونکہ وہ ایک بڑے عالم اور مذہبی انسان تھے۔ اور احکام شریعت کے پابند تھے۔ گو خوشحال حسن ازل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تصوف کا چھوٹا راستہ پسند کرتے ہیں لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ طریقت کا راستہ شریعت کی راہنمائی کے بغیر خطرے سے خالی نہیں۔ اسی لئے خوشحال شریعت کو ایک درخت سے تعبیر کرتے ہیں اور

طریقت کو اس درخت کی شاخ کا درجہ دیتے ہیں'

خوشحال فرماتے ہیں:-

شریعت دونې بیخ دے
طریقت لکه ښاخونه
حقیقت دونې پانې
معرفت میوه گلونه

ترجمہ:- شریعت درخت کی جڑ کے مانند ہے
طریقت اس درخت کی شاخیں
حقیقت اس درخت کے پتے ہیں
معرفت اس درخت کے پھل اور پھول

خوشحال کا پکا عقیدہ ہے کہ یہ دنیا اور اسکے تمام موجودات صرف اللہ نے پیدا کئے ہیں۔ اور کائنات کے ہست و نیست کا اختیار بھی اسی کے ہاتھوں میں ہے۔ اسے نہ آرام کی ضرورت ہے اور نہ ہی نیند کی۔ وہ حیؔ قیوم ہے اور اپنے آپ میں مکمل ہے۔ اسے کائنات کا نظام چلانے کے لئے کسی کی مدد لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تمام تعریفیں اسی کے لیے ہیں:-

کل ثناء په هغه ښائي
چې ثنا ئې هر څوک وائي

ترجمہ:۔ساری تعریفیں اسی کو بجتی ہیں۔جسکی ثناء ہر شخص کہہ رہا ہے۔

(ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک ''خوشحال کا تصور جمال'')

خوشحال میں صوفیانہ تجسس اور سوجھ بوجھ کے تین عوامل نظر آتے ہیں۔سب سے پہلے وہ اپنے اساتذہ حضرت مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور حضرت شاہ اویس صدیقی ملتانی کی صحبت میں رہ کر تصوف کے مضمون سے متعارف ہوئے۔دوسرے ان کو حضرت شیخ رحمکار کاکاخیل سے جو عقیدت تھی۔اسکی وجہ سے اور حضرت شیخ کی صحبت کی وجہ سے تصوف کی طرف خوشحال کا میلان طبع ہونا قدرتی امر تھا۔تیسری وجہ خوشحال کا اپنا وہ علم تھا جو انہوں نے اپنی کوششوں اور مطالعے سے حاصل کیا تھا۔اسطرح وہ تصوف کی باریکیاں جاننے میں کامیاب ہوئے۔

خوشحال کی عشقی اور تصوفی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک کہتے ہیں:۔

''ان اور ایسے ہزاروں اشعار میں خان (خوشحال) بالکل ایک رنگین بیان، حسن و عشق کے داعی شاعر نظر آتے ہیں۔لیکن جب تصوف کی باریکیوں کا بیان کرتے ہیں تو ایک صاحب حال و صاحب معرفت صوفی لگتے ہیں۔اور طریقت وسلوک کے مراحل سے جیسے کہ خود گزر چکے ہوں۔تصوف میں ان کے زیادہ تر اشعار شیخ ابن العربی کے مسلک سے متعلق نظر آتے ہیں۔یعنی خان وحدۃ الوجود کے قائل نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ شہودی وجود پر مبنی نظریات بھی خان کے کلام میں ملتے ہیں۔ شہود کی وحدت کے بارے میں فرماتے

ہیں:-

کــہ مسـجد گـوری کــہ دیـر
واڑہ یــو دے نشتـــہ غیـــر
یو مې بیا موند په هر څه کښې
چــې مــې وکــړه د زړه سیـــر
خوشحال یو وینې خوشحال دے
ورتـــه ورک دے غیـــر و زیـــر

ترجمہ:- مسجد میں دیکھو چاہے دیر میں
سب میں وہی ایک ہے کوئی غیر نہیں
میں نے ہر چیز میں اس واحد کو پایا
جب میں نے اپنے دل کی سیر کی
خوشحال خوش ہے کہ ایک ہی واحد کو دیکھتا ہے
اور غیر و زیر اسکے لیے گم ہیں"

(ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک "رباعیات خوشحال")

پشتو زبان کے مشہور شاعر' ادیب اور تصوف کے علمبردار امیر المعزلین جناب امیر حمزہ شنواری نے خوشحال کے کلام میں تصوف کے بارے میں کئی مقالے لکھے ہیں۔اور خوشحال کے ایک تصوفی شعر سے متاثر ہو کر تو صرف ایک شعر پر پوری کتاب لکھ ڈالی ہے۔اور اس

میں خوشحال کے تصوف پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ جناب امیر حمزہ شنواری اپنے ایک مقالے میں فرماتے ہیں:-

''جب خوشحال بابا نے عقل کی پرواز کے سلسلے میں عقل وآ گہی کو
انسانی روح کے حوالے کردیا تو انکے یقین کی روشنی میں اضافہ ہوا''

خوشحال کا عارفانہ کلام بھی انکی تصوفی شاعری کی ایک کڑی ہے۔ افغانی محقق جناب عبدالحئی حبیبی اس ضمن میں فرماتے ہیں:-

''معرفت کی دنیا میں خوشحال ظاہری حواس اور مادی خواص کے علاوہ ایک دوسری روح اور باطنی حواس میں یقین رکھتے ہیں جن کے ذریعے سے معرفت تک پہنچا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ کہا ہے:-

عارفان د سر پہ سترگو گوتې کېږدي
د خپل زړه پہ سترگو گوري تماشا کا

ترجمہ:- عارف اپنے سر کی آنکھوں پر انگلیاں رکھ کر اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور تماشہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک اپنے تحقیقی مقالہ (اور کتاب) خوشحال اور تصور جمال میں خوشحال کے تصوفی رنگ کو یوں سمیٹتے ہیں:-

''ان حوالوں اور مباحث کے نتیجے میں انسان اس حقیقت تک پہنچتا
ہے کہ خوشحال کا ''حسن ازل'' اور ''نور مطلق'' کے متعلق خیال نہ تو

''ترک دنیا'' کی بنیاد پر ہے اور نہ ہی نفس کو قتل کرنے پر۔ خوشحال نفس کے ساتھ جہاد کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن بے جا نفس کشی کے ذریعے انسانی وجود پر ظلم کرنے کے شدید مخالف ہیں۔ ان کا نظریۂ حسن ازل اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر محکم کھڑا ہے۔ اسی لیے ان کے فکر وفن میں ایک خوبصورت اعتدال نظر آتا ہے ایک ایسا اعتدال جو دین اور دنیا دونوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ ہم جب اس پورے باب پر غور کرتے ہیں تو محسوس کر سکتے ہیں کہ خالق کائنات نے اس بندے (خوشحال) کو کتنی تیز نظر' قوت مشاہدہ اور کتنا زبردست جمالی ذہن دیا ہے۔ ایک ایسا ذہن جس نے بیک وقت زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈال رکھی ہے''

(ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک ''خوشحال کا تصور جمال مابعد الطبیعاتی حسن'')

آخر میں تصوفی رنگ لئے ہوئے خوشحال بابا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

په هر څۀ کښې ننداره د هغه مخ کړم
چې لـه ډيرې پيدايئ نـاپـيـدـ شو

ترجمہ:- ہر شے میں اسی رخ زیبا کا دیدار کرتا ہوں۔ جو کثرت شہود کی وجہ سے نامشہود ہو گیا ہے۔

هر تشنه چې د وحدت په سيند سيراب شه
نــور هـمــه جهــان و دهٔ وتــه سراب شـهٔ

ترجمہ:- جو پیاسا بھی ایک دفعہ دریائے وحدت سے سیراب ہو جائے تو پھر ساری دنیا اس کی نظر میں سراب بن جاتی ہے۔

آخر میں ظاہری اور حقیقی حسن سے متعلق خوشحال کا وہ شعر جو سراولف کیرو اور سر ہو یل کی ''دی پوئمز آف خوشحال خان خٹک'' میں شامل کئے گئے ایک قصیدے میں شامل ہے:-

د ښکلیو د جمال په ننداره کښې ما خدائے بیا موند
لږ نــه دی لـــه مـجـازه حقیـقـت تــه رسیـدلـی

ترجمہ:- حسینوں کے جمال کے نظارے میں، میں نے خدا کو پالیا۔ اور یوں مجاز سے حقیقت تک پہنچنے والے کچھ کم نہیں ہیں۔

سراولف کیرو اور سر ہو یل کی کتاب میں اس شعر کا انگریزی میں ترجمہ یوں کیا گیا ہے:-

"For me fair forms reveal, Such ecstasy I feel, I Swoon my senses real, Before all loveliness, All sense transcended in the form I see, Semblance that merges in Reality."

غالب کی شاعری میں تصوف

غالب کے مزاج میں فلسفیانہ انداز نظر کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔تا آنکہ قاری ان کے حیات و کائنات کی حقیقت، مادہ، روح اور سب سے بڑھ کر خدا کی ہستی سے متعلق خیالات کا مطالعہ کرتے کرتے ایک ایسی سرحد پر آ کھڑا ہوتا ہے جس کے ایک طرف فلسفہ کا علاقہ ہے تو دوسری طرف تصوف کی پر پیچ وادی۔ کیا غالب نے خود بھی یہ سرحد پار کی۔ کیا انہوں نے تصوف کی وادی میں قدم رکھا اور اگر رکھا تو اسکی نوعیت کیا تھی۔ کیا غالب صوفی تھے۔ یہی وہ سب سوالات ہیں جن کے جوابات قاری کو چاہئیں اور ان سوالات کے تسلی بخش جوابات ڈھونڈ نا ہماری آج کی نشست کا مقصد ہے۔ آیئے سب سے پہلے اردو ادب میں تصوف کے مقام کو جانیں:۔

''تصوف نفی ذات اور نفی کائنات پر زور دیتا ہے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس کا نفی کا تصور اثبات سے پیدا ہوا ہے۔صوفی ایک وجود واحد کو ماننے کے بعد ہی نفی ذات و نفی کائنات کی تلقین کرتا ہے اور اسی وجود واحد میں اپنے آپ کو ضم کردینے کے لیے اس کے تصورات میں جوش و انبساط کی ایک زبردست کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہ بات

بھی غور طلب ہے کہ قدیم زمانہ میں جب سماجی اور اخلاقی قدریں متزلزل ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں تو اکثر صوفیوں اور بھگتوں ہی کی زندگی اور تعلیم میں انسان دوستی کا سراغ ملتا ہے۔ ایسے حالات میں تصوف ایک ذہنی بغاوت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے''

(ابو محمد سحر ''غالب کا فلسفہ'')

اب اردو ادب میں حسن کے زاویئے سے بھی تصوف کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اردو غزل کے بارے میں فراق گورکھپوری نے کیا کہا تھا۔ پروفیسر افضل حسین اظہر بتاتے ہیں:-

''شاعری زندگی کے ہر منظر میں ایک ماورائی یا روحانی لامحدود ماہیئت کا احساس کرتی ہے۔ اور اسی کو جمالیات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر شے بیک وقت لطیف بھی ہے' کثیف بھی' موجود بھی' معدوم بھی' محدود بھی ہے۔ لامحدود بھی' کثرت کی مثال بھی ہے اور وحدت کی بھی' الغرض قضائے عام ایک ماورائے عالم حقیقت ضرور پائی جاتی ہے اور شاعر کا مذہب اسی عالمگیر حقیقت کا احساس ہے''

آگے لکھتے ہیں:-

''تصوف کا مرکزی اصول' وحدت الوجود یا حقیقت کا زمان و مکان و سبب و علت سے معرا ہونا ہے۔ حسن کا تصور آپ محدود طریقے پر کر ہی نہیں سکتے' کیونکہ یہاں مقداری تصور کا گذر ہی نہیں۔ کتنا اور

کسقدر کا مفہوم ہم حسن سے متعلق نہیں کر سکتے۔ حسن کا تیز احساس ہمیں لامحدود کی طرف لے جاتا ہے۔ جتنا یہ احساس تیز ہوگا اتنا ہی حسن ہمہ گیر ہوگا"

(پروفیسر افضل حسین اظہر "غالب و اقبال کی ہم آہنگی")

اس مقام پر نیاز فتح پوری ہماری مدد کو پہنچتے ہیں:-

"دراصل غالب کا تصوف اور فلسفہ ایک مستعار چیز تھا اور غالب نے اسے غالباً اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ "برائے شعر گفتن خوب است" یا یہ کہ اس زمانہ کے محافل شعر و سخن میں اس چیز کی مانگ تھی اور غالب کے لیے ضروری تھا کہ ان مجالس میں درخور پانے کے لیے وہ اس رنگ کے اشعار بھی کہتے"

نیاز فتح پوری آگے فرماتے ہیں:-

"اس سلسلہ میں پھر غالب کی وہی کہی ہوئی بات سامنے آ جاتی ہے "فارسی بین تا بینی نقش ہائے رنگ رنگ" اور اس میں شک نہیں کہ اس نقش ہائے رنگ رنگ میں اس کا نقش تصوف بھی بڑا دلکش، بڑا جمیل اور بڑا عظیم نظر آتا ہے۔ فارسی کلیات میں پہلا شعر حمد ہی ملاحظہ فرمایئے:-

اے بہ خلاء و ملا' خوئے تو ہنگامہ زا
با ہمہ درگفتگو بے ہمہ در ماجرا

تمام دوسرے صوفی شعراء کی طرح غالب نے بھی اس خدا کی وحدت وجود ہی کا ذکر کیا ہے لیکن الفاظ کے انتخاب ان کی نشت 'لب ولہجہ' کی متانت اور اسی کے ساتھ آفاقی قسم کی تیز یہی آہنگ نے خدا کی شوکت وجبروت اور عظمت وجلال کا اظہار جس انداز سے کیا ہے اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے''

(نیاز فتح پوری ''ولی بادہ خوار'')

ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کی شاعری میں فلسفہ' معینہ اقدار و تصورات' کائنات' مادہ' روح' فنا' عقیدہ وحدت الوجود' حسن کا احساس' حسن مطلق' حکیمانہ' مزاج' فکر وجذبہ' عشقیہ جذبات' استدلالی انداز بیاں' تشکک' نکتہ آفرینی' رمز بلیغ' مخصوص تراکیب' تخیل تصور ارتقاء' بنیادی عناصر کا کام دیتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری نے ان عناصر کو اپنے مقالہ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان عناصر پر ایک اچٹتی نظر ڈالیں [illegible] سے چند عناصر دوسرے عناصر کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ ہم اپنے مقصد کے دائرے کے اند رہتے ہوئے وحدت الوجود اور تشکک کو لیتے ہیں۔ وحدت الوجود [illegible] لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے اللہ کی ذات کو واحد مانے اور اس میں شک نہ کرے۔ لیکن غالب کی شاعری میں تشکک کا جو عنصر در آیا ہے۔ اس سے اسکے نظریہ تصوف کو کہیں نہ کہیں زک

ضرور پہنچتی ہے مزید برآں:-

''وحدت الوجود کی اصل روح اور آخری غایت تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن ہے۔ غالب نے اسے اپنی عملی زندگی میں نہیں برتا تھا۔ پھر یہ عقیدہ ان کے ذہن میں اتنا جاگزیں کیسے ہوا؟ کیا یہ محض روایت پرستی کا نتیجہ تھا تو اس کے شاعرانہ اظہار میں اتنا تواتر' اور اتنی جان نہ ہوتی۔ احتشام حسین صاحب کا خیال بڑی حد تک صحت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ ''وحدت الوجود کی طرف غالب کا میلان مسائل حیات کو سمجھنے اور مذہب کی ظاہر داریوں سے بچ نکلنے کا ایک بہانہ تھا۔ غالب جس سماج کے فرد تھے اس سماج میں باغیانہ میلان اور آزادی کا جذبہ داخلی طور پر تصوف ہی میں نمایاں ہو سکتا تھا''

فلاطیس کے نظریۂ کے بموجب روح اعظم کو جب یہ منظور ہوا کہ اپنی صورت کا مشاہدہ کرے تو کائنات وجود میں آ گئی اور ماسوا کا ظہور ہو گیا۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

(اسلوب احمد انصاری ''غالب کی شاعری کے چند بنیادی عناصر'')

گوہر مقصود اب بھی ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔ ابھی ہمیں کچھ اور آگے بڑھنا ہے۔ کیا ایسا تو

نہیں کہ وحدت الوجود کا عقیدہ غالب کے دل میں بہت گہرا ہوا۔ اس حد تک کہ انہوں نے احتیاط نہیں کی اور بھٹک گئے۔ کہ یہ راستہ وادئ حیرت میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ غالب کے ان اشعار سے ہمیں ان کے نظریۂ وحدت الوجود یا انکے تصوف کو جاننے میں کوئی مدد ملتی ہے؟

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
کثرت آرائی وحدت ہے پرستارئ وہم
کر دیا کافر اس اصنام خیالی نے مجھے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرزا غالب کے یہاں بیدل کے انداز میں ان مضامین کی بازگشت ملتی ہے۔ جو وحدت وجودی کے صوفیانہ مسلک سے بیدل اور دوسرے شعراء نے متاثر ہو کر اپنائے۔ چونکہ بیدل اور ان دوسرے اردو فارسی کے شعراء نے تصوف سے اپنی اپنی دکان سجائی ہے۔ اس لیے غالب نے بھی تقلیداً ایسا ہی کیا ورنہ کہاں غالب اور کہاں تصوف۔ لیکن جی نہیں مانتا، غالب کو تصوف سے کوئی نہ کوئی علاقہ ضرور ہے ورنہ وہ یہ شعر کیوں اور کیسے کہتے:۔

سراغ وحدت ذاتش تواں ز کثرت جُست
کہ سائر ست در اعداد بے شمار یکے

ایسا بھی تو ممکن ہے کہ غالب کی تصوفی شاعری کی جڑیں انکے اپنے زمانے اور اپنی تہذیب

اور بدلے ہوئے عمرانی حالات میں پیوست ہوں:-

''ایک طرف اسلامی تصوف کی وہ روایت تھی جس نے اردو شاعری کی فکر کو پروان چڑھایا ہے اور جس کے نشوونما میں اگر ایک طرف نو افلاطونی فلسفے، ایرانی اثرات اور ہندو یوگیوں کے رابطوں کا حصہ رہا ہے تو دوسری طرف اسلامی فکر کے مختلف عناصر خصوصاً معتزلہ فرقہ اور اس کی استدلال نے بھی کافی مدد بہم پہنچائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی تصوف اس دور کا غالب فلسفہ تھا۔ اور اردو شاعری نہ صرف نفس مضمون کے اعتبار سے بلکہ علامتوں، اشاروں، اسالیب بیان حتیٰ کہ تشبیہہ و استعارہ کے سارے ذخیرے، تصوف ہی کے مرہون منت ہیں۔

پھر یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ غالب عملاً صوفی نہ تھے۔ عقائد کے اعتبار سے جہاں وہ صوفیا کے بہت سے مروجہ عقائد کو مانتے تھے۔ وہاں نہ تو وہ ان کی راہ سلوک پر پوری طرح ایمان لاتے تھے۔ اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی نیا فلسفہ فکر پیش کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تصوف کو برائے شعر گفتن خوب است کا درجہ حاصل رہا''

(ڈاکٹر محمد حسن ''غالب کے چند اہم نقاد'')

کہتے ہیں کہ صوفی تو خدا کی ذات میں اتنا محو ہوتا ہے کہ اسکے سوا اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا اور

اس سے لا انتہا محبت کرتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں یہی کلیہ کسی خاص حد تک غالب کی زندگی اور انکی دنیاوی اور مذہبی روش پر آزمانا ہوگا۔ آیئے انکی زندگی میں جھانکیں:-

"غالب کے کلام کا اگر ہم غور سے مطالعہ کریں اور اس کے دائروں تک ہماری نگاہ جاسکے تو یہ بات آسانی سے سمجھ آسکتی ہے کہ ماضی کے افکار و خیالات کے علاوہ غالب کے ذہن پر خود اپنے ذاتی مسائل کا بھی اثر پڑا تھا۔ زمانے کے مروجہ نظام معاشرت میں زندگی گذارنے کے لیے اور زمانے میں اپنے آپ کو پیش کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے غالب کو جو کچھ کے سہنے پڑے ان کی تفصیل بڑی لمبی ہے۔ لیکن اس کے نتائج کو آپ دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے ان کے یہاں تلخی' شکست خوردگی' طنز' تشکک' تنہائی کا احساس' انانیت اور مردم بیزاری پیدا ہوگئی تھی۔ سماج کے مروجہ قوانین اور رسوم سے وہ بے زار تھے ہی۔ ناکامیوں اور ناامیدیوں نے انہیں "خدا" کے متعلق بھی شبہے میں ڈال دیا تھا۔ رشید احمد صدیقی کا کہنا صحیح ہے کہ اردو شاعری میں غالب پہلے آدمی ہیں جنہوں نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے اور خدا ہی کیا وہ تو خدا کی بنائی ہوئی جنت' اس کے فرشتوں' اس کے دیر و حرم اور اس کی پیدا کی ہوئی دنیا کی ہر شے سے بیزار ہو گئے تھے۔ ان سے لڑتے تھے۔ ان

پر استہزاء کرتے تھے۔ ہار کر مایوس ہوتے تھے اور ان پر فتح یاب ہونے کے لیے اپنے آپ کو زندہ رہنے کے لیے آمادہ بھی کرتے تھے۔ ان نقوش کو کہیں کہیں سے اُلٹ پلٹ کر دیکھیے:

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا کچھ اور بھی ہم پر ستم ہوئے
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
زندگی اپنی جو اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے"

(خلیل الرحمان اعظمی ''غالب اور عصر جدید'')

خدا پر طنز کرنے والا اور مردم بیزار شخص کیونکر تصوف کا دم بھر سکتا ہے۔ لیکن ٹھہر یئے کچھ ہے جو ہمیں اکساتا ہے۔ کہ غالب کو تصوف کے رموز سے ضرور کوئی سروکار رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ غالب کی غزلوں میں عینیت اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ہستی کو فریب سمجھ کر مادہ کے وجود سے قطعی انکار عینیت کا انتہا پسند نظریہ ہے:-

''عینیت سے قدرتی طور پر دو شاخیں پھوٹتی ہیں۔ مابعد الطبیعات اور مثالیت، مادہ سے ماوراء روح اور اس سے متعلق ایک پوری کائنات کا تصور اور پھر اس سے متعلق پیچ در پیچ بحثیں ہزار سال سے فلسفے کا اہم جز

رہی ہیں۔ غالب کے زمانے میں مہذب سماج کا مرغوب روحانی فلسفہ تصوف تھا۔ اور شاعروں میں تو اسے اور بھی زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ کیونکہ اس کے بارے میں "برائے شعر گفتن خوب است" کہا گیا تھا۔ پھر ہماری شاعری کو اس سے ایک بڑی حد تک فطری اور روایتی تعلق بھی تھا۔ اس لئے غالب کی شاعری اس سے بے نیاز کیسے رہ سکتی تھی؟ ظاہر ہے کہ تصوف کے متعلق ان کی معلومات بہت اچھی تھیں۔ ان کی شاعری میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں جہاں تصوف کے مختلف مقامات اور مسائل کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ تو کہیئے خیر ہوئی بادہ خواری نے بچالیا ورنہ اچھے خاصے انسان سے ولی بن جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی" -

(راجندر ناتھ شیدا "غالب کا شعور۔۔۔ایک مطالعہ")

اوپر جو کچھ گذرا اسکے علاوہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اپنے مقالہ "غالب اور نفسیاتی کشمکش" میں چند نکات اٹھائے ہیں جو غالب اور تصوف کے سلسلہ میں ہمارے ممد ثابت ہو سکتے ہیں:-

(الف) بظاہر کثرت و وحدت دو جدا جدا اور متضاد حقیقتیں نظر آتی ہیں لیکن اگر بتایا جائے کہ کثرت دھوکہ ہے یا وحدت ہی کے رنگ برنگ ظہور کا نام ہے تو اس انکشاف سے تھوڑی دیر کے لیے تحیر پیدا

ہو جائے گا۔ خصوصاً جب کہ تخیل نازک اور انداز بیان نادر ہو۔۔۔

اس لیے غالب نے بھی اس ترانے کو چھیڑا۔

(ب) ڈاکٹر صدیقی آگے چلکر یہ نکتہ سامنے لاتے ہیں کہ ڈاکٹر خورشید الاسلام کے مطابق

"غالب کا تصوف مابعد الطبیعات' اخلاق اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر محیط نہیں ہے۔ ان کا تصوف تزکیۂ نفس یا دوسرے کی تلقین کے لیے کم اور اپنے تحفظ کے لیے زیادہ ہے"

(ج) غالب نے اپنی فارسیت کو جلا دینے کے لیے تصوف کا سہارا لیا۔

(د) غالب کا تصوف ایک دلچسپ چیز ہے۔ اس نے خود یہ اشارہ کیا ہے کہ اس نے تصوف کو تفنن طبع' کے لیے لگا رکھا تھا" ظاہر ہے کہ یہ قول یا تو غالب کی زندہ دلی پر دلالت کرتا ہے یا انکساری پر۔ اس لیے کہ غالب کے کلام میں بعض ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا کہنے والا صرف ایسا شخص ہو سکتا ہے جو تصوف کے رموز سے آشنا ہو:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

ان کے علاوہ ایک اور بات جو ڈاکٹر صدیقی سامنے لائے ہیں۔ وہ یہ کہ شیعہ مسلک یا عقائد کے ساتھ تصوف کا تال میل ممکن نہیں۔ دوسری طرف غالب کے خطوط میں واضح طور پر انکے اہل تشیع ہونے کے اشارے ملتے ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اس مسئلہ کو ہمارے لیے یوں سمیٹتے ہیں:-

''ان مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا کہ مرزا مدتوں ایک ذہنی کشمکش کا شکار رہے۔ ان کا متصوفانہ رجحان نفی خودی کی دعوت دیتا ہے اور ان کی فطری انانیت ہر بار ابھر کر ان کو اثبات خودی کی دعوت دیتی تھی۔ بالآخر ان کے صوفیانہ پندار نے ان کی انانیت سے شکست کھائی۔ ممکن ہے اس کے بعد بھی ان کے ساز سے صوفیانہ نغمے کبھی کبھی نکلے ہوں مگر ان افکار کو حقیقی نہیں کہہ سکتے ہیں''

(ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ''غالب اور نفسیاتی کشمکش'')

تصوف کے ساتھ غالب کا رشتہ کچھ بھی رہا ہو۔ وہ تصوف کے رموز سے بہر حال واقف تھے۔ اور اسکے نتیجے میں کافی گہرے تصوفی اشعار سامنے آئے ہیں آئیں ان سے خط اُٹھائیں:-

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

فنا کو سونپ کر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ہے وہی بدمستئ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا
جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

آں راز کہ در سینہ نہاں ست نہ وعظ ست
بر دار تواں گفت و بہ منبر نہ تواں گفت

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ ، بداں آستاں رسد

خوشحال وغالب کی فارسی شاعری

غالب کی فارسی شاعری

برعظیم میں فارسی شاعری کا سلسلہ سعود سعید سلیمان سے شروع ہوا اور خسرو، نظیری، ظہوری، عرفی، فیضی، بیدل اور غالب سے ہوتا ہوا اقبال پر آ کر ختم ہوا۔ آیئے ہم غالب کی فارسی شاعری کا جائزہ لیں۔ غالب نے اپنے فارسی کلام کو اردو کلام سے ہمیشہ بہتر جانا اور فرمایا کہ:-

فارسی بیں تابہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگور از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اسکی وجہ جاننے کے لیے ہمیں جناب شہرت بخاری کی یہ تحریر پڑھنی ہوگی:-

"مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب کو فارسی شاعری سے شغف کی وجوہات کیا تھیں۔ جبکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس (فارسی) کا آفتاب غروب ہوا چاہتا ہے۔۔۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نسلی برتری کا احساس اس معاملے میں سب سے پہلے اس کا رہبر ہوا۔ ایرانی اور ترک

ہونے پر اس کا فخر غرور کی حدوں میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ امیر خسرو اور بیدل کو بمشکل مانتا تھا۔ ایک اور وجہ وہ شکست ہے جو ابتداء میں اس کو اپنی اردو شاعری کے سلسلے میں کھانی پڑی۔ دراصل وہ جس طرز کی شاعری کر رہا تھا یعنی تقلید ظہوری و بیدل وہ اردو کے لیے بالکل غریب تھی۔ اس زمانے میں ادھر ناسخ ادھر شاہ نصیر اور ذوق کے ترانے فضا میں رچے ہوئے تھے لوگ

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

کی طرف کس طرح متوجہ ہوتے۔۔۔ اس نے محسوس کیا کہ میرا یہ میدان نہیں اور فارسی کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گیا''

(شہرت بخاری ''غالب کی فارسی شاعری'')

ایران میں سعدی و حافظ اور ہندوستان میں سعد سلیمان، خسرو، نظیری، ظہوری، عرفی اور بیدل، غالب سے پہلے فارسی شاعری کے بے بدل استاد گذرے تھے۔ غالب کے فارسی کلام پر یوں تو شیخ علی حزیں، طالب آملی، عرفی شیرازی، ظہوری، انوری، خاقانی اور نظیری کا اثر نظر آتا ہے۔ لیکن جس فارسی شاعر سے غالب سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ مرزا بیدل ہیں۔ جس کے متعلق غالب اپنے ایک اردو شعر میں فرماتے ہیں:-

مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب
عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

غالب کے فارسی کلام کے متعلق یہ اقتباس ملاحظہ ہو :-

"غالب نے اپنے فارسی کلام کو زندگی بھر اپنے اردو کلام پر ترجیح دی۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے فارسی کلام کی ناقدری کا افسوس تھا۔ مگر اصل یہ ہے کہ مرزا فارسی میں کسی نئی طرز کے موجد نہیں ہوئے۔ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے فارسی شاعری کی روایات کو اچھی طرح اپنے اندر سمو لیا تھا اور اس علم کتابی اور اپنی مناسبت طبع کی بدولت وہ نہایت پاکیزہ شعر کہنے لگے تھے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ ان کے ساز میں کوئی پردہ ایسا نہیں ہے جو ان کے پیشرو شعرائے فارسی کے یہاں موجود نہ ہو۔ انہیں فارسی شعر کی تاریخ میں زیادہ سے زیادہ اسالیب کے ایک ماہر کا درجہ مل سکتا ہے لیکن جس مقام پر وہ خود کو فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ دراصل وہ انہیں کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ اکرام نے لکھا ہے کہ ان کا فارسی کلام "ہندوستان کے بہترین فارسی شعراء سے پیچھے نہیں ہے" یہ صحیح ہو سکتا ہے لیکن غالب جو ہند کے فارسی شعراء کو اپنے مقابلے میں ہیچ سمجھتے تھے اکرام کے اس جملے کو اپنی صریح توہین پر محمول کرتے"

(شجاع احمد زیبا "اردو غزل اور غالب")

غالب نے اپنی شاعری کی ابتداء آگرہ میں اپنے فارسی کلام سے کی۔ مگر دلی آکر اردو شاعری کی ابتدا کی جوان کی مشکل پسندی اور فارسیت کی وجہ سے اُس زمانے میں اپنی جگہ نہ بنا سکی۔ اسلئے انہوں نے فارسی شاعری کی طرف توجہ کی۔ ان کا تقریباً تمام فارسی کلام (جو دس ہزار چار سو چوبیس اشعار پر مشتمل ہے) ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۷ء تک یعنی بیس سال کے عرصہ میں لکھا گیا۔ شروع شروع میں مشکل پسندی کی جھلک غالب کی فارسی غزلوں میں بھی جھلکتی رہی۔ مگر فارسی رباعیات، قطعات، مثنویوں اور قصائد میں مشکل پسندی نہ ہونے کے برابر ہے۔ غالب کی ۳۲۵ فارسی غزلوں مین سے ۲۷۶ غزلیں ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۸ء کے درمیان یعنی گیارہ سال میں کہی گئیں۔ اپنے فارسی دیوان کی تعریف یوں کی ہے:۔

غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

غالب نے اپنی فارسی شاعری میں بھی دو تخلص یعنی اسد اور غالب استعمال کئے۔ جہاں تک غالب کی شعری خصوصیات کا تعلق ہے تو انہوں نے غزل کے دامن کو وسعت بخشی۔ دنیا کی ہر بات اور ہر مسئلہ پر غزلیں کہیں۔ یوں غزل کو تنگئی داماں کا گلہ نہ رہا۔

شہرت بخاری کے مطابق غالب نے غزل کو صنف سخن نہ رہنے دیا۔ بلکہ اردو اور فارسی زبان کی تقدیر بنا دیا۔ غزل کو تہذیب کا درجہ دیا۔ اور اس قابل بنایا کہ آج ہمارے بڑے سے بڑے شاعر کو اس سے مفر نہیں۔ مرزا نے اردو اور فارسی غزل کو دلبری اور دلیری دی۔ انہوں نے فارسی شاعری میں خدا کو شدید طنز سے مخاطب کیا:۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردش رطل گراں بگردانیم

داکٹر ابواللیث صدیقی کہتے ہیں:-

''شوخی بیان' ندرت خیال و معنی آفرینی' عالی ظرفی' حسرت و یاس' ذوق و شوق' حرکت و سفر' اندیشۂ منزل' نومیدی جاوید' نازک دماغی' راہ عشق اور درد و فراق کے نادر مضامین کی ایسی مثالیں کلام غالب میں موجود ہیں جو ہندوستان کے فارسی گو شعراء کے یہاں بہت کم ہیں اور جن کی بنیاد پر مرزا بجا طور پر اپنی فارسی شاعری پر ناز کرتے ہیں''

(ڈاکٹر ابواللیث صدیق ''نقشہائے رنگ رنگ'')

آیئے اب غالب کے فارسی کلام کے ان نقشہائے رنگ رنگ کا لطف اٹھائیں:-

مشکل پسندی:-

بوادیٔ کہ در آں خضر را عصاء خفت است
بہ سینہ می سپرم رہ اگرچہ پاخفت است

غبار طرف مزارم بہ پیچ و تابے ہست
ہنوز در رگ اندیشہ اضطرابے ہست

بسان موج می بالم بہ طوفاں
برنگ شعلہ می رقصم در آتش

شیوۂ رندان بے پرواہ خرام از من پُرس
ایں قدر دانم کہ مشکل است آساں زیستن

تصورِغم:-

گر بود مشکل مرنج اے دل کہ کار
چوں رود از دست آساں می رود

شادی و غم ہمہ سَرگشتہ تر از یک دگر اند
روز روشن بوداع شب تار آمد و رفت

وجدانی کیفیت:-

بیا کہ قاعدۂ اسماں بگردانیم
قضا بہ گردش رطل گراں بگردانیم

گل افگنیم و گلابے بہ راہگزر پاشیم
مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

ہوس گیری:-

گہے بہ لا بہ سخن با ادا بیامیزم
گہے بہ بوسہ زباں در دہاں بگردانیم

تکلف برطرف لب تشنۂ بوس و کنار استم
زِ راہم باز چیں دام نوازش ہائے پنہاں را

خودداری وتفاخر:-

بے برگئی من داغ لہذ بردل ساماں
بے مہرئی من زرد کند روئے درم را

شکوہ وپیشنگوئی:-

کوکبم را درعدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

تصوف:-

مقصود ماز دیر و حرم جُز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

سراغ وحدت ذاتش تواں زکثرت جست
کہ سائر ست در اعداد بے شمار یکے

دنیا اور کائنات کی حقیقت:-

جہاں چسیت ' آئینہ آگہی
فضائے نظرگاہ ' وجہہ الٰہی

عالم آئینہ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب

ہر ذرہ محو جلوۂ حسن یگانہ ایست
گوئی طلسم شش جہت آئینہ خانہ ایست

عشق و عقل:-

عشق بے ربطیٔ شیرازہ اجزائے حواس
عقل زنگار رخ آئینہ حسن یقیں

خوشحال کی فارسی شاعری

نگار من غضب آلودہ، من زسادہ دلی
بہ قہر خندوی آگہ، نکشتم از غضبش
گراں بُت راچو محراب است ابرو
من او را سجدہ در محراب بُردہ

خوشحال کے یہ فارسی اشعار کسی بھی ایسے شاعر کے کلام کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں جس کی مادری زبان فارسی ہو اور نام حافظ، سعدی، ظہوری، نظیری، بیدل اور غالب ہو۔ جب ہم غالب کی فارسی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو کھلتا ہے کہ وہ ظہوری، نظیری اور بیدل کی فارسی نظم اور فن شاعری سے متاثر ہوئے مگر خوشحال کے فارسی کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حافظ شیرازی کی طرح جام شراب کو موضوع بناتا ہے اور سعدی کی طرح اپنے دل کے رازوں کو۔ آیئے خوشحال کی فارسی شاعری کی خصوصیات کو جانیں:-

(۱) خوشحال کی مادری زبان فارسی نہیں تھی۔

(۲) خوشحال سے پہلے کوئی پشتون شاعر معلوم نہیں جس کا فارسی کلام دستیاب ہو۔

(۳) فارسی شاعری میں خوشحال نے دو تخلص استعمال کئے۔ خوشحال اور کوہی

(۴) خوشحال کے فارسی کلام میں صرف پچیس غزلیں دستیاب ہیں۔ جن میں لگ بھگ

ڈھائی سواشعار ہیں۔

(۵) خوشحال کا فارسی کلام انکے پشتو کلام کے ضخیم دیوان کا حصہ ہے۔

(۶) خوشحال نے فارسی میں صرف غزل گوئی کی ہے۔جس میں انکی آواز سادہ شیرین اور مترنم ہے۔

(۷) خوشحال نے اپنی فارسی غزلوں میں زیادہ تر چھوٹی بحریں استعمال کی ہیں۔

خوشحال بابا اپنے زمانے اور مغلیہ دربار میں رائج فارسی زبان پر بخوبی حاوی تھے۔اسکے علاوہ ان کا فارسی زبان اور شاعری کا مطالعہ بھی وسیع معلوم ہوتا ہے۔جب ہی تو انکے کلام میں سعدی وحافظ جھلکتے ہیں۔خوشحال کی فارسی ادبیات سے یہ واقفیت پشتو زبان کے لیے سعد ثابت ہوئی۔انہوں نے نہ صرف فارسی میں شاعری کی بلکہ فارسی شاعری کی خصوصیات کو پشتو شاعری میں سمو کر پشتو نظم کو ایک اعلیٰ مقام تک لے گئے اور اس میں وسعت پیدا کی۔

خوشحال کی فارسی غزل میں سعدی وحافظ کے رنگ سخن سے متعلق ڈاکٹر سید پروفیسر مرتضیٰ جعفری نے فرمایا:-

''خوشحال خان بابا کی فارسی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں ایران کا ہمہ گیر فرہنگ وہنر فلسفۂ اخلاق وتصوف اور ان کا ادب اور آرٹ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔خوشحال اپنی فارسی شاعری میں سعدی وحافظ کے شیرین اور مترنم لب ولہجے سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔اس غزل میں شیراز کی شیرینی کا لطف آجاتا

ہے:-

از او دل بر گرفتن کار من نیست
کہ از جاں سر گشتن کار من نیست
مرا گوئی بگو وصف دہانش
چگونم چوں در او جائ سخن نیست
من و سودائی رویت تا کہ ہستم
اگرچہ خود ترا بر رائ من نیست
غمت تاور دل و جانم وطن کرو
مرا ور کوچۂ شادی وطن نیست
مرا خوشحال او پرسی کہ چونی
مگر از چہرہ خالش مبرہن نیست

(ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری ''خوشحال بابا کی فارسی شاعری'')

اب ہم ایک ایسی حقیقت کا اظہار کرنا چاہیں گے جس کی وجہ سے خوشحال کی فارسی شاعری میں ایک ایسی جدت پیدا ہوئی جس نے فارسی شاعری کے دامن کو وسیع تر کر دیا۔ تفصیل اس جدت کی یہ ہے کہ خوشحال نے پشتو قافیے اور ردیفیں اپنے فارسی شعروں میں بڑی خوبصورتی سے استعمال کی ہیں۔ اس سے ان کے فارسی کلام کی ندرت و رعنائی میں اضافہ ہوا ہے۔ ذیل میں خوشحال کے چند ایسے فارسی اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن میں پشتو قافیہ

ردیف استعمال ہوئے ہیں۔ قارئین کی آسانی کے لیے ان پشتو قافیہ اور ردیف کو نہ صرف خط کشیدہ کیا گیا ہے بلکہ انکے سامنے انکے اردو معنی بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔ ان اشعار کو پشتو قافیہ ردیف کے اردو ترجمے کے ساتھ پڑھیے اور ان "سہ آتشہ" اشعار کا خط اٹھائیے:-

بگردکوئے تو کشتن مراد حمادے (میری ہے)
بود کہ روئے تو بینم کہ کعبۂ مادے (میرا ہے)
من ایں جمال ترا کے مثال دریابم
کہ خود خیال تو از مہر وماہ اعلیٰ دے (اعلیٰ ہے)
منم کہ غیر ترا در جہاں نمی یابم
خلاف نیست خبر دار حق تعالیٰ دے (حق تعالیٰ ہے)
نمی شوم متحمل بروز وعدہ وصال
بیا بیا کہ دلم خوار وزار بے تادے (تیرے بغیر ہے)
گماں مبر کہ بگردد ز عشق تو خوشحال
چرا کہ بر رخ خوب تو ڈیر شیدا دے (بہت شیدا ہے)

جب تک کسی شاعر کو دونوں زبانوں پر کامل دسترس حاصل نہ ہو وہ کسی شعر کا ایک مصرع ایک زبان میں اور دوسرا مصرع دوسری زبان میں لکھنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ خوشحال بابا چونکہ پشتو اور فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ اس لیے انہوں ایسی ہی ایک مرصع غزل اپنے دیوان میں چھوڑی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

فارسی مصرعہ:- چہ کنم چہ چارہ سازم

پشتو مصرعہ:- چہ لہ زڑہ مِ شے کنارَ (جب تم میرے دل سے کنارہ کش ہو جاتی ہو)

فارسی مصرعہ:- نکند بہ دل سرایت

پشتو مصرعہ:- کہ زارے کوم بے شمارَ (اگر میں بے شمار منتیں بھی کروں)

فارسی مصرعہ:- اگر از فراق میرم

پشتو مصرعہ:- لا بہ خوبنں شے لہ دے کارَ (تم اس پر اور بھی خوش ہو جاؤ گی)

فارسی مصرعہ:- نرود ز در گئے تو

پشتو مصرعہ:- کہ خوشحال شڑے سل وارَ (اگر تو خوشحال کو سو بار بھی دھتکارے)

آیئے خوشحال بابا کے فارسی کلام میں سے چیدہ چیدہ اشعار پڑھیں:-

مے خوری:-

چشم مخمور تو آخر کار کرد
زاہد صد سالہ رامیخوار کرد
چہ شرابیست ایں کہ روحی را
بہ یکی جرعہ بی خبر کردی

بیمار عشق:-

روئے زرد و آہ سرد و چشم تر
عشق کوہی را چنیں بیمار کرد

روانی وسلاست:-

لبت از آب حیواں آب بردہ
رُخت نور از رخ مہتاب بردہ

سحر انگیزی:-

نہ دانم در دوچشم او چہ جادو ست
کہ از چشمان عاشق خوا ب بردہ

صبر و بے تابی:-

بتاب زلف و پیچا پیچ گیسو
صبوری از دل بیتاب بردہ

طنز:-

نہ تنہا دل ز خوشحال خٹک برد
کہ زہد از دست شیخ و شاب بردہ

اثرات الم:-

اگر روہی ترا در دل الم نیست
چرا از دیدگاں خوں میچکانی

انا:-

پیر فرتوت وضعیفم دیدہ بر خوباں وقت
با منم سلطان وقت و با منم سلطان وقت

گرمیٔ عشق:-

حدیث رومی او بامن بگوئید
بہ بلبل از گل و گلشن بگوئید
نہ آں چشم و نہ آں مژگاں نہ ابروست
بلائے دین و جان و تن بگوئید

وقت کی اہمیت کا احساس:-

آہ و واویلا کہ دیدم بی ثبات و بی بقا
عمر چوں باد بہار و عیش چوں پیان وقت
نالۂ مرغان ایں گلشن بمن معلوم شد
آہ و فریاد و فغاں دارند در بستان وقت

خوشحال و غالب کی فارسی شاعری

موازنہ

جہاں فارسی غالب کی نسلی زبان تھی۔ وہاں خوشحال کی مادری زبان پشتو تھی۔ قدرتی امر ہے کہ اپنی نسلی زبان میں غیر مادری زبان کی نسبت بہتر شاعری کی جاسکتی ہے۔ خوشحال اکثر کہا کرتے کہ فارسی میں مجھ سے بہتر شاعر موجود ہیں لیکن پشتو میں میرا ہمسر کوئی نہیں۔ یاد رہے خوشحال کے پشتو اشعار کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ بایں ہمہ خوشحال نے تاریخ درست رکھنے کے لیے یہ بھی فرمایا:

"میرا قلم فارسی میں بھی گویا اور رواں ہے۔ مگر کیا کروں کہ ہر شخص کو
اپنی مادری زبان پیاری ہوتی ہے"

اور کیوں نہ ہو کیونکہ خوشحال نے اپنی قوم کو جو پیغام دینا چاہا تھا۔ اسکے لیے پشتو زبان ہی سب سے زیادہ موزون تھی۔ لیکن غالب کی بات اور ہے ان کو فارسی زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ اور اردو میں جو کلام کہا وہ انکی فارسی شاعری سے زیادہ مقبول ہوا۔ لیکن اس سے غالب کے فارسی کلام کی عظمت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔

ہم غالب کے فارسی کلام (دس ہزار چار سو چوبیس اشعار) کے مقابلے میں خوشحال کے فارسی کلام (ڈھائی سو اشعار) کو رکھتے ہیں۔ تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ غالب کی فارسی شاعری کا کینوس بہت زیادہ وسیع ہے۔ انہوں نے فارسی میں نہ صرف غزل گوئی کی بلکہ رباعی، مثنوی، قصیدہ اور قطع کے ذیل میں بھی انکے ہزاروں اشعار موجود ہیں۔ دوسری طرف خوشحال کا تمام تر فارسی کلام پچیس غزلوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خوشحال کے اتنے کم تعداد میں فارسی اشعار معیار کے لحاظ سے فارسی کے کسی بھی اچھے شاعر کے کلام کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری کہتے ہیں:-

> ''خوشحال خان خٹک کے ضخیم دیوان میں صرف پچیس فارسی غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن میں اشعار کی مجموعی تعداد ڈھائی سو کے لگ بھگ بنتی ہے۔ لیکن اس قدر کم شعر کہہ کر بھی خان نے فارسی ادب میں اپنے لیے ایک ایسا مقام پیدا کیا جس کی ایرانی ناقد بھی تائید کرتے ہیں''

(پروفیسر ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری ''خوشحال بابا کی فارسی شاعری)

جہاں غالب کی فارسی شاعری میں مشکل پسندی، مسئلہ توحید، تصوف، فلسفہ عشق، حسن پرستی اور حقیقت کو پانے کے لیے سچی تلاش کے جذبے جیسے مضامین پائے جاتے ہیں۔ وہاں خوشحال کی فارسی شاعری میں ایران کا ہمہ گیر فرہنگ و ہنر فلسفہٗ اخلاق و تصوف اور ان کا

ادب اور آرٹ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے دونوں نابغہ شعراء کا لب ولہجہ شیریں اور مترنم ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ جہاں خوشحال نے اپنے فارسی کلام میں حسن و عشق کے مضامین کو زیادہ برتا ہے۔ وہاں غالب کے کلام فارسی میں معنی آفرینی، عالی ظرفی، حسرت، و یاس، ذوق و شوق، حرکت و سفر، اندیشۂ منزل، تولیدئ جاوید، نازک دماغی، راہ عشق اور درد و فراق کے نادر مضامین پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے فارسی کلام میں شوخئ بیاں اور ندرت خیال بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس پر اتنا اضافہ یہ کہ خوشحال نے اپنے محدود فارسی کلام میں بھی فارسی اور پشتو کی آمیزش سے ایک نیا رنگ پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔

خوشحالؔ وغالب

جرأت اظہار اور بے باکی

شاعری کے میدان میں جرأت اظہار اور بے باکی متنوع الفاظ ہیں۔ان کے نتیجے میں حق گوئی' صاف گوئی' رنگین بیانی' بہادری اور غیرت جیسے عناصر سامنے آتے ہیں۔ تو دوسری طرف لب ولہجہ میں تُندی' تیزی' یقین' توانائی اور بے نیازی کا ظہور ہوتا ہے۔ بعض اوقات جرات اظہار اور بے باکی جنسی شاعری کو جنم دیتے ہیں۔خوشحال وغالب کے کلام میں جرات اظہار اور بے باکی کا اندازہ لگاتے وقت ہمیں علامہ اقبال کا یہ شعر سامنے رکھنا ہوگا:-

آئین جواں مرداں' حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

خوشحال۔جرات اظہار اور بے باکی

رما ژبہ نۂ دہ اور دہ گذارونہ دتوپک کا
ترجمہ:- میری زبان میں آگ ہے۔بندوق کی طرح وار کرتی ہے۔

خوشحال کا یہ شعر اسکی جرات اظہار پر دلالت کرتا ہے۔ کسی بھی شاعر کے کلام کے لب ولہجہ کو سمجھنے کے لئے اس کے معروضی حالات اور ماحول کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب ہم خوشحال جیسے نابغہ شاعر کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے دماغ کے پچھلے حصہ میں بار بار انکے مغلوں کے ساتھ اچھے اور برے دونوں قسم کے تعلقات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ انکے اپنے خاندانی حالات و تعلقات نے بھی انکی شاعری اور اس شاعری کے لب و لہجہ کو متاثر کیا ہے۔ اس ضمن میں انکی علمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان سب کے علاوہ ایک انسان ہونے کے ناطے خالق نے انکی فطرت میں جو عادات اور لب ولہجہ ودیعت کر دیئے تھے۔ انہیں بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔ جناب فضل حق شیدا نے خوشحال کے ماحول پر یوں نظر ڈالی ہے:-

''پشتو زبان میں کافی بڑے اور مشہور شاعر گذرے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں تنوع' رنگین بیانی' شوخی' مضمون آفرینی' جدت پسندی' عمیق مطالعہ' باریک مشاہدات اور مختلف علوم کے مطالعہ کے حصول کے لحاظ سے جو عظمت خوشحال خان کو حاصل ہے وہ پشتو کے کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ دوسری زبانوں کے بھی بہت کم شعراء اسکے ہمسر ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ اسکی شخصیت باغ و بہار ہے ویسی ہی اس کی شاعری بھی نہایت پہلودار ہے اگر ایک طرف وہ سپاہی' سالار اور سردار ہے جنگجو ہے اور تلوار کا دھنی ہے فتحیاب ہے تو دوسری طرف اسکے کلام میں پازیبوں کی جھنکار [illegible] کی کاٹ [illegible]
سیاسیات' دینیات' دنیاوی معاملات' ذاتی مشکلات' قدرتی آفات' نباتات' پشتون روایات

جمالیات' اخلاقیات' جنسیات' نئی اصطلاحات' نازک احساسات اور دوسرے موضوعات شکار' باز بھنوروں' مورچوں' اور زخموں کا بیان ملتا ہے۔ اسکے کلام کا مطالعہ کرنے والے حیران ہوتے ہیں کہ خوشحال کا دامن کتنا وسیع ہے کہ اس میں یہ سب کچھ سمایا ہوا ہے۔ اسکے ذہن میں کتنی وسعت ہے کہ اس سر چشمے سے بے شمار ندیاں بہہ رہی ہیں۔ اپنے زمانے کا یہ اونچا انسان اور عظیم شاعر مجموعۂ اضداد ہے۔ کہتے ہیں کہ جو شعراء پہاڑی علاقے میں پیدا ہوتے ہیں انکی زبان ترش' لہجہ سخت اور کہنا ناشناہوتا ہے۔

اگر چہ خوشحال کی جائے پیدائش اکوڑہ کے شمال مغربی سمت میں پیرسباک اور نوشہرہ کے درمیان واقع پہاڑیوں میں ہے۔ اسکے جنوب میں خٹکوں کے پہاڑ ہیں۔ اور خوشحال نے افریدیوں' مہمندوں اور سوات کے پہاڑوں اور دروں پر باز کی مانند پرواز کی ہے مگر اسکی زبان کھڑی اور کرخت نہیں ہے۔ نرم اور لطیف ہے۔ رواں اور شیریں ہے۔ اس میں اگر ایک طرف لنڈے (دریائے کابل) کی خوش رفتاری اور آہستہ خرامی جھلکتی ہے۔ تو دوسری طرف اباسین (دریائے سندھ) کی بے قابو لہروں کا شور سنائی دیتا ہے۔ اسکی زبان کا آہنگ ان دونوں دریاؤں کے سنگم کا مزاج دان ہے۔ وہ ایک طرف خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں' حسن' چمک اور کالی زلفوں کے سائے میں آرام ڈھونڈتا ہے تو دوسری طرف جنگ'

ننگ' تفنگ اور خنجر خوں رنگ کی باتیں کرتا ہے۔ چوڑیوں کی باتیں
اور بیڑیوں کی باتیں بھی''

(فضل حق شیدا''خوشحال کی حماسی شاعری'')

خاندانی وجاہت کا جرات اظہار پر اثر انداز ہونا لازمی امر ہے۔ خوشحال کے باپ دادا اور وہ خود اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ خوشحال نے اپنے کلام میں اپنے والد شہباز خان کو حاتم کی طرح سخی شیر دل' اور رستم سے زیادہ تلوار کا دھنی' شرع پر قایم اور سچا' دادا یحیٰ خان کو سرتا پا یوسف کی طرح خوبصورت اور قد میں اتنا دراز کہ اگر دوسرا شخص گھوڑے پر سوار ہو تو یحیٰ خان اسکے ساتھ پیدل چلتے ہوئے بھی قد و قامت میں برابر ہوتا تھا۔ پردادا ملک اکوڑ کو خاندان کے لیے بڑا مقدم حصہ حاصل کرنے والا کہا ہے۔ خوشحال نے ایک شعر میں اپنے باپ دادا کی میدان جنگ میں شہادت کو یوں اجاگر کیا ہے:-

پلار نیکۂ مې شهیدان و کور ته تللی
پشت په پشت مې هنر دادنے آل په آل

ترجمہ:- میرے والد' دادا اور پردادا شہید ہو کر اپنی قبروں میں دفن ہوئے ہیں۔
پشت در پشت اور آل در آل میرا یہی ہنر ہے۔

بخره ئې د تیغ راکړه په اصل کښې پښتون یم
پلار په نیکۂ نه یم بې دولته بې حشمه

ترجمہ:- قدرت نے میرے حصے میں تلوار لکھی ہے کہ میں اصل سے پشتون ہوں۔ میں

اپنے باپ دادا کی طرف سے بھی بے دولت اور بے حشم نہیں ہوں۔

محترمہ چاند بی بی سلطانہ حیدرآباد سندھ سے خوشحال خان خٹک کی تین سو سالہ برسی کے موقع پر پشاور تشریف لائیں۔ اور اباسین آرٹس کونسل کے زیر اہتمام قومی مجلس مذاکرہ (۲۹ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء) میں اپنا پرخیال مقالہ پیش کیا۔ اس مقالہ سے ایک حسب حال اقتباس ملاحظہ ہو:-

> ''خوشحال کا قلم آتش نوا تھا۔ اس نے واقعات' حقائق اور تجربات کو بڑی صداقت اور جوش کے ساتھ شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثنویاں بھی لیکن غزل میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ غرض یہ کہ ان کی نظم ہو یا غزل وہ ہر مقام پر ایک غیرت مند انسان نظر آتے ہیں''

(چاند بی بی سلطانہ'' خوشحال۔ ایک شاعر غیر تمند'')

شاعر کی زندگی کے تجربات اسکی شاعری کی اساس بنتے ہیں۔ تعبیری شاعری کو جنم دیتے ہیں۔ بلکہ میں تو اسے تعمیری شاعری کے زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ ہم خوشحال کی شاعری کو اس لیے تعبیری شاعری سمجھتے ہیں کہ اس میں اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ اپنی قوم کے تناظر میں دیکھئے تو خوشحال کی پوری شاعری کا مقصد کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ ایسی شاعری میں لذت و آزار' مسرت و غم اور وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جو زندگی سے وابستہ ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللطیف جس قدر شاعر کی زندگی کے تجربات وسیع اور مختلف النوع ہونگے

اسی قدر ان کے مجموعی معانی کی ہم آہنگی بڑی ہوتی جائے گی۔ اور اسی قدر اسکی شاعری بھی بڑے درجے کی ہوگی۔

خوشحال بابا کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ گفتار اور کردار دونوں کے غازی تھے۔ جہاں تک بے باکی کا تعلق ہے تو صرف گفتار میں بھی بے باکی آ سکتی ہے۔ مگر کردار یا عمل میں بے باکی "چیزے دگر است" ایسا کرنے کے لیے شیر کا دل چاہیے۔ روخان یوسفزے یہی بات ان الفاظ میں کہتے ہیں:-

> "محترم قلندر صاحب نے اوپر جو کچھ فرمایا ہے اسکی موافقت اور تناظر میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ معلوم ادبی تاریخ میں اکیلے خوشحال بابا وہ شاعر اور نابغہ ہیں جنہوں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ اور جو کچھ کیا تو بعد میں وہ کہا بھی ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے کسی قسم کا سیاسی، سماجی اور مذہبی دباؤ، مصلحت یا کسی اور جوڑ توڑ کی پرواہ نہیں کی اور بڑی بہادری اور مردانگی کے ساتھ ایسی باتوں اور حقیقتوں کا اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے۔ ایسی باتیں اور حقیقتیں کہ جن کا اظہار انکے دور میں تو کیا آج بھی ہماری تہذیب میں کرنا ایک جرم عظیم گردانا جاتا ہے۔ پر یہ صرف ایک خوشحال ہی تھا جس نے کسی کی پرواہ نہیں کی کیونکہ:-

دروغ وئیل ھغـہ کـا چې ئې ویرہ وی لا طمع
خوشحال پہ دا ار نۂ دے حق بہ وائی څو ئې سر شتہ

ترجمہ:- جھوٹ تو وہ شخص بولتا ہے جسے کوئی ڈر یا طمع ہو۔خوشحال کے لیے ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔جب تک اس کا سر باقی ہے وہ حق بات کہتا رہے گا۔

اور اسی دعویٰ اور دلیل کی بنیاد پر ہم خوشحال کو گفتار اور کردار کا حامل شاعر کہتے ہیں'' (روخان یوسفزے ''گفتار اور کردار کا شاعر'')

بدی کو دنیا کی تمام اقوام نے برا جانا ہے۔اور نیکی کو اچھا۔اسلام ہمیں بدی کو ہاتھوں سے روکنے یا زبان سے روکنے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل میں اسے برا جاننے کی تلقین کرتا ہے۔مگر خوشحال ان سب سے ایک قدم اور آگے جاتے ہوئے فرماتے ہیں:-

وبـــال ئـــې تـــول زمـــا پـــہ غـــارہ
فتـوۓ دعـدل دہ څـو چې بـدان وژنـې

ترجمہ:- (بے شک) جتنے بروں کو مار سکو مارو۔ایسا کرنے کا سارا وبال میری گردن پر کیونکہ یہ عدل کا فتوےٰ ہے۔

خوشحال نے مغلوں کی قید کے دوران رنتھمبور (جے پور) کے بندی خانے میں وطن کی یاد میں ایک شعر کہا ہے:-

پـښـتـنـې جـونـہ د زلـفې بـاد تـہ نیسی
چې شمال ئې بوئی راوړی رتنهبور کښې

اس شعر کی نوعیت سہ پہلو ہے۔اس کے کہنے سے ایک تو یہ مقصود ہے کہ شاعر اپنے وطن سے ہزاروں میل دور دیارِ غیر میں محبوس ہے۔دوسرا تاثر جو شاعر اس شعر سے دینا چاہتا ہے وہ حب وطن کا ہے۔لیکن ایک تیسری بات اس شعر کے باطن میں چھپی ہوئی وہ بے باکی ہے جو خوشحال ہی کا حصہ تھا۔آج سے لگ بھگ ساڑھے تین صدیاں پہلے اس بندۂ خدا خوشحال میں اتنی ہمت تھی کہ وہ ایسے نامساعد حالات میں بھی اپنے وطن کی حسیناؤں کو کہتا ہے کہ اپنی زلفیں کھول کر کھڑی ہو جاؤ تاکہ بادِ شمال تمہاری زلفوں کی خوشبو تمھبور اڑا لائے۔

خوشحال جب مغلوں کی پانچ سالہ قید ونظر بندی سے آزاد ہو کر اپنے وطن لوٹا تو اسکی زندگی میں دو بڑی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں۔اس نے نہ صرف مغلوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کہ مغل سلطنت بہرحال ایک غیر ملکی اور بیرونی طاقت نے قائم کی ہوئی تھی بلکہ اسکی اپنی اولاد اور دوسرے رشتہ دار (چچا وغیرہ) مغلوں کے ساتھ مل کر خوشحال کی مخالفت پر اتر آئے تھے۔خوشحال نے اپنے ناخلف بیٹے بہرام اور اسکی ماں کے متعلق خصوصاً اور دوسرے بیٹوں کے خلاف عموماً جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف تاریخ کا حصہ ہے بلکہ خوشحال کی بے باکی اور حق گوئی پر بھی دلالت ہے۔آیئے دیکھیں کہ خوشحال نے اپنے ناخلف بیٹے بہرام کے متعلق کیا کچھ کہا ہے جناب ایوب صابر مرحوم نے اس قبیل کے اشعار کا یوں ترجمہ کیا ہے:-

''یہ اچھا ہے کہ ایک حاملہ کے بطن سے سانپ پیدا ہو جائے نہ یہ کہ کوئی ناہموار بیٹا پیدا ہو''

''صد لعنت ہے اس بطن پر جس سے بہرام جیسے پوت پیدا ہوں''

''نالائق بیٹا ماں کے پیٹ سے پیدا نہ ہو۔ اس سے بہتر ہے کہ اس کے بطن سے خنزیر پیدا ہو''

''وہ شخص ایک لمحے کے لیے بھی عذاب سے محفوظ نہ ہوگا جس کے لیے اپنا بیٹا دوزخ بن جائے''

''ناخلف اولاد کسی کی بھی بڑی نہ ہو کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ قسم قسم کے فساد کرتی ہے''

''اکوڑ خان' یحیٰی خان اور شہباز خان سب سونا تھے۔ ان سب نے اپنے ادوار بڑی شان سے گذارے۔ اب جبکہ بہرام خان کی باری آئی ہے تو خود دیکھ لو اس نے ان نامداروں کی مٹی کس طرح پلید کر دی ہے''

''اے بہرام' تمہیں سرداری کا ہنر نہیں آتا۔ تم نے اپنے دور میں سردار کو بدنام کر دیا ہے''

''جو دیکھو تو یہ بھی تعجب کی جا ہے کہ بہرام لشکر کشی کر رہا ہے۔ اولوالعزم خوشحال خان پر''

''میرا یہ ایک عیب میری سو خوبیوں پر بھاری ہے کہ بہرام میرا بیٹا ہے اور میں اس کا باپ ہوں''

''اچھا فرزند باپ کے گھر کی روشنی ہوتا ہے اور بُرا فرزند ظلمت ہوتا ہے۔ جب ایسے کتے اس سے پیدا ہوئے ہیں تو مجھے شک گزرتا ہے کہ خوشحال کب انسان تھا''

(ایوب صابر ''خوشحال خان خٹک کا المیہ'')

یہی نہیں خوشحال خان کی بے باکی نے اپنے ناخلف بیٹے بہرام کی ماں کو بھی بہرام کے پیدا

کرنے پر مورد الزام ٹھہرایا۔ خوشحال کا کہنا تھا کہ ایک بدذات اور چھوٹے خاندان کی عورت بدذات اور کمینی اولاد کو جنم دیتی ہے۔

خوشحال نے جرات اظہار اور بے باکی کے سلسلے میں اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا:-

کہ ما زدہ وے چې د زویو هسې کار دے
ما بہ زنا کاوہ نہ کور د کور روزگار

ترجمہ:- اگر مجھے (ان) بیٹوں کے کرتوت پہلے سے معلوم ہوجاتے تو میں زنا کرلیتا مگر گھر گھرہست کے دھندے میں کبھی نہ پڑتا''

خوشحال حق گوئی میں اپنی مثال آپ ہے۔ زندگی میں اسے جن لوگوں سے واسطہ پڑا۔ ان کا خوشحال نے بغور مطالعہ کیا۔ اور جب ان کے متعلق اسے سب حقائق معلوم ہوگئے تب اس نے ہر ایک کو اپنی حق گوئی کے ذریعے آڑے ہاتھوں لیا۔ چاہے وہ مغل تھے۔ یوسفزئی تھے مہمند تھے افریدی تھے حتیٰ کہ اپنے قبیلے خٹک کو بھی خوب لتاڑا ہے۔ اپنے کلام میں ایک موقعہ پر پوری افغان قوم کی خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔ یوں خوشحال خان نے حق گو ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو شاعر افغان شناس بھی ثابت کردیا:-

''اس پہاڑی ملک میں اگر آج کوئی اچھے پشتون کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں تو وہ مہمند، بنگش اور کرزئی اور آفریدی ہیں۔

مہمندوں کے کتے بنگش لوگوں سے بہتر ہیں
اگرچہ مہمند کتوں سے ہزار گنا بدتر ہیں

اور کزئی چوہڑے ہیں آفریدیوں کے
گو کہ افریدی خود سب کے سب چوہڑے ہیں
یہ سب پختونخوا کے اچھوں میں شمار ہوتے ہیں
تو جو بُرے ہیں انہیں کون انسان کہے گا
زندہ پشتونوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے
جو اچھے تھے وہ گور کے نیچے دبے ہوئے ہیں"

اپنے اہل قبیلہ (خٹکوں) کو یوں سخت وست کہا ہے:-

"خٹکوں کے کتے بہتر ہیں یوسفزیوں سے
اگر چہ خود خٹک اپنی عادات میں کتے کی طرح بیکار ہیں
ہزاروں خٹکوں نے میرے سامنے لاف زنی کی تھی آج ایک بھی نہیں ہے
کسی بھی دوسرے کی دوستی خٹکوں سے بہتر ہے۔
اے خوشحال ہر اس شخص سے یاری اور مروت کے آرزومند نہ ہونا
جس نے دریائے اٹک کا پانی پیا ہو
خٹک لوگوں کی دوستی سے توبہ ہے توبہ
کیونکہ ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو میرا دل رکھ سکے
میرا دل خٹکوں سے اتنا ناخوش ہے
کہ پوری خٹک قوم کے نام سے بھی توبہ ہے

پشتون ہیں تو آدم زاد
لیکن عادات میں ہیں ہناد
نہ یہ حکمت رکھتے ہیں نہ عقل
خوش رہتے ہیں آمادہ بہ فساد
ایک دوسرے کی گردن پر سوار ہے
اسی لیے ان کو بلا کے نام سے پکارا گیا ہے
اے خوشحال وہ تو شکر کرو
کہ محکوم نہیں ہیں آزاد ہیں
یہ (افغان) عفریت کی ادلاد ہیں یا دیوزاد ہیں یا درندوں کے بچے ہیں
میں افغانوں کو آدم کی نسل میں شمار نہیں کرتا
ان کو جتنی بھی پند ونصیحت کرو
ان کو اپنے باپ کی نصیحت بھی اچھی نہیں لگتی

گو کہ خوشحال بابا اوائل عمر میں مغلوں کی ملازمت میں خوش تھے۔ اور اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے فرائض منصبی سرانجام دیتے رہے۔ لیکن بے گناہی کے باوجود انہیں مغلوں کی قید کاٹنی پڑی تو وہ سراسر مغلوں کے خلاف ہو گئے۔ قید کے دوران انہوں نے مغلوں کے خلاف اپنا بہترین کلام لکھا۔ شہنشاہ وقت اورنگزیب کے خلاف خصوصاً اور مغلوں کے خلاف عموماً ایسی آگ برسائی جو روز بروز فزوں تر ہوتی گئی۔ جہاں شعراء

بادشاہ وقت کے دربار میں حاضری اور تعریف شاہ میں اپنا قصیدہ پیش کرنے کو عین سعادت سمجھتے ہیں وہاں خوشحال نے اپنے قصیدوں میں شہنشائے وقت اور اسکے درباریوں اور حواریوں کو خوب برا بھلا کہا ہے۔ اوران کو ان کے کرتوتوں کا صحیح عکس اپنے کلام کے آئینے میں دکھایا ہے:-

''اگر دیکھو تو اورنگ بادشاہ گمراہ ہے
کیونکہ اس کو اپنے پرائے کی پہچان نہیں ہے
اورنگ بادشاہ کے دور میں آرام نہیں
کون کہتا ہے کہ یہ جہان آرام کی جا ہے
جیسا کہ چہرے سے سیاہ نظر آتا ہے
(اورنگزیب) اندرون سے بھی اتناہی سیاہ ہے
اگر اسکی نیت کو دیکھو تو ایک یزید ہے
لیکن اسکی طاقت کو دیکھو تو اہل اللہ ہے
مجھے اورنگزیب کا عدل وانصاف خوب معلوم ہو گیا ہے
اس کی اچھی مسلمانی بھی اور اس کا اعتکاف بھی
اپنے سگے بھائیوں کو باری باری قتل کرنے والا
اور اپنے باپ کو نظر بند کرنے والا
کوئی ہزار بار زمین پر اپنا سر مارے

یا جھک جھک کر نمازیں پڑھے
جب تک اچھے عمل کے ساتھ ساتھ نیت بھی ٹھیک نہ ہو
تو ساری عبادت اور اطاعت فضول ہے
جسکی زبان اور دل کے راستے الگ الگ ہوں
تو اسکا جگر خنجر سے شگاف شگاف ہو جائے
سانپ کا بدن باہر سے جتنا خوبصورت نظر آتا ہے
اندر سے اتنا ہی ناصاف ہوتا ہے
بہادروں کا عمل زیادہ اور کہا کم ہوتا ہے
مگر نامردوں کا عمل کم اور لافیں زیادہ ہوتی ہیں
اگر یہاں (اس دنیا میں) خوشحال کا ہاتھ ظالم کے گریبان تک نہیں پہنچ سکتا
تو قیامت کے دن خدا میرے دشمن (اورنگزیب) کو معاف نہ کرے"

تعارف میں بے باکی اور جنسی کلام کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اب وہ مقام آ گیا ہے کہ خوشحال کی اس بے باکی کو بھی متعارف کرایا جائے۔ مقصد وہی جرات اظہار ہے۔ جو بہت کم شعراء میں پائی جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خوشحال کا جنسی کلام اس لیے بھی پیش کیا جانا چاہیئے کہ جنسیات سے کسی کو بھی مفر نہیں اور اگر یہ ہماری حیات کا اتنا ضروری امر ہے تو پھر اسے وہی اہمیت دی جائے جس کی یہ مستحق ہے۔ خوشحال کی جنسی شاعری سے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں:-

ترجمہ:- ''اگر سفید ریش آدمی اپنی ڈاڑھی خضاب کے ساتھ کالی کرے
اور اپنے آپ کو اپنی جوان بیوی کے سامنے جوان سمجھے
تو (یادرکھو) جوان بیوی کا دل بوڑھے خاوند سے بے زار رہتا ہے
اگر چہ وہ اپنی جوان بیوی کو بڑے ناز ونعم سے رکھے''
''شکرلبوں کے بوسے بوڑھے کو جوان کر دیتے ہیں
یہ بات خوشحال کی آزمائی ہوئی ہے''
''عشاق جب اپنے سروں کی بازی لگا دیتے ہیں
تب جا کر دلبروں کے نرم اور مخملی ہونٹوں کو چومنا نصیب ہوتا ہے''
''وہ اپنا سفید منہ میرے کانوں کے پاس لائی
اور نہایت نرمی سے کہا کہ
میں تو اپنی زلفیں کھول کر تیرے پلنگ کے پاس آئی ہوں
پر میری جان تم ابھی تک سوئے ہوئے ہو''
''اگر کبھی بھی میرا ہاتھ تجھ تک پہنچ سکے
تو تیرے سفید چہرے پر اپنے دانتوں کے سیاہ نشان چھوڑ و نگا''
''اپنے دونوں ہونٹ خوشحال کے ہونٹوں پر رکھدے
کہ لوگ طوطوں کو شکر ہی کھلاتے ہیں''
''کوئی بھی اس بے درد زمانے کو مطلع نہ کرے

کیونکہ آج محبوبہ نے خوشحال کو چھپا کر بوسہ دیا ہے''
''یا اپنا سر اپنی گردن کے خون سے رنگ دوں گا
یا پھر تیرے خوبصورت ہونٹ چوم لوں گا''

غرض یہ کہ خوشحال میں انسان کی جنسی ضروریات کا احساس صاف نظر آتا ہے۔ یہ چند اشعار وہ سب کچھ نہیں جو خوشحال کے جنسی کلام میں پایا جاتا ہے۔ بہر حال یہ خوشحال کا اپنے شہوانی جذبات پر جرات اظہار اور بے باکی کا زندہ ثبوت ہیں۔ اسی سلسلے میں خوشحال کی یہ نمائندہ غزل دیکھیں جو ایک نوخیز لڑکی کو دیکھ کر لکھی گئی ہوگی:۔

ترجمہ:۔ ''آج میری محبوبہ وہی ہے جو علاقے بھر میں آشکارا ہے
ابھی کم عمر لڑکی ہے سر کے بال کٹے ہوئے
جسے ابھی اپنے باپ بھائی سے بھی شرم وحجاب نہیں
سونے کا ایک چھوٹا سا لال رنگ کا بلاق ناک میں پڑا ہوا
اور زلفیں چھوٹی چھوٹی سی' نسترین چہرے والی مہ جبین
سنبل کی طرح بالوں والی پری
ہونٹ جیسے شکر' خوش خوش (رہنے والی) ہرنی کی سی آنکھوں والی
پھول سے گالوں والی'
قد میں عرعر کا پیڑ' کمر بال کی طرح پتلی' سر سے پاؤں تک ایک قلمی تصویر
دل کی پتھر' شوخ چنچل' ظلم کی عادی' دل دکھانے والی

میں تو اس کی ایک ایک نگاہ پر جان دیتا ہوں
اور اسے میری پرواہ بھی نہیں ہے
جب اسکے آگے کوئی میرا نام لیتا ہے
تو گالیوں پر اُتر آتی ہے
کیا کروں اُس کا کیا علاج اور کیا تدبیر کروں
ڈر کے مارے دم نہیں مارا جاتا
ادھر تو اس کی خو بو ایسی ہے
اور ادھر مجھے اس سے بے حد محبت ہے
خدارا مجھ غریب پر یہ کیا بلا آ پڑی
در پردہ راز و نیاز چاہوں تو اسے ان باتوں کا علم ہی نہیں
اگر زور زبردستی چلاؤں تو اس کے گھرانے والے بڑے خونخوار ہیں
دولت کے عوض مانگتا ہوں تو وہ بے حساب دولت طلب کرتے ہیں
یہاں نہ زور سے کام نکلتا ہے نہ زر سے
اور دنیا میں یہی دو وسیلے ہیں
خوشحال کو بھروسہ خدا پر ہے اور اے شیخ رحم کار یا پھر ترم پر ہے"

آیئے خوشحال کی حق گوئی اور بے باکی کو ایک اور زاویہ سے دیکھتے ہیں:-
ڈاکٹر اقبال کا ایک شعر ہے:-

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیبا کی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

خوشحال خان خٹک اور ڈاکٹر اقبال اس شعر کی زندہ مثالیں ہیں۔ خوشحال کی حق گوئی اور بیبا کی ان کی کلیات سے واضح ہے اور انکی جوانمردی انکے کردار سے ظاہر ہے۔ خوشحال خان کے کردار شیر اور شاہین ہیں اور انکی شاعری شیر اور شاہین کے کردار کی ترجمان ہے۔ خوشحال خان کی شاعری میں جتنی حق گوئی اور بیبا کی ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی اور شاعر کی شاعری میں یہ صفت اتنی شدت کے ساتھ پائی جاتی ہو۔ اسی طرح ہمارے زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی حق گوئی اور بیبا کی ایک ایسا نادر نمونہ ہے کہ خوشحال خان کے علاوہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کی شاعری میں یہ صفت اتنی شدت سے پائی جاتی ہو''

(میاں سید رسول رسا''خوشحال خان اور اقبال میں حق گوئی اور بیبا کی'')

اسی لیے تو علامہ اقبال نے خوشحال کے متعلق کہا تھا:-

خوش سرود آں شاعر افغاں شناس
ہر کہ بیند' باز گوید بی ہراس
راز قومے دید و بے باکانہ گفت
حرف حق با شوخی رندانہ گفت

خوشحال کے کلام سے چند اشعار جن میں جرات اظہار کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے:-

مست یم مئے پرست یم رندی کرمہ کرمہ کرم
واوره محتسبہ بادہ خورمہ خورمہ خورم

ترجمہ:- میں مست ہوں مے پرست ہوں رندی کرتا ہوں کرتا ہوں کرتا ہوں۔
سن اے محتسب میں شراب پیتا ہوں پیتا ہوں پیتا ہوں۔

سر پہ دار لک شوے بنہ دے
نہ لک شوے پہ پیغور

ترجمہ:- طعنے کے بوجھ تلے سر جھکانے سے دار پر
سر کا لٹک جانا بہتر ہے۔

څو وانخلي لہ غليمہ انتقام
مرد نہ خوب کا نہ خوراک کا نہ ارام

ترجمہ:- مرد جب تک اپنے دشمن سے انتقام نہ لے لے
اسوقت تک نہ سوتا ہے نہ کھاتا ہے اور نہ ہی آرام سے بیٹھتا ہے۔

د پيپلو پاڼې خوره پہ غره کښې اوسہ
نہ چې پان د هندوستان خورې زما جندہ

ترجمہ:- اے میرے نوجوان پیپل کے پتے کھا اور پہاڑوں میں رہ
نہ کہ ہندوستان کے پان کھاتا پھرے

د منت دارو که مرم پکار مې نه دی
که علاج لره مې راشي مسيحا هم

ترجمہ:- اگر میرے علاج کے لئے مسیحا بذات خود بھی آ جائے تب بھی مجھے منت کی دوا قبول نہیں ہے چاہے میں مر ہی جاؤں۔

غالب

جرات ' اظہار اور بے باکی

جب ہم غالب کے ذاتی اور معروضی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو انکی خود پرستی کا عنصر انکی پوری زندگی اور انکی شاعری پر اثر انداز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ غالب کی شخصیت پر بحث کرتے ہوئے اسی کتاب میں غالب کی خود پرستی اور اسکے اثرات کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کے مقالے "غالب کی شخصیت" سے جو اقتباس پیش کیا گیا تھا وہ اس پوری صورت حال کو سمیٹنے کے لئے کافی ہوگا۔ اس اقتباس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجئے:-

"غالب کی عام زندگی میں خود پرستی کا جذبہ بالکل معمولی باتوں سے وجود میں آیا ہے۔ مثلاً خاندانی وجاہت' پیشۂ آبا' پنشن' نصب' خلعت ' دربار تک رسائی وغیرہ وغیرہ ۔۔۔۔ (چنانچہ) دوسرے لفظوں میں

غالب اپنے شعر میں خود کواحساسی اور جذباتی طور پرلوگوں کی سطح سے اونچا تصور کرتا ہے"

یہاں خاندان وجاہت اور پیشۂ آباء کو غالب کی خود پرستی کی وجوہات میں شامل کیا گیا ہے۔ دونوں وجوہات پر بھی غالب کی شخصیت پر بحث کے دوران سیر حاصل گفتگو ہو چکی یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ غالب کے مزاج کی تشکیل میں ان عناصر کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ اسی وجہ سے غالب کے اندر زندگی کی رمق کچھ زیادہ ہی توانا تھی اور ظاہر ہے کہ اس کا اثر انکی زندگی کے آخر تک رہا۔ انکے آخری زمانے کے مکاتیب اس امر کا بین ثبوت ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ خاندانی وجاہت اور پیشۂ آبا غالب کی شخصیت پر اثر ڈالتے ڈالتے انکی جرات اظہار اور بے باکی پر کس حد تک اثر انداز ہوئے ہیں:-

پروفیسر یوسف زاہد غالب کی خاندانی وجاہت اور پیشۂ آبا کے بارے میں فرماتے ہیں:-

"یعنی وہی حسب ونسب پر فخر' حد سے بڑھا ہوا احساس برتری' خودنگری' اپنی ذات کو دوسروں سے بلند سمجھنا' وہی سپاہیانہ لب ولہجہ' قوت مردانگی' مزاج کا جوشیلا پن' اپنی ہی بات کو صحیح خیال کرنا' کسی کے آگے سر نہ خم کرنا' وضعداری کی سختی سے پابندی اور اپنی آن پر حرف نہ آنے دینا' یہ وہ خصوصیات تھیں جو غالب کو ورثے میں ملی تھیں اور جن کا اظہار ان کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔ بلکہ اکثر وہ خود اس پر بڑے فخر وناز کا اظہار کرتے ہیں۔ غالب کی شخصیت کے

اس پہلو نے بھی ان کے لب و لہجے کی توانائی اور تندی و تیزی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

غالب از خاک پاک تورانیم
لا جرم در نسب فرہ مند یم
ترک زادیم و در نژد ہے
بسترگان قوم پیوند یم
ایبکم از جماعۂ اتراک
در تمامی زماہ دہ چند یم
سوپشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گیری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے"

(پروفیسر یوسف زاہد "غالب کا شاعرانہ لب ولہجہ")

غالب کی خود پرستی ہی ان کے لہجے کی قوت جوش کی واحد وجہ نہیں تھی۔ غالب کے زمانے میں بدلتی تہذیبی فضا نے بھی ان کے لب و لہجے کی تیزی میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ مغلیہ حکومت کے جاگیرداری نظام سے منسلک معاشرتی حالات کے زیراثر اردو شاعری کے لب و لہجے میں تیزی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ غالب سے پہلے اردو شعراء ہندوستان کی پرانی تہذیب سے چمٹے رہنے اور ولی دکنی کی پیروی کرتے کرتے اردو شاعری کو بے بسی اور محرومی کے سوا کچھ بھی نہ دے سکے۔ ظاہر ہے اس سے اردو شاعری کے لب ولہجہ میں

زندگی اور توانائی کی آخری رمق بھی مفقود ہو کر رہ گئی حتیٰ کہ غالب ایک منفرد اور توانا لب و لہجے کے ساتھ ہندوستان کے ادبی اُفق پر نمودار ہوئے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

چونکہ غالب میں ذوقِ تجسس بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس لیے وہ نت نئے حقائق کی تلاش کر کے ان پر اظہار خیال کرتے۔ انہوں نے قیس کی صحرانوردی میں حرکی توانائی دیکھی اور اسے تسلیم کر لیا لیکن فرہاد اور منصور حلاج کی قربانیوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس سے انکی شاعری کے لب و لہجے کو ایک اور سمت بھی مل گئی۔

آیئے غالب کے ان اشعار کا لطف اٹھاتے ہیں جن میں غالب نے فرہاد اور منصور حلاج کے بارے میں اپنا فیصلہ سنایا ہے:-

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا
عشق و مزدوریٔ عشرت گہ خسروؔ کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفئی منصور نہیں

غالب کے کلام کا مطالعہ کرنے پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں انسانی نفسیات سے دلچسپی تھی اسکی دوصورتیں تھیں۔ایک تو دوسروں کی نفسیات کو پرکھنے کا عمل اور دوسرے خوداپنی ذات کے معنوی وجود کا احساس۔اسے احساس ذات کہہ لیجئے یا عرفان ذات اسکے نتیجے میں اپنا آپ ہمارے سامنے آموجود ہوتا ہے۔آپ اسکی اچھائیاں دیکھ لیں اور چاہیں تو اپنی شخصیت کی کمزوریاں اور بدوضع گوشے:۔

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اگر جذبے فکر اور تخیل کے امتزاج سے الفاظ میں موسیقیت پیدا کی جاسکتی ہے تو ترکیبوں تشبیہوں اور استعاروں سے شعر میں اس سے بھی زیادہ جادو جگایا جاسکتا ہے۔غالب نے اس صفت گری میں بھی کمال پیدا کر کے اپنی شاعری کے لب ولہجے کو سنوارا:

"غالب کے ہاں جو تازہ شگفتہ استعاروں تشبیہوں اور خصوصیات سے ترکیبوں کی فراوانی نظر آتی ہے اس میں بھی دراصل یہی انفرادی اپج دکھانے کی کوشش کارفرما ہے۔اس کے تجربات ایک انفرادی شان رکھتے ہیں۔اس لیے اس نے انہیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لئے بڑی نادر اور منفرد تشبیہات استعارے اور ترکیبیں استعمال کی ہیں۔اس نے

اسلوب کی مروجہ عام پسند اور پیش پا افتادہ صفتوں سے کام نہیں لیا۔ اس کے انداز بیاں میں جو تازگی اور نیا پن ہے وہ اس کی انفرادیت کا عکس ہے۔ اس نے اپنے اظہار مطلب کے لیے نئے سے نئے پیرائے تلاش کئے ہیں۔ ہیئت میں کسی نمایاں تبدیلی کی صورت میں نہیں بلکہ لفظوں کے اثر انگیز اور معنی خیز مرکبوں کی صورت میں"

(آفتاب احمد "اردو شاعری میں غالب کی اہمیت")

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلود یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شور قیامت کس کے آب و گل میں ہے

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

یوں تو غالب کے اردو دیوان میں بھی تیزی وتندی' توانائی' مردانگی اور یقین سے پر اشعار مل جاتے ہیں۔ لیکن غالب کا اصلی رنگ قاہرانہ و باغیانہ دیکھنا ہو تو ان کا فارسی کلام ایسے اشعار کا آئینہ دار ہے:-

کردہ ام ایمان خود را دستِ مزدِ خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ و عبادت می کنم

ضروری نہیں کہ لب ولہجہ سخت ہی ہو۔ نرم لب ولہجہ بھی زندگی کا حصہ ہے۔ بعض انسان یا تو بہت سخت یا بہت نرم لب ولہجہ رکھتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کا لب و لہجہ کبھی سخت اور کبھی دھیما ہوتا ہے۔ میں غالب کو اس آخری زمرے میں شمار کرتا ہوں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب کی اردو شاعری میں تیز وتند لب ولہجہ لئے اشعار زیادہ نہیں۔ میری تحقیق کے مطابق ایسے اشعار ساٹھ ستر سے زیادہ نہیں تو پھر ڈیڑھ ہزار اشعار پر مشتمل اردو دیوان میں کے باقی اشعار تیز وتند لب ولہجہ لئے ہوئے نہیں ہیں۔ آئیے ایسے اشعار کا بھی مزا اٹھائیں کہ بہر حال ان کا تعلق غالب کی شاعری کے لب ولہجے سے ہی ہے:-

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

اسلوب کی مروجہ عام پسند اور پیش پا افتادہ صفتوں سے کام نہیں لیا۔اس کے انداز بیاں میں جو تازگی اور نیا پن ہے وہ اس کی انفرادیت کا عکس ہے۔اس نے اپنے اظہار مطلب کے لیے نئے سے نئے پیرائے تلاش کئے ہیں۔ہئیت میں کسی نمایاں تبدیلی کی صورت میں نہیں بلکہ لفظوں کے اثر انگیز اور معنی خیز مرکبوں کی صورت میں"

(آفتاب احمد "اردو شاعری میں غالب کی اہمیت")

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا دحشت کا کہ صحرا جل گیا

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلود یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب دگل میں ہے

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاک گلستاں مجھ سے

یوں تو غالب کے اردو دیوان میں بھی تیزی وتندی' توانائی' مردانگی اور یقین سے پر اشعار مل جاتے ہیں۔ لیکن غالب کا اصلی رنگ قاہرانہ وباغیانہ دیکھنا ہو تو ان کا فارسی کلام ایسے اشعار کا آئینہ دار ہے:-

کردہ ام ایمان خود را دست مزد خویشتن
می تراشم پیکر از سنگ و عبادت می کنم

ضروری نہیں کہ لب ولہجہ سخت ہی ہو۔ نرم لب ولہجہ بھی زندگی کا حصہ ہے۔ بعض انسان یا تو بہت سخت یا بہت نرم لب ولہجہ رکھتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کا لب و لہجہ کبھی سخت اور کبھی دھیما ہوتا ہے۔ میں غالب کو اس آخری زمرے میں شمار کرتا ہوں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب کی اردو شاعری میں تیز وتند لب ولہجہ لئے اشعار زیادہ نہیں۔ میری تحقیق کے مطابق ایسے اشعار ساٹھ ستر سے زیادہ نہیں تو پھر ڈیڑھ ہزار اشعار پر مشتمل اردو دیوان میں کے باقی اشعار تیز وتند لب ولہجہ لئے ہوئے نہیں ہیں۔ آیئے ایسے اشعار کا بھی مزا اٹھائیں کہ بہر حال ان کا تعلق غالب کی شاعری کے لب ولہجے سے ہی ہے:-

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح وظفر کا طالب ہے

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

ہمارے شعر ہیں اب صرف دلگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

اسد مجھ میں ہے اس کے بوسۂ پا کی کہاں جرات
کہ میں نے دست و پا باہم بہ شمشیر ادب کاٹے

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

غالب مے کشی تو کرتے ہی تھے۔ ان کے مے آلودہ اشعار بھی کچھ کم خمار نہیں رکھتے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ایسے چند اشعار حاضر ہیں کہ یہ بھی مرزا کا ایک لب ولہجہ ہے:-

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

ساقیا دے ایک ہی ساغر میں سب کو مے کہ آج
آرزوئے بوسۂ لب ہائے میگوں ہے مجھے

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

جب مے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

کہاں مے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالب کے سفر بنارس و کلکتہ کا بیان پہلے گذر چکا۔ اس سفر سے واپسی پر غالب نے جو غزلیں لکھیں۔ وہ جنسیات کے زمرے میں تو نہیں آتیں لیکن ان اوران سے پہلے اپنی ایک محبوبہ کی موت پر لکھی ہوئی غزل میں غالب کا شعری لب و لہجہ جنسیات اور حسن پرستی کے بین بین بیٹھتا ہے۔ غالب نے اپنی محبوبہ کی موت پر جو غزل لکھی اسکے چند اشعار:-

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پہ پردہ داری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تار برشکال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

اس کے کئی سال بعد کلکتہ سے واپسی پر غالب نے یہ اشعار لکھے :-

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

غالب نے کلکتہ جاتے ہوئے بنارس کی سیر بھی کی۔ واپسی پر بنارس کے متعلق جو مثنوی لکھی ہے اس میں "خواہش گیرائی" کا اظہار بہت صاف صاف ہے:-

زرنگیں جلوہ ہا غارتگری ہوش
بہار بستر و نو روز آغوش
بہ تن سرمایۂ افزائش دل
سراپا مژدۂ آسائش دل

غالب سلیم الخیال انسان تھے۔ ان کی زیادہ سے زیادہ حد جنسیت یہاں آ کر ختم ہوتی ہے:-

زچشم و دل بہ تماشا تمتع اندوزیم
زجان و تن بمدارا زیاں بگردانیم
گہے بہ لا بہ سخن با ادا بیامیزیم
گہے بہ بوسہ زباں در دہاں بگردانیم

اور یہ حسرت بھرا شعر:-

تکلف برطرف لب تشنۂ بوس و کنار استم
ذرا ہم باز چیں، دام نوازش ہائے پنہاں را

مرزا کے لب ولہجہ کی ایک اور قسم وہ ہے جو وہ خالص اردو زبان استعمال کرتے وقت بر تیں۔ اس میں فارسی الفاظ و تراکیب کم ملتی ہیں۔ اور یہ لب ولہجہ اپنا ایک خاص تاثر قائم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں غالب کی چھوٹی بحر میں لکھی ہوئی اردو غزلوں کے چند اشعار دیکھئے اور لب ولہجہ پر نظر رکھیئے:-

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے
کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

کہتے ہیں کہ غالب کے شاعرانہ لب ولہجہ کے بڑے بڑے محرک انکی شخصیت میں موجود انانیت' پُر جوش الفاظ کا استعمال' ان الفاظ کا صوتی آہنگ اور زیر و بم' موسیقیت' شوخی' جنسیات وحسن پرستی اور بعض اوقات فارسی الفاظ وتراکیب سے پاک خالص اردو الفاظ کا استعمال ہیں۔ مجموعی طور پر انکے فارسی کلام میں جوش وولولہ اور مردانہ وقاہرانہ رنگ انکے اردو کلام سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ غالب کا لب ولہجہ انکے اردو کلام میں متوازن سطح پر رہتا ہے۔ ڈاکٹر ایس ایم اکرام کے مطابق ان کے متوازن تحت الشعور کو یہ گوارہ نہ تھا کہ وفور جذبات سے حسن تناسب جاتی رہے۔

مگر غالب کو ہم نابغہ نہ مانتے اگر ان کا یہ شعر ہماری نظروں سے نہ گذرتا:۔

میں جنوں میں کی جو اسد التماس رنگ
خون جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

خوشحال وغالب کی شاعری میں حُسن وعشق

''حسن کیا ہے؟ اس سیدھے سے سوال کا جواب مشکل بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ حسن سرور انگیز بھی ہوتا ہے اور نظر افروز بھی۔ وہ جسم سے منزہ بھی ہوتا ہے اور جسم سے وابستہ بھی۔ اس کی پہچان فطری ہے اور اس پہچان کی تحلیل نے فلسفہ وفکر کی بے شمار راہیں کھول دی ہیں۔ سقراط (۴۹۰ ق م ۔ ۳۹۹ ق م) کے خیال میں حسن ذات الہیٰ کا مظہر ہے اور تناسب وہم آہنگی اس کے ناگزیر اجزا ہیں۔ افلاطون کی نظر میں یہ ''خیرِ محض'' کا فیضان ہے اور اس کو محسوس کرنے کے لیے ذہن کی رفعتیں ضروری ہیں۔ حسین ترین شے وہ ہے جو رفیع ترین ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ ارسطو (۳۸۴ ق م ۔ ۳۲۲ ق م) افلاطون کے نظریئے کو عقلیت کا رنگ دیتا ہے۔ لیکن اس سے بات بدلتی نہیں۔ حسن پھر بھی ایک مظہر رہ جاتا ہے۔ اور حسین صرف عقل کا' خدا یا کائنات کی ذات''

(پروفیسر سید محمد تقویم الحق کاکاخیل ''خوشحال خان کا تصور جمال'')

حسن کی اس تعریف کے بعد عشق اور حسن وعشق کے باہمی تعلق کو معلوم کئے بغیر بات نہیں بنتی۔ اسلئے آیئے پروفیسر حمید اللہ خان نے اس سلسلے میں جو وضاحت کی ہے اس سے جانکاری حاصل کریں:-

''حسن وعشق کو ہم یہاں بطور ایک ملی جلی حقیقت کے دیکھ رہے ہیں کیونکہ یہ دونوں ایک ہی ذہنی کیفیت کے دو بظاہر مختلف ظہور ہیں۔ عشق وہیں ہوتا ہے جہاں حسن نظر آئے اور جہاں عشق ہو وہاں حسن ضرور نظر آتا ہے۔

شوخیِ حسن وعشق ہے آئینہ دار ہم دگر
خار کو بے نیام جان ہم کو برہنہ پا سمجھ

اس یگانگت کے باوجود ہم حسن وعشق کے درمیان عام گفتگو میں فرق ضرور کرتے ہیں۔ حسن کو ہم ایک بیرونی حقیقت قرار دیتے ہیں یعنی ایک ایسی چیز جو ہمارے ذہن سے علیحدہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ اسی بیرونی حقیقت سے ہمارا وہ ذہنی تعلق ہے جو بالعموم خواہش کے رنگ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر حسن میں نہیں تو عشق میں یقیناً ہماری اپنی شخصیت منعکس ہوتی ہے''

(پروفیسر حمید اللہ خاں ''غالب کی شاعری میں حسن وعشق'')

اب ہم خوشحال وغالب کی شاعری میں حسن وعشق کا جائزہ لیتے ہیں:

خوشحال کی شاعری میں حسن و عشق

حُسن

گو کہ حسن و عشق میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن خوشحال کی شاعری میں حسن و عشق کا جائزہ لیتے وقت اگر ہم ان دونوں کو الگ الگ برتیں اور اسکے بعد (یا اس عمل کے دوران بھی) ان کا باہم ملاپ ہو تو یہ نہ صرف ایک دلچسپ امر ہو گا بلکہ ہم موضوع کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کر پائیں گے۔

تعارفی کلمات میں حسن کی جو تعریف کی گئی ہے اگر اس پر اضافہ کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ بعض انسان پیدائشی حسن شناس ہوتے ہیں تو کیسا ہو:۔

> ''خوشحال نے جب اس دنیا میں آنکھیں کھولیں تو اپنے ساتھ ایک حسن بین نظر اور حسن شناس مزاج بھی لائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر نے حسن کے ہر پہلو سے پردہ اٹھایا ہے۔ نباتاتی اور انسانی حسن سے لیکر حسن ازل تک وہ کونسا موضوع رہ جاتا ہے جس پر خوشحال نے اپنے جمالیاتی افکار یا تاثرات کا اظہار نہ کیا ہو''

(ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک ''خوشحال اور جمالیات'')

خوشحال نے انسانی حسن کے موضوع پر گراں مایہ اشعار چھوڑے ہیں لیکن ان میں سے جس شعر کو حسن کے ضمن میں بار بار دہرایا جاتا ہے اور جسے قبول عام کا درجہ حاصل ہو چکا ہے یہاں بطور خاص پڑھنے کے لائق ہے:-

پـه ځـان او پـه جهـان کښې مـا دوه ښيزه دي اوکښلـې
پـه ځـان کښې دواړه سترګې په جهـان کښې واړه کښلې

ترجمہ:- اپنے آپ میں اور اس پورے جہان میں' میں نے دو چیزیں پسند کی ہیں۔
اپنے آپ میں دونوں آنکھیں اور جہان میں سارے حسین"

یہ خوشحال کا ایک نہایت ہی پہلودار اور اثر انگیز شعر ہے۔ ذرا غور کیجئے انہوں نے کس خوبصورتی کے ساتھ حسن اور عشق کو ایک ہی جگہ پر مجتمع کر دیا ہے۔ آنکھوں سے حسن کو دیکھا جاتا ہے یہاں آنکھیں بدرجہ عاشق کے سامنے آتی ہیں۔ اور دنیا کے تمام حسین حسن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک ہی شعر میں حسن و عشق اس خوبصورتی سے سمو دینا خوشحال جیسے حسن بین شاعر ہی کا حصہ ہے۔

انسانی حسن میں ایک ایک عضو کی تعریف کر کے اسمیں حسن مکرر پیدا کرنے میں بھی خوشحال کو کمال حاصل ہے۔ خوشحال کی جو غزل اب پیش کی جا رہی ہے۔ اس میں پشتو زبان نے جو چاشنی پیدا کی ہے اسکا اردو میں ترجمے سے قدرے متاثر ہونے کا امکان تو بہر حال رہے گا۔ غزل کی طوالت کے باعث اس کا پشتو متن پیش نہیں کیا جا رہا لیکن آپ کو اس کے اردو ترجمے میں خوشحال کی حسن بینی کی خاصی جھلک نظر آئے گی۔ اس غزل میں نہ

صرف اپنی محبوبہ کے حسن بلکہ اس حسن میں ہم آہنگی کی بھی تعریف کی ہے:-
اردو ترجمہ:-

غزل

''تیری کالی چوٹیاں درخت کے گرد لپٹے ہوئے سانپ ہیں
تیری زلفیں نوبہار کے سنبل کے تار ہیں
تیری کالی آنکھیں ملک خطا کی ہرنیں ہیں
جو سنبل زاروں میں مست خرام ہیں
تیرے کالے ابرو کمان سے مشابہ ہیں
اور تیری پلکیں تیروں کا کام دیتی ہیں
عاشق ان دونوں کے وار سے زخمی پڑے ہیں
تیری مصف پیشانی بلور کو شرماتی ہے
اور بیدل لوگ ہزاروں کی تعداد میں اسکے خریدار ہیں
یہ جو تیرے دونوں ابروؤں کے درمیان ایک خال ہے
اس کو تو دیکھ کر ملک خطا کے اصلی نافے بھی قربان قربان جاتے ہیں
تیری سفید ناک زنبق کی کلی ہے
اور اس کے چہار سو گلزار کے پھول کھلے ہوئے ہیں
اور تیرے دونوں رخسار چنبے کے پھولوں سے بہتر ہیں

تیرے سفید دہن کو میں غنچے کے ساتھ نسبت دیتا ہوں
اس غنچے کی تمام کلیاں شکر بار ہیں
تیرے دونوں لال ہونٹ سرخ لعلوں کو شرماتے ہیں
اور تیرے سفید اور بے بہا دانت جیسے در شہوار ہیں
تیری خوبصورت ٹھوڑی ثمر قند کے سیب کی مثال ہے
جسکی مٹھاس نبات کی مٹھاس سے زیادہ ہے
تیرا سفید گلا چاندی کا بنا ہوا ہے
اور تیرے سیم آسا کاندھے بھی اسی شمار میں ہیں
تیرا پورا تن بدن حلب کے شیشے کی طرح صاف ہے
ایسا کہ درون کے راز اس میں سے نمودار ہوئے جاتے ہیں
تیرے سفید بازوؤں نے مصری کی ڈلی کی سفیدی کو اندھیرے میں دھکیل دیا ہے
اسی لیے ان کے گلے پر ہزاروں کا خون ہے
تیرے سرخ ناخن یاقوت کے نگینے ہیں
اور یہ تیری مخروطی انگلیوں پر لگے ہوئے ہیں
تیری ناف کی گانٹھ گلاب کا ایک پھول ہے
اور اسکے اردگرد پھولوں کی پتیوں کا انبار لگا ہوا ہے
تیری پنڈلیوں کی تعریف سے قاصر ہوں

مگر یہ سفیدی سے بھی زیادہ سفید ہیں

تیرا قد سرو کے درخت کی مثال ہے

اور جب تم سنگھار کر کے نکلتی ہو تو سرتاپا دیکھنے کی چیز ہو

ایسی حالت میں تو ہندوستان کی تمام رانیاں تم پر قربان جائیں"(۱)

خوشحال کی حسن شناس طبیعت نے حسن کی باریکیوں کو خوب سمجھا اور پرکھا ہے۔ وہ صرف خوبصورتی کو حسن کا درجہ نہیں دیتے بلکہ انسانی اعضاء اور چہرے کے ناک نقشہ کی ہم آہنگی سے حسن کا جو مجموعی تاثر پیدا ہوتا ہے اس سے حسن کا تعین کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک کے نزدیک یہی عمومی تاثر دل میں جا بنا تا ہے خوشحال فرماتے ہیں:-

ښهٔ صورت خو هم هغه چې زړهٔ ئې يوړو

نه چې کړه وړه ئې ښه دي ښه صورت دے

ترجمہ:- اچھی صورت تو وہی ہے جو دل لے جائے

یہ نہیں کہ بس اچھی صورت ہے۔

خوشحال نے اپنے کلام میں جا بجا آنکھوں اور دل کو بہت اہمیت دی ہے۔ آیئے اسکا سبب ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک سے جانتے ہیں:-

(۱) خوشحال کا تصور جمال' خوشحال مطالعہ' ص ص ۱۶۵ تا ۱۶۷

"خوشحال نے حسن کے مشاہدے کے سلسلہ میں آنکھوں کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے۔ ان کے مطابق اللہ پاک نے ہمیں آنکھیں اسلیے بخشی ہیں کہ کائنات میں بکھرے ہوئے حسن اور خوبصورتی کو دیکھ سکیں:

زۀ به ولې د ښه مخ ننداره نۀ کړم
نندارې لره ئې زه يم پيدا کړے

ترجمہ: میں اچھی صورت کا نظارہ کیوں نہ کروں۔
کہ دیکھنے ہی کے لیے تو مجھے پیدا کیا گیا ہے۔

ولې راته وائې چې په ښکليو نظر مه کړه
سترګې چې پيدا دي خو خپل يار لره کنه

ترجمہ:- حسینوں پر نظر ڈالنے سے مجھے کیوں منع کرتے ہو۔ آنکھیں تو اپنے محبوب کو دیکھنے ہی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

په کاليو سره مخ ښائسته کيږي
ستا په مخ ښائسته ستا د مخ کالي دي

ترجمہ:- زیورات سے تو چہرہ خوبصورت ہوجاتا ہے مگر (میں دیکھتا ہوں کہ) تیرے چہرے کی خوبصورتی نے زیورات کو خوبصورتی بخشی ہے۔

خوشحال خان نے فارسی میں آنکھوں کی تعریف یوں کی ہے:-

چشم مخمور تو آخر کار کرد
زاہد صد سالہ را میخوار کرد
روئے زود و آہ سرد و چشم تر
عشق کوہی را چنیں بیمار کرد

جمال کے ادراک میں دل کی بھی ایک خصوصی اہمیت ہے۔اور خوشحال اس اہمیت کو یوں اجاگر کرتے ہیں:

زړه مې خدائے مئین کوی په ښائسته ؤ
هسې نه چې زه په خپله زړه مائل کړم

ترجمہ:- قدرت میرے دل کو حسینوں پر عاشق کرتی ہے۔
نہ کہ میں خود دل کو ایسا کرنے پر مائل کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک ''خوشحال کا تصور جمال'')

انسانی حسن کے علاوہ خوشحال نے مناظر فطرت یعنی پہاڑوں' دریاؤں' ندی نالوں' چشموں' پانی' پتھروں' سبزوادیوں' پھولوں' پرندوں اور نباتات وحیوانات کے حسن کو بھی سراہا ہے۔ یوں ہم خوشحال کے تصور حسن کو ایک مربوط علم کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ پھولوں کی تعریف کرتے کرتے خوشحال رنگوں کی دنیا میں کھو جاتے ہیں:

''آ گستائن (۳۵۳ء۔ ۴۳۰ء) نے کہا ہے کہ ''ہر مادی چیز کا حسن اس کے حصوں کا تناسب' اعتدال اور رنگ کی نظر افرازی ہے'' رنگ

کا یہ تصور خوشحال خان کے ذہن پر بھی چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ان کے پورے مجموعۂ شعری میں کہیں بھی مادی حسن، رنگ کی نظر افروزیوں کے بغیر نہیں پایا جاتا۔حسن انسانی کا سراپا ہو یا مناظر فطرت کی تصویر۔خوشحال خان کے ہاں ''رنگ'' کا تذکرہ ضرور ملے گا۔

دگلونو هار په غاړه د دلبرو
شرموی لال و یاقوت او د لالا هم
ارغوان که بنفشه کنې شقائق دی
زیبائی لری یو ځائے جدا جدا هم

ترجمہ:۔ پھولوں کے ہار حسینوں کے گلے میں لعل، یاقوت اور گوہر تابدار کو غیرت دلاتے ہیں۔ارغوان ہوں یا گل لالہ ہوں مل کر بھی خوبصورت ہیں اور الگ الگ بھی۔

دیکھیئے ایک ساتھ تین تین چار چار رنگوں کی ہم آمیزی ہے اور اس آمیزش سے ہی نہیں خوشحال ان کے باہم امتزاج سے بھی لطف لیتا ہے۔بلکہ میدان جنگ میں بھی رنگوں کا حسن اس کے احساسات پر حاوی نظر آتا ہے۔

سپینې تورې ئې ګلګونې کړې په وینو
په اهار کښې شګفته شو لاله زار

ترجمہ:۔انہوں نے اپنی سفید چمکتی تلواروں کو خون سے سرخ کرلیا ہے۔اور یوں اساڑھ

کے مہینے میں گل لالہ کے کھیت کھل اٹھے ہیں۔

(پروفیسر سید محمد تقویم الحق کا کاخیل ''خوشحال کا تصور جمال'')

خوشحال کی شاعری میں حسن کاری بدرجۂ اتم موجود ہے۔حسن کا بیان خوشحال کے ان اشعار پر ختم کرتے ہیں:-

په رنگ رنگینه ئې په مخ نسرینه ئې

په لب شیرینه ئې په تن سیمینه ئې

درسته گلزار ئې، ترسرتا پایه

عیب دې دادې په زړه سنگینه ئې

ترجمہ:- تمہاری رنگت رنگین ہے اور چہرہ سفید گلاب جیسا۔

تمہارے لب قند و نبات کی طرح شریں ہیں اور تمہارا تن چاندی جیسا

تم مکمل گلزار ہو سرتا پا

لیکن تمہارا عیب یہ ہے کہ سنگین دل ہو۔

فارسی میں خوشحال کی حسن کاری قابل دید ہے:-

بتاب زلف و پیچا پیچ گیسو

صبوری از دل بے تاب برده

عشق

اے عشق کے تاج، اگر تو میرے سر پر رہے
تو مجھے غم کے خراج سے آزادی مل جائے
بے درد تیری قدر کیا جانیں
اے عشق اپنے مال غنیمت سے مجھے مالا مال کردے

یہ خوشحال کی ایک رباعی کا اردو ترجمہ ہے اور انکے کلام میں عشق کا بہترین تعارف بھی۔ خوشحال نے عشق کو بادشاہوں سے بھی اولا جانا۔تب ہی تو بیا نگ دہل عشق کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"عشقه تهٔ تر اورنگزیب بادشاه بهتر ئې
چې خوشحال دې په عالم کښې سربلند کړ

ترجمہ:-اے عشق تو اورنگزیب بادشاہ سے (میرے حق میں) بہتر ہے۔کہ تو نے خوشحال کو تمام عالم میں سربلند کردیا۔

خوشحال کی عشقیہ شاعری میں تین اقسام کے اشعار ملتے ہیں۔پہلی قسم ان اشعار کی ہے جن میں شاعر اپنے عشق کا بے دھڑک اور برملا اعلان کرتا ہے۔دوسری قسم میں وہ اشعار شامل ہیں جن میں حماسی رنگ پایا جاتا ہے۔ان میں باز' شاہین' میدان جنگ کے

مناظر اور جنگ میں استعمال ہونے والے تیر و تلوار کا ذکر آتا ہے۔ لیکن وہ سب کچھ عشق اور محبوبہ کی سنگدلی اور ناز و ادا کے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ ان اشعار میں عاشق کی مردانہ وجاہت اور دبدبہ کا وقار قائم رہتا ہے۔ گو کہ بعض اوقات عاشق کو محبوبہ کے سامنے اپنے عجز و انکسار کا اظہار کرنے میں بھی مزا آتا ہے۔ تیسری قسم خوشحال کے عشقیہ اشعار کی وہ ہے جو فلسفہ و فکر اور حکمت کی چاشنی لئے ہوئے ہیں۔ آیئے خوشحال کی عشقیہ شاعری کے ان تینوں پہلوؤں پر نقادوں کی آراء معلوم کرتے ہیں۔

''خوشحال کے ہاں عشق بزدلوں کا کام نہیں بلکہ عشق تو ان لوگوں لے لیے ہے جو سر کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوں:-

چې زړئې ونيسې زر ئې بيا پريږدې
خو يو نامرد به وي زړه به ئې ريږدې
يا دې زلفې په لاس کښې نه نيسې
يا دې ونيسې سر دې په کيږدې

ترجمہ:- جو اس (محبوب) کو جلدی پکڑ لے اور جلدی چھوڑ دے یہ ایک نامرد ہوگا۔ جس کا دل خوف سے کانپ رہا ہوگا۔ محبوب کی زلفوں پر یا تو ہاتھ نہ ڈالے یا اگر ڈالے تو پھر چاہے اس میں عاشق کا سر بھی چلا جائے تو زلف کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

زه خوشحال کمزورے نه يم چې به دار شم
په بنکاره ناري وهم چې خوله ئې راکړه

ترجمہ:- میں خوشحال کمزور نہیں ہوں جو کسی سے ڈروں۔

میں سب کے سامنے بانگ دُہل کہتا ہوں کہ اسنے مجھے بوسہ دیا۔

کــــه نیولے زرکه باز پرپرِدی له چنگ

زه به هم له لاسه پرپرِدم شوخ و شنگ

ترجمہ:- اگر باز اپنے پنجوں میں پکڑے ہوئے چکور کو چھوڑ دیتا ہو۔

تو میں بھی اس شوخ اور طرحدار معشوقہ کو ہاتھ سے جانے دوں گا۔

اور مندرجہ ذیل شعر میں خوشحال اپنے دل کو شہباز اور معشوقہ کو شکاری کہتا ہے:-

زړه مې ستا په زلفو بندشو تا کباب کړو

خوک شهباز هــم دکباب دپاره نیسی

ترجمہ:-میرا دل تری زلفوں کے دام میں گرفتار ہوا اور تو نے اسے کباب کر ڈالا۔

بھلا شہباز کو بھی کہیں کباب بنانے کے لیے پکڑا جاتا ہے"۔

(پروفیسر شاہ جہان خان۔"خوشحال خان خٹک۔بابائے پشتو شاعری")

جناب سید انوار الحق نے منتخبات خوشحال خان خٹک کے صفحہ (۴۷) پر ان کی حماسی شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

"خوشحال خان کے کلام میں اگر چہ ہر نوع اور ہر صنف کا کلام ہے مگر سب پر اس قدر جنگی و حماسی رنگ چھایا ہوا ہے۔ کہ جیسے ان کی شاعری کی غرض وغایت یا منتہا یہی کچھ ہو حتیٰ کہ حسن وعشق کے رنگین و رومانی جذبات میں بھی جو کنائے' اشارے اور تشبیہیں یا

استعارے استعمال کئے ہیں وہ بھی اپنے اسی انوکھے اور نرالے انداز میں باندھے ہیں۔ جن میں باز، شاہین، شیر، چیتے، تلوار، نیزے، خنجر، شکار، میدان جنگ، خون ریزی اور سر بازی کے سوا عام مثالیں کم ہیں۔ مثلاً معشوقہ کی آنکھوں، پلکوں، بھوؤں، خال اور عارض و کاکل کو اسطرح بیان کیا ہے:

لکه پټ سواره د جنګ ، نیزې په غاړه
دا اوږدۀ باڼۀ پـــرې پورې سترګې ستا

ترجمہ:- جیسے جنگجو مسلح سوار نیزے لئے گھات میں بیٹھے ہوں
ایسی ہی تیری آنکھیں اور ان کی یہ لمبی لمبی پلکیں ہیں۔

تـورې سترګې ئې تور باز باڼۀ ئې نوکې
چې زمـا خـاطـر ئې يوړو په نوكارو

ترجمہ:- اس کی کالی آنکھیں، کالے باز ہیں اور پلکیں انکے پنجے ہیں۔
جنھوں نے میرے دل کو کھرونچ کھرونچ کے ختم کرڈالا۔

ستا د مخ سپايان همه تورې پرې باسي
ولې دوه سترګې دې لا دی جنـګيالي

ترجمہ:- یوں تو تیرے چہرے کے سارے ہی سپاہی تیغ زن واقع ہوئے ہیں۔
مگر تیری یہ دو آنکھیں تو بلا کی لڑاکا ہیں۔

تورې تورې زلفې، کبود خال پکښې کوتره
راشه که ئې ګورې، پرې بندی يو څۀ شهباز دے

ترجمہ:- کالی کالی زلفوں (کے دام) میں نیلا خال جیسے کبوتر
یکھنا اس کبوتر کے پیچھے ایک کیسا شہباز آ کے پھنسا ہے۔

معشوقہ کے تکبر اور تمکنت کے ساتھ ساتھ اپنی شان وشوکت بھی جتلانا چاہتا ہے۔ کس قدر اونچا اور اچھوتا خیال ہے:-

مرګ لره ئې واره دډهلې لښکرې راغلې
ته لا د خوشحال په مرګ ځان روغ نه ګنې ننګ کړې

ترجمہ:- خوشحال کے قتل کرنے کو تو دہلی سے ساری فوج آئی ہوئی ہے۔ اور ایک تم ہو کہ ابھی تک تمہیں اس کے قتل کرنے میں عار ہے۔

(ڈاکٹر سید انوار الحق۔ ''منتخبات خوشحال خان خٹک'')

خوشحال کے فلسفہ وفکر اور حکمت کی چاشنی لیے ہوئے عشقیہ اشعار کو پروفیسر شاہ جہان خان نے یوں قلمبند کیا ہے:-

''خوشحال خان تو عشق ہی کو حیات جاوداں سمجھتا ہے:-

چې زړه ژوندی لرې د عشق په مينه
هغه که ومرې ګڼه نۀ مرينه

فرهاد که مړ دے مجنون که مړ دے
نوم به ئې هرکله په جهان وینه

ترجمہ:- جس کا دل عشق کی چاہت میں زندہ ہو۔ وہ مرکر بھی نہیں مرے۔ فرہاد اور مجنون گر چہ اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں لیکن دونوں کے نام اس دنیا میں باقی رہیں گے۔

چې په عشق سره ژوندي وی هغه نه مری
چې بې عشقه ژوندی ګرځی مړه هغه

ترجمہ:- جو لوگ عشق میں زندہ ہیں وہ مر نہیں سکتے۔ مردہ تو وہی ہیں جو بغیر عشق کے زندہ ہیں۔

چې څۀ درد لری د عشق تری به زاریږم
که مومن دے که کافر دے که یهود دے

ترجمہ:- میں اس شخص پر قربان ہوتا رہوں گا۔ جو عشق کا کچھ نہ کچھ درد رکھتا ہو۔ خواہ وہ مومن ہے یا کافر ہے یا یہود ہے۔

په بل ځائے مې پیرزو نه ئې د یار غمه
ته زما د زړه د مات کودی ریحان ئې

ترجمہ:- اے غم یار میں نہیں چاہتا کہ تو کسی اور جگہ رہے۔ تو تو میرے دل کے سفال شکستہ کا ریحان ہے۔ (اسی میں رہ)

د خانۍ د تورې کار نشته په عشق کښې
معشوقې وته مرئیې اوسه خوشحاله

ترجمہ:- عشق میں خان کی تلوار کا کوئی کام نہیں۔

اے خوشحال یہاں تو معشوق کا غلام بن کر رہ۔

(پروفیسر شاہ جہان خان "خوشحال خان خٹک۔ بابائے پشتو شاعری")

عشق اور عشاق کو ایک ہی شعر میں سموتے ہوئے خوشحال نے فارسی میں فرمایا ہے:-

در درون سینہ راز عاشقاں
عشق اندر کوچہ ہا اظہار کرد

خوشحال نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ زندگی میں انکے تین مشاغل رہے ہیں۔ ایک تو شکار جس کی خاطر بچپن میں اگر ایک گھنٹہ مکتب میں گذارتے تو دس گھنٹے شکار میں گذارتے۔ اور اس پر بھی ان کو یہ کہنے میں عار نہ تھا کہ اگر وہ شکار میں کم اور تعلیم پر زیادہ توجہ دیتے تو دنیا بھر کے علوم حاصل کر کے دکھاتے۔ خوشحال کے لئے دوسری محبوب چیز کتاب کا مطالعہ ہے۔ دنیا نے دیکھا کہ اسی خوشحال نے اپنے وقت کی عربی اور فارسی کتابیں چاٹ ڈالیں۔ اور نہ صرف یہ کہ ایک عالم کا درجہ حاصل کیا بلکہ کتابیں تصنیف بھی کیں اور ترجمہ بھی کیا۔ تیسری چیز جس میں خوشحال کو کمال حاصل ہوا وہ دلبروں کی دلبری اور حسن وعشق کے معاملات پر پوری گرفت ہے۔ اپنے ان تینوں مشاغل کا ذکر خوشحال نے یوں کیا ہے:-

یو د ښکار بل د کتاب بل د دلبرو
په جهان کښې نورې نه شوې دا درې مینې

ترجمہ:- ایک شکار دوسرے کتاب اور تیسرے دلبروں سے لگن دنیا میں ان تینوں محبتوں کے سوا اور کوئی محبت نہیں۔

اور خوشحال بابا نے جو کہا اسے سچ کر دکھایا۔ جوانی میں' بڑھاپے میں اور موت کے وقت تک انکی زبان پر حسن وعشق کی باتیں موجود ہیں۔ بڑھاپے میں حسن پرستی جاری رہی:-

که خوشحال په عمر لاړ تر اویا تیر شو
لا په زړهٔ کښې ئې د ښکلو اشنائي شته

ترجمہ:- اگر چہ خوشحال کی عمر ستر سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ مگر اسکا دل ابھی تک حسینوں سے آشنائی چاہتا ہے۔

اور دنیا سے رخصتی کے وقت صرف اور صرف حسینوں کا ارمان دل میں لئے ہوئے ہیں:-

د زړهٔ مینه ئې په ښکلو ماته نه کړه
خوار خوشحال به له دنیا نه دا ارمان وړی

ترجمہ:- اپنی زندگی میں حسینوں سے محبت کا ارمان پورا نہ کر سکا۔ بیچارہ خوشحال دنیا سے یہی ارمان لے کر رخصت ہوگا۔

خوشحال کی حسن کاری اور عشق کے والہانہ اظہار نے انگریز مستشرقین کو بہت متاثر کیا ہے۔ سراولف کیرو نے خوشحال کی چھوٹی بحر کی ایک غزل اپنی کتاب ''دی پویمز

آف خوشحال خان خٹک“ کے لیے منتخب کر کے اس کا انگریزی میں بڑا دل پذیر ترجمہ کیا ہے۔ اور اسے Love in a Gorden کے عنوان تلے اپنی تاریخی کتاب میں جگہ دی ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ان چند اشعار میں سے ہر ایک شعر میں حسن اور عشق دونوں کی واردات موجود ہے۔ یہاں اس غزل کے پہلے تین اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ خوشحال کی شاعری میں حسن و عشق کا موضوع بھی اختتام کو پہنچتا ہے:۔

ترجمہ:-

دواړه شونډې کړه په بيارته	اے محبوب اپنے دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے جدا کر
دُرریزي وکړه خپـل يارته	اور اپنے یار کے سامنے در ریزی کر
زه چې ستا و مخ ته گورم	میں جب تیرے خوبصورت چہرے کو دیکھتا ہوں
زړه مې نه کيږي گلزار ته	تو میرا جی گلشن میں جانے کو نہیں چاہتا
گل له شرمه خولې پريږدي	پھول شرم کے مارے پسینے پسینے ہوجاتے ہیں
چې نظر کا ستا رخسار ته	جب ان کی نظر تیرے (گلابی) رخسار پر پڑتی ہے

"When her petalled lips are parting whitest pearls do lose their luster. When her glance to me is darting, Fades the Fairest flower cluster, Roses shamed forget to blossom Brighter radiance to discover, In the budding of a bosom"

Sir Olaf Caroe

غالب کی شاعری میں حسن و عشق

جیسا کہ گذر چکا شاعری میں حسن و عشق ایک ہی ذہنی کیفیت کے بظاہر دو مختلف ظہور ہیں۔ اور ان دونوں میں شاعر کی شخصیت جھلکتی ہے۔ دیکھا جائے تو کسی شاعر کو اس کلیئے سے کوئی استثناء حاصل نہیں ہے کیونکہ:-

> ''جیسے ہم خود ہیں ویسے ہی ہمارا عشق ہے لیکن ذرا سا غور کیجئے تو حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہمارا حسن کا تصور بھی ہماری اپنی شخصیت سے محصور ہے۔ حسن کی کونسی ادا کو آپ خاطر میں لاتے ہیں۔ اور کس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ خود آپ کی افتادِ طبع کا کرشمہ ہے۔ انسان کی شخصیت کے الگ الگ ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ ہمارے عمل اور خیال کی ہر سرگرمی، ہماری خود فروشی و خودداری، ہماری محبت و نفرت، ایک ہی نا قابل تقسیم شخصیت کے مختلف مظاہر ہیں۔ غالب کا تصور حسن و عشق کیا تھا؟ یہ دراصل غالب کی شخصیت کا مسئلہ ہے''

(پروفیسر حمید احمد خاں، غالب کی شاعری میں حسن و عشق)

غالب کے واقعات زندگی پڑھ ڈالئے۔ آپکو ہر دم ان کی شخصیت کی انفرادیت اور اسکے

نتیجے میں پیدا ہونے والی عیش پسندی اور اچھی چیزوں سے محبت کی موجودگی کا احساس ہوگا۔ اس محبت کے ڈانڈے ان کے بچپن اور جوانی کے عیش وعشرت کی فضا سے جا ملتے ہیں۔ غالب کا نظریہ محبت کیا تھا؟

کہتے ہیں کہ غالب کے کلام میں حسن پر کم اور عشق سے متعلق اشعار زیادہ ہیں۔ اور یہ بھی کہ انہوں نے حسن کی تفصیلی تصویر کشی کہیں نہیں کی۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے مطابق غالب کی حسن کاری میں کوئی واضح انسانی صورت سامنے نہیں آئی حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی صورت گری غالب کی شاعری کا موضوع ہی نہیں ہے۔

اب ہم غالب کی شاعری میں حسن کی تلاش میں اوپر دیئے ہوئے حالات کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں۔ تو دو نئے حقائق سامنے آتے ہیں۔ کہ غالب کو حسن کی تصویر سے نہیں اس کی تاثیر سے سروکار رہے اور یہ کہ حسن کی مصوری اجاگر کرنے کے لیے غالب اشارات سے کام لیتے ہیں۔ اور بہت کچھ پڑھنے والے کے تخیل پر چھوڑ دیتے ہیں۔

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

ہم ان حالات میں بھی غالب کے ہمراہ چلنے میں خوش ہیں کہ اگر اس شوخ کا منہ دیکھ بھی لیتے تو ایک عارضی مسرت کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ مگر غالب کی ہمراہی کے دوران ہمارے دلوں میں جو خلش پیدا ہوتی جاتی ہے اس کا مزا ہی کچھ اور ہے۔

"نسوانی حسن کے تین عنصر ایسے ہیں جنہیں غالب کے تخیل میں مستقل

جگہ ملی ہے۔ ایک خاص کیفیت جو اس زمانے میں اور اس کے بعد بھی
توجہ کو بدستور دعوت نظر دیتی رہی۔ قامت یار کی رعنائی ہے:

اگر وہ سر و قد گرم خرام ناز آجاوے
کف ہر خاک گلشن شکل قمری نالۂ فرسا ہو

معلوم ہوتا ہے عوت کے بدن میں لچک اور موسیقیت یعنی پورے پیکر کی شوخی و رعنائی پر غالب کی نظر بار بار اٹھتی ہے۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

اسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقت آرائش
لباس نظم میں بالیدن مضمون عالی ہے

جوش صفائے تن کے بعد غالب ہمیں جوش صفائے زلف کی طرف
رجوع کرتا ہے ۔۔۔ غالب کے لیے جو تین عناصر حسن بنیادی
حیثیت رکھتے ہیں ان میں سے تیسرا اور سب سے بڑا جز ''نگاہ'' ہے
۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے نزدیک محبوب کی چشم و نگاہ کی
لذتیں حسن کے سب سے بڑے انعامات میں داخل ہیں''۔

(پروفیسر حمید احمد خاں ''غالب کی شاعری میں حسن و عشق'')

تو معلوم ہوا کہ غالب کے نظریہ حسن انسان میں تین عوامل کا دخل تھا ۔ قد وقامت یار' زلف اور چشم و نگاہ' اسلئے اب ہم کلام غالب کا جائزہ لیتے ہیں ۔ تا کہ ان موضوعات سے متعلق غالب کے شاعرانہ خیالات جان سکیں ۔ انکے اردو دیوان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان تینوں موضوعات میں سے قد وقامت یار پر چند گنے چنے اشعار ملتے ہیں ۔ سب سے زیادہ اشعار چشم و نگاہ اور زلف پر کہے گئے ہیں ۔ پھر ہمیں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی ہے کہ اول تو مرزا کے حسن پر کہے گئے اشعار عشق پر کہے گئے اشعار سے کم ہیں دوسری بات یہ ہے کہ اردو کلام کے مقابلے میں ان کے فارسی کلام میں عشقیہ اشعار وافر تعداد میں موجود ہیں ۔

قد وقامت یار پر غالب کے چند اشعار پیش خدمت ہیں :-

تا در آب افتادہ عکس قد دل جویش
چشمہ ہمچو آئینہ فارغ از روانی ہاست

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

ترے سر و قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

غالب کے نظریہ محبت کے ضمن میں انکی نفسیات محبت پر بھی ایک نظر ڈالتے جاتے ہیں۔ غالب کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن میں شاعر نے اپنی قلبی کیفیت تو خاص طور پر نمایاں نہیں کی لیکن نفسیات محبت کے بعض نئے یا اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک شعر نہایت بلیغ ہے:

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خوا ہوگا
نبض خس سے تپش شعلہ سوزاں سمجھا

غالب نے حسن انساں کے بارے میں زلف کو جو اہمیت وی ہے وہ اچھی خاصی ہے۔ اردو دیوان میں ہر دو تین غزلوں کے بعد زلف کا بیان ضرور ملتا ہے۔ سیاہ لمبے چمکدار بال آخر تک مرزا کی کمزوری رہے۔ شاید ان کا یہ شعر کچھ صورت حال بتا پائے۔

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

زلف گیرہ گیر نے غالب کو کس طور اُلجھائے رکھا۔ ذیل کے چند اشعار سے ظاہر ہے:-

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا

قید میں تھی تیرے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گرانباریٔ زنجیر بھی تھا

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعوئے وارستگی کی شرم

حلقے ہیں چشم ہائے کشودہ بسوئے دل
ہر تار زلف کو نگہہ سرمہ سا کہوں

کٹے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلف خم بہ خم کیا ہے

پڑا رہ اے دل وابستہ بے تابی سے کیا حاصل
مگر پھر تاب زلف پرشکن کی آزمائش ہے

گر بہ سنبل کدۂ روضۂ رضواں رفتم
ہوس زلف ترا سلسلہ جنباں رفتم

غالب کی الفت چشم و نگاہ بھی ایک خاصے کی چیز ہے۔اس سے انکی حسن کاری اور چشم خوباں سے لگن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ غالب کے لیے حسن کا سب سے بڑا انعام یہی چشم و نگاہ کی لذت ہے۔اور عجیب بات یہ ہے کہ جیسے زلف سیاہ پر مرتے تھے ویسے ہی چشم سیاہ کے بھی دلدادہ تھے:

ابرو سے ہے کیا اس نگہ تار کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

حلقے ہیں چشم ہائے کشودہ بسوئے دل
ہر تار زلف کو نگہ سرمہ سا کہوں

عشق

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

غالب نے عشقیہ شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کے لئے عشق زندگی تھی اور زندگی عشق۔

عشق نے غالب کی طبیعت میں ایک خاص مقام یوں بھی حاصل کیا۔ کہ انہوں نے بذات خود عشق کی چاشنی چکھی تھی۔ تیرہ برس کی عمر میں انکی شادی ہوئی اور بیس برس کی عمر میں شادی شدہ زندگی کی ناآسودگی نے انہیں گھر سے باہر عشق کرنے کی راہ دکھائی مگر محبوبہ کی بے وقت موت کی وجہ سے غالب کے پہلے اور آخری عشق کا باب بند ہوا۔ مطلب یہ کہ چونکہ غالب نے عشق کیا تھا اسلیے انہیں عشق کے رموز سے جو واقفیت حاصل ہوئی اس نے انکی عشقیہ شاعری پر اپنا آنس ضرور ڈالا ہوگا۔

ڈاکٹر ایس ایم اکرام نے کہا ہے کہ "محبت کے متعلق غالب کے اشعار کئی طرح کے ہیں۔ زیادہ تعداد میں ان اشعاروں کی ہے جنہیں مضمون آفرینی اور خیال آرائی کی مثالیں سمجھنا چاہیے۔ (اس پر اضافہ یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار مرزا کی جوانی کی تخلیق ہیں۔) اور ذہنی مشق کی مثالیں ہیں۔ ان میں خیال بندی اور مبالغہ یا شوخی سے نئے مضامین پیدا کئے گئے

ہیں"

پھر بے خودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جاتا وگر نہ ایک دن اپنی خبر کو میں
شب کو کسی کے خواب میں آیا ہے وہ کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤں
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

غالب کی شاعری کے ابتدائی دور میں اس قسم کے اشعار کی بہتات تھی کہ یہ انکی خیال آفرینی کے نمونے ہیں۔ اسکے بعد غالب کے عشقیہ کلام میں شگفتہ اور شوخ اشعار بھی ملتے ہیں لیکن ان اشعار میں دلی جذبات کا بیان نہیں بلکہ بقول ڈاکٹر اکرام "خیالی تصویر بنا کر اسی سے ناظرین کی ضیافت طبع کا سامان کیا جاتا ہے" ان میں رشک بھی موجود ہے۔

ابھرا ہوا نقاب میں ان کے ہے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

غالب کی عشقیہ شاعری سے تین مثالیں دی جاتی ہیں۔ ان سے ان کی عشقیہ شاعری کے

خدوخال نمایاں ہوسکیں گے۔ غالب نے نوجوانی ہی میں اپنے عشق کو اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے معشوق کے پہلو میں دفن ہوتے دیکھا تو فوراً جذبات میں سرتاپا احتجاج بنتے ہوئے اپنی محبوبہ سے یوں گویا ہوئے۔

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
گر مصیبت تھی تو غربت میں اُٹھا لیتے اسد
میری دہلی میں ہی ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

بعد میں تیس بتیس سال کی عمر میں جب غالب کو سفر کلکتہ درپیش ہوا۔ تو کلکتہ جاتے ہوئے انہیں بنارس کا شہر دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا:

"بنارس میں نسوانی حسن و جمال کے نظاروں نے اسے بیتاب کردیا۔ کوچہ و بازار، در و بام، کنار دریا، جدھر نظر اُٹھتی شاعر کی آنکھ کھلی کی کھلی رہ جاتی۔ مثنوی "چراغ دیر" اسی زمانے کی یادگار ہے۔ مسلسل نظم اور پھر عورت کے حسن کا پُر جوش بیان، جزئیات حسن کی مرقع کاری کی کوئی تقریب اگر ہوسکتی تھی تو یہ تھی"۔

(پروفیسر حمید احمد خاں "غالب کی شاعری میں حسن و عشق")

بنارس کی حسین عورتوں کو دیکھ کر غالب نے اثرات قبول کئے وہ بعد میں ان اشعار کی صورت میں سامنے آئے:

میانہا نازک و دلہا توانا
زنا دانی بکار خویش دانا
ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار
خرامے صد قیامت فتنہ در بار
قیامت قامتاں مژگاں درازاں
زمژگاں برصف دل نیزہ بازاں

ادھر غالب کے دل پر کلکتہ کے دوران قیام حوران بنگال کا انمٹ نقش بھی موجود تھا۔ جس نے انہیں یہ کہنے پر آخر مجبور کر ہی دیا:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اگر غالب کی عشقیہ شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو کھلے گا کہ انہوں نے جوانی میں جو کچھ کہا اسکے عوامل ان عوامل سے مختلف تھے جن کے تحت انہوں نے اپنے دور پختگی میں لکھا۔

ایک اور ضروری بات جو غالب کی عشقیہ شاعری کے ضمن میں یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ بعض نقادوں نے اس شاعری میں سے کچھ کو دنیا کی بہترین عشقیہ شاعری کے مقابل رکھنے کا کہا ہے لیکن انہی نے غالب کی عشقیہ شاعری پر بوجوہ انگلیاں بھی اٹھائی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:-

''بہر کیف غالب کے یہاں عشق کے نہ جانے کتنے مختلف جذبات

نظم ہوئے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ان میں سے کچھ کو دنیا کی بہترین عشقیہ شاعری کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے باوصف غالب کی عشقیہ شاعری کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جو آج کے بدلے سماج اور مذاق میں ہمیں مضحکہ خیز محسوس ہوں گے۔

گلیوں میں میری لاش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہگزار تھا
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

(راجندر ناتھ شیدا ''غالب کا شعور۔۔۔ایک مطالعہ'')

گو کہ مجموعی طور پر غالب کے عشقیہ اشعار میں عشق کی گوناگوں کیفیتوں اور وارداتوں کو برتا گیا ہے لیکن ان کے کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن سے عشق کے متعلق مایوسی ٹپکتی ہے۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

جب ہم غالب کی عشقیہ شاعری کا ان کی جوانی اور دورِ پختگی میں جائزہ لیتے ہیں تو بحیثیت مجموعی وہ ایک مشاقِ عشق ماہر بن کر ابھرتے ہیں۔ جن کے کلام میں جذبۂ عشق بدرجۂ اتم

موجود ہے اور یہ کلام ہجر و وصال کے انمٹ تاثرات سے لبریز ہے۔

چہ دید جان من از چشم پر خمار بگو
چہ رفت برسرم از زلف پرشکن یاد آر

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

شوقم خریدۂ رقم آرزوئے بوس
ذوقم قلمرو ہوس مژدۂ کنار

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف، تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

خوشحال وغالب
کے ہاں طنز ومزاح اور شوخی وظرافت

ان شعراء وادباء کے سوا جنہوں نے غم وحزیں کو اپنے اوپر طاری کئے رکھا ادب کے بیشتر لکھنے والوں نے کسی نہ کسی درجے پر طنز ومزاح اور شوخی وظرافت کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی ہے۔ خوشحال وغالب بھی اس دوسری قسم کے ادیبوں میں شامل ہیں۔ طنز و مزاح کے یہ عناصر جہاں خوشحال کی شاعری میں جابجا اپنی بوقلمونی دکھاتے ہیں وہاں غالب کی نظم ونثر دونوں میں طنز ومزاح اور شوخی وظرافت کے وافر اور بلیغ نمونے ملتے ہیں۔

> ''انگریزی ادب کا سب سے بڑا مزاح نگار شیکسپئر ہو گزرا ہے جس کے ڈرامے مزاح وظرافت کی بنیادوں پر استوار ہیں۔ ''مکمل حیوان ظریف کیا ہوتا ہے'' اس کا اندازہ لگانے کے لیے شیکسپئر سے شروع کیجئے۔ شیکسپئر کی سب سے عظیم تصنیف جو تمام یورپ کی بھی عظیم ترین تصنیف ہے ''کنگ لیر'' ہے۔ اس تصنیف میں المیہ نگاری اپنے کمال پر پہنچی ہے مگر لیر کا المیہ کچھ نہیں رہ جاتا اگر

اس میں سے اس کے فول کے مزاح کو نکال لیجئے کلاسیکی نقاد آٹھارویں صدی تک شیکسپئر کو طربیہ نگار ہی مانتے رہے۔اوراس کی المیہ نگاری سے انکار کرتے رہے۔۔۔شیکسپئر نشاۃ الثانیہ کی روح تھا جو بنیادی طور پر ظریف تھی مگر جس کی ظرافت کے دائرے میں ہر قسم کے تاثرات آجاتے تھے۔ لیر کی تکالیف کے ساتھ آسمان و زمین متزلزل ہیں مگر اس حد سے زیادہ تاریک عالم میں فول ہر جگہ اور ہر وقت اپنی مزاح کی پھلجھڑیاں بھی چھوڑ رہا ہے"

(ڈاکٹر احسن فاروقی ۔ "حیوان ظریف")

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق اردو ادب میں غالب کی طرح سودا' انشا اور اکبر کی شخصیتوں کی بنیاد بھی شوخی و شگفتگی پر تھی۔ مگر ان کی شوخی کی تہہ میں کسی سے الجھنے' کسی سے دست وگریباں ہونے اور کسی کی نفی کرنے کا ہاتھ ضرور کام کرتا نظر آتا ہے۔سودا چلتے چلتے لوگوں کو دھکا دیتے ہیں اور ان کا منہ چڑاتے ہیں پھبتیاں کستے ہیں کہ وہ ان باتوں کے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔وہ ہنستے ضرور ہیں لیکن ان کی ہنسی زہر خند بن جاتی ہے۔کم وبیش یہی حال انشاء کا ہے گو کہ وہ زیادہ شگفتہ مزاج ہیں مگر وہ بھی افراد کو ہدف بناتے ہیں۔اکبر ان دونوں سے آگے ہیں۔ان کی شوخی میں زمانے کا رونا ہے۔ان کے ہنسنے کی بنیاد یہ ہے کہ وہ زمانے کو آگے بڑھنے سے روک دینا چاہتے ہیں۔

پشتو ادب میں خوشحال سے پہلے کسی قابل ذکر طنز ومزاح نگار کا پتہ نہیں چلتا۔خوشحال جدید

پشتو ادب کے بانی تھے۔ ان کے ہاں جا بجا طنز کے زیادہ اور مزاح کے کم نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ آگے اس کی تفصیل آتی ہے۔

مناسب لگتا ہے کہ اس مقام پر طنز ومزاح کی تعریف پر روشنی ڈال لی جائے جس کے بعد خوشحال وغالب کے ہاں طنز ومزاح اور شوخی وظرافت کا مطالعہ کیا جائے گا۔

''طنز جسے انگریزی زبان میں (Satire) کہتے ہیں وہ تحریر ہے جس میں طنز نگار مذاق کے پردہ میں ایک فرد گروہ' قوم' نظریے یا ادارے پر بڑی تندی اور بے رحمی کے انداز میں تنقید کرتا ہے۔ اور اس چیز کے مختلف پہلو اجاگر کرتا ہے۔ جو اس کی طنز کا نشانہ بنتا ہے۔ طنز کے بہت سے درجے ہیں۔ طنز کبھی کسی انسان کی کم مائیگیوں اور کمزوریوں کی ہنسی اڑاتا ہے کبھی ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ انسان وسماج کی مستقل حماقتوں اور عالمگیر ناہمواریوں کو اجاگر کرتا ہے اور انسان کو انسانیت کے نزدیک تر لانے میں ممد ثابت ہوتا ہے۔ بعض نقادوں کے نزدیک طنز اپنی افادیت کی وجہ سے مزاح پر فوقیت رکھتا ہے۔ لیکن اپنے اپنے دائرہ کار میں دونوں انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔۔۔۔ اگر طنز نگار ایک ماہر سرجن کی طرح علاج کی خاطر جسم کو چیرتا ہے تو مزاح نگار ایک ماہر فزیشن کی طرح روایتی انداز میں بیمار جسم کا علاج کرتا ہے''۔

(حکیم اللہ جان لکچرر شعبہ پشتو پشاور یونیورسٹی
عبدالوحید لکچرر شعبہ پشتو پشاور یونیورسٹی
''عظیم خوشحال۔ عظیم طنز نگار'')

آیئے اب خوشحال و غالب کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ پہلے خوشحال کے کلام میں طنز و مزاح کے رنگ دیکھیئے۔

خوشحال کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت

کہتے ہیں کہ انسان پر اس تہذیب کا اثر رہتا ہے جس میں وہ بس رہا ہو۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہم خوشحال کو تہذیبی لحاظ سے مغلیہ دور کے اس سرے پر کھڑا دیکھتے ہیں جہاں سے اسکا انحطاط شروع ہوا۔ تہذیب کی پختگی اپنے افراد میں خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔ نتیجتاً حالات کی خرابی یا غم ایسے افراد میں مایوسی نہیں پھیلا پاتی اور وہ غم کو اپنی خود اعتمادی سے فتح کرنے اور اپنی زندگی میں مسرت کے مواقع پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

گو کہ خوشحال کا تعلق مغلیہ دور کی ترقی یافتہ تہذیب کے ساتھ لگ بھگ تیس سال تک رہا۔ جب وہ اپنے قبیلے کے سردار کی حیثیت سے مغلیہ دربار سے منسلک رہے۔ مگر اسکے بعد تقریباً چھبیس سال تک وہ مغلیہ تہذیب سے کٹ کر اپنے پشتون معاشرے میں رہتے بستے نظر آتے ہیں۔ ان سب پر مستزاد وہ پشتونوں کو متحد کرنے اور مغلوں کے خلاف کم و بیش پانچ جنگیں لڑنے میں مصروف رہے۔ ایسے میں انہوں نے شاعری کے لیے بھی

وقت نکالا ہوگا۔ گو کہ وہ مغلوں کی قید کے دوران چند ایک کتابیں تحریر کر چکے تھے۔ مشق سخن بھی جاری رکھے رہے۔

''خوشحال خان کی بات چیت میں متانت تھی۔ لیکن ظرافت سے بھی کام لیتے تھے۔۔۔ خان صاف گو، حق گو اور حق پرست انسانوں کے دوست تھے۔ یعنی صاف بات کرتے تھے اور صاف گو انسانوں کو پسند کرتے تھے۔۔۔۔ پیری میں بھی جوان دل رکھتے تھے اور ظریفانہ باتوں اور اشعار کے ذریعے اپنے دل کو خوش رکھتے تھے''

(میاں سید رسول رسا'' مقدمہ ارمغان خوشحال' ص ص ۱۶۔۱۱۷)

خوشحال کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کی نوعیت کیا تھی۔ آیئے دیکھیں:۔

''خوشحال بابا کے کلام میں طنز زیادہ اور مزاح کا عنصر کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ بابا نے تمام عمر جنگوں اور مبارزوں میں بتادی تھی۔ اور ایک بہادر اور مبارز انسان کا مزاج مزاح کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ البتہ خوشحال بابا نے مزاح کی ایک قسم ''تمسخر'' سے کام لیا ہے۔ یہ مزاح کی وہ قسم ہے جسمیں وزنی چیزوں کو ہلکا اور ہلکی چیزوں کو وزنی کرکے پیش کیا جاتا ہے''

(حکیم اللہ جان لکچرر شعبہ پشتو پشاور یونیورسٹی
عبدالوحید لکچرر شعبہ پشتو پشاور یونیورسٹی
''عظیم خوشحال۔ عظیم طنز نگار'')

خوشحال چونکہ ایک اچھے تنقید نگار بھی تھے اسلیے انہوں نے اپنے سے پہلے گذرے ہوئے ادباء اور شعراء پر منظوم تنقید کرتے ہوئے مزاح کا استعمال بھی کیا۔ مرزا خان انصاری اور ارزانی خویشکی خوشحال سے پہلے پشتو کے معروف شعراء گذرے ہیں۔ انکے متعلق ذیل کے قطعہ میں خوشحال نے مزاح کا استعمال اس طور کیا ہے کہ مندرجہ بالا اقتباس کے مطابق اپنے آپ کو وزنی لیکن ان شعراء کو ہلکا ظاہر کیا ہے۔

قتلمي مي ورته سازي کړې د قندو
د اوريشو په ډوډيو چې چا شخوند کړو
د مرزا ديوان مي او مانده په گوډى
مسخره مي ارزاني خويشکي زمند کړو

ترجمہ:- جو شعراء نان جوئں پر گذارا کرنے والے تھے انکے مقابلے میں' میں نے اپنے کلام کے ذریعے شیریں قتلمے تیار کئے۔ (اور اسطرح) مرزا کے دیوان کو واپس تھیلے میں بند کر دیا اور ارزانی خویشکی پر لوگوں کو ہنسایا۔

خوشحال بابا کا تمسخر لئے ہوئے ایک اور شعر دیکھیے:-

ترجمہ:- اس شاعر کا منہ کالا ہو جو طمع کی بناء پر ہر در اور ہر دربار میں حاضر رہتا ہے۔

خوشحال کے ہاں طنز کے موضوع پر اس سے بہتر الفاظ نہیں مل سکتے:-

"پھر یہی شاعر (خوشحال) جب طنز پر اتر تا ہے تو نہ بادشاہوں کو بخشتا ہے نہ خود اپنی قوم کو' نہ ملاؤں کو معاف کرتا ہے نہ صوفیوں کو' نہ اہل

دولت کو چھوڑتا ہے نہ اہل سیاست کو، وہ ہرایک پرنشتر چلاتا ہے اور
جس کی دکھتی رگ پکڑتا ہے اس انداز سے پکڑتا ہے کہ اگر وہ خاموش
نہ رہ سکے تو فریاد میں بھی لطف اندوزی کی جھلک نظر آ جائے۔
(محمد جعفر شاہ پھلواری رفیق ادارہ ثقافت اسلامی لاہور "پیش لفظ خوشحال واقبال")

خوشحال کے کلام میں زاہد کے ساتھ مکالمہ کرتے ہوئے اشعار بھی ملتے ہیں۔ان اشعار میں پنہاں طنز کو تو محسوس کیا ہی جا سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ خوشحال کی معاملہ فہمی اور طرز ادا کی بھی داد دینی پڑتی ہے:-

زۀ خــو شرابی یم شیخه څۀ راسره جنګ کړې
برخې ازلي دی کاش که ماد ځان په رنګ کړې

ترجمہ:-اے شیخ میں تو ایک شرابی ہوں تو کیوں مجھ سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے۔قدرت نے ہر ایک کو اس کا کام سونپا ہوا ہے۔کاش کہ تو مجھے اپنے رنگ میں رنگ سکتا۔

د زاهد په صومعه کښې مې زړه تنګ شو
لــه دې پسې بــه خدمت د مے فروش کړم

ترجمہ:-میرا جی زاہد کی صحبت میں رہتے رہتے گھبرا گیا ہے۔میں اسکے بعد اب کسی مے فروش کی خدمت کرونگا۔

محتسب چې په احــداد وود مستانو
د رندانو سره کښېناست باده خور شو

ترجمہ:- جو محتسب مستانوں کا دشمن تھا۔ وہ شرابیوں کی صحبت میں رہ کرے خور بن گیا۔

ذکر فکر مونځ روژه طاعت ورله بويه
شيخ ملا زاهد عابد صوفي په ميو څه زده

ترجمہ:- ذکر' فکر' نماز' روزہ اور اطاعت ہی انکے کام ہیں۔ شیخ' ملا۔ زاہد' عابد اور صوفی کو شراب سے کیا واسطہ۔

کومو شونډو چې درود او تسبيحات وے
راشه اوګوره د ميو د مينا شو

ترجمہ:- جو لب درود و تسبیحات میں مصروف رہتے تھے۔ آ ؤ دیکھو کہ وہ مے و مینا کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

له ازله ئې رند رند زاهد زاهد کړو
زه به ډکې پيالې اخلم ته تسبيح کړه

ترجمہ:- خالق نے ازل سے رند کو رند اور زاہد کو زاہد بنایا۔ اس لیے (اے شیخ) میں تو مے سے بھرے ہوئے جام پیتا ہوں اور تو تسبیح پھیر۔

خوشحال کے اس قبیل کے چند دوسرے اشعار کا ترجمہ یوں ہے:-

ترجمہ:- اے شیخ تو خدا کی زیادہ سے زیادہ طاعت بجالا کر جنت مانگتا ہے۔

تو کیا جنت میں جانا بھی انسانی ارادے پر موقوف ہے؟

ترجمہ:- یہ کس مے خانے کی شراب ہے جس کے ایک جرعہ سے صوفی مدہوش ہوا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسروں پر طنز کرنے والا یا انہیں مزاح کا نشانہ بنانے والا ضرور ایک صاف گو انسان ہوگا۔ اسی صاف گوئی سے انسان میں آزادمنشی بھی پیدا ہوتی ہے۔ خوشحال کے کلام میں اسکی آزادروی کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ جو عام حالات میں ایک عام انسان کے لیے حیرت کن حد تک باغیانہ روش کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوسکتیں۔ ان اشعار کے بین السطور طنز یا مزاح کی ہلکی سی لکیر گذرتی نظر آئے گی:-

که ستا کو څه جنت سره څوک سمه راته کېږدي

کو څه به دې وطن کړم که دا عیب وي هم دې وي

ترجمہ:- اگر کوئی تیرے کوچے کو جنت کے ساتھ پہلو بہ پہلو رکھدے۔ تو میں تیرے کوچے کو اپنا وطن بناؤں گا۔ اگر ایسا کرنا ایک عیب ہے تو ہوا کرے۔

ددې کلي طبيبان واړه ناترس دي

د دارو پــــه طمع مه اوسه بيمارَ

ترجمہ:- اس گاؤں کے تمام طبیب ناترس ہیں۔

اس لئے اے بیمار تو دوا کی امید میں نہ رہ

د تـقـوئ پـــه کـاروبـار ښــه خـبـردار يم

ولې څه کړم چې نصيب مې ګمراهي شوه

ترجمہ:- میں تقوئی کے کاروبار سے بخوبی واقف ہوں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میری قسمت میں گمراہی لکھی ہوئی ہے۔

زاهدان چې مونځ روژه کا جنت غواړي
مــا خوشحال د مزدوريه طاعت نه زده

ترجمہ:- یہ جو زاہد نماز اور روزے کے ذریعے جنت کے خواہاں ہیں۔ مجھے اس قسم کی مزدوری اوراطاعت نہیں آتی۔

چې دې سپيــن بارخو كبود كړم په چيچلو
اوس مــې نــه گـنـې هـالــه بــه مې گنې

ترجمہ:- تم مجھے اب تو نہیں مانتی لیکن وہاں خلد میں مجھے مان جاؤ گی جب میں تمہارے سفید رخسار دانتوں سے کاٹ کر سرخ کر دونگا۔

چــې لــه خپلــه كسبــه نــه خــوري
كــه ولــي دې كــلــه بنــه خــوري

ترجمہ:- جو شخص بھی اپنے ہاتھ اور اپنے ہنر سے کمایا ہوا نہیں کھاتا وہ حلال نہیں کھاتا چاہے وہ ولی ہی کیوں نہ ہو۔

رنځوران كه كاروبار نه كه معذور وي
روغ سړے به ولې نه كا خپل روزګار

ترجمہ:- بیمار اگر مزدوری وکاروبار نہ کرے اور معذور ہوتو جو صحت مند ہیں وہ کیوں کر اپنا روزگار نہ کریں۔

مزریتوب بویه د تورو په میدان کښي
په خالي میدان خو هرګیدړ مزرے وي

ترجمہ:-شیر دلی تو تلواروں کے میدان میں دکھائی جاتی ہے۔ خالی میدان میں تو گیدڑ بھی شیر ہوتا ہے۔

چې د ښځو نـه بتر دے هغه څوک دے
چې د ښځـو سره کـا مـصلحتونـه

ترجمہ:- جو مرد عورتوں سے بھی بدتر ہے وہ کون ہے۔ وہ وہی ہے جو عورتوں کے ساتھ صلاح مشورہ کرتا ہے۔

که ئې مومې اوړے ژمے ګبینه خوره
خو په سود ئې خبر مه کړه خپل پلار

ترجمہ:- اگر تمہیں شہد ملے تو اسے گرمی سردی دونوں موسموں میں کھاؤ مگر خبردار اس کے فوائد سے اپنے والد کو آگاہ نہ کرنا۔

اسی قبیل کے چند اور اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

ترجمہ:- اس کے رخساروں پر دانتوں کی چھاپ ہے
یہ کسی نوآموز عاشق کی کاٹ نظر آتی ہے۔

ترجمہ:- اپنے گھروں میں زخمی گدھے کی طرح منہ خشک ہوتا ہے
اور دوسروں کے گھروں میں گھوڑوں کی طرح راتب کھاتے ہیں

ترجمہ:- جس کا کردار گفتار کے موافق نہ ہو اس جھوٹے کی ڈاڑھی پر نفرین

ترجمہ:- چیل مردار کے پاس اور جھپٹنے والا شاہین شکار کے پاس ہوتا ہے۔

ترجمہ:- حجام کی اپنی حجامت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اور دوسروں کی حجامت کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

ترجمہ:- فصاحت تو باغ کی بلبلوں میں ہوتی ہے۔

کوے کو فصاحت سے کیا کام

ترجمہ:- تو جو نابینا کو آسمان یا تارے دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔

ذرا یہ تو بتا نابینا کن آنکھوں سے انہیں دیکھے گا۔

ترجمہ:- بوڑھا دولہا چاہے اپنے سر اور داڑھی کے بالوں کو ہزار بار رنگ لے اور اپنی جوان دلہن کی کتنی ہی دلجوئی کرے۔ اسکی جوان دلہن اس سے نالاں ہی رہتی ہے۔ خوشحال اپنی محبوبہ کے ساتھ اٹھکیلیوں کے ذریعے بھی طنز و مزاح کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

تـه مې وژنـه د قـصاص اندیښنه مه کړه
د خپـل خون په تور به ونیسم یو بل څوک

ترجمہ:- تم مجھے قتل کرو اور قصاص کی فکر بالکل مت کرو۔ میں اپنے خون کے بدلے میں کسی اور کو پکڑ لوں گا۔

هم دې ووژلم پخپله هم بیا ګوره
بیا په ما باندې تېر وهې ماتم کا

ترجمہ:- ایک تو تم نے مجھے قتل کیا۔ اور پھر دیکھو کہ تم سینہ کوبی کرتے ہوئے میرا ہی ماتم کررہے ہو۔

خوار خوشحال په مرگی حال دے ځنکدن کا
راشه گوره په ایمان دلیدو ستا مری

ترجمہ:- بے چارہ خوشحال نزع کی حالت میں ہے۔ آؤ دیکھو ایمان سے تمہیں دیکھنے کے لیے مررہا ہے۔

ترجمہ:- خوشحال کو اپنے پیارے ہونٹوں سے بوسے کی اجازت دے دے۔ تاکہ طوطا مزے لے لے کر قند کھایا کرے۔

ترجمہ:- خوشحال کو قتل کرنے کے لیے تلوار کیوں کھینچی ہو۔ اسے قتل کرنے کے لیے تو تیری پلکوں کے ناوک ہی کافی ہیں۔

زه خوشحال که تانه غوارم مستحق یم
خوله زکوٰت راکره د حسن له نصابَ

ترجمہ:- اپنے حسن کے نصاب سے مجھے ایک بوسہ از راہ زکوٰۃ دے دے۔ کیونکہ میں خوشحال اس کا مستحق ہوں۔

سپینه خوله ئي و ما راکره وې مې مور شوم
وې ئي خواره وربه دا خو نیمرغے دے

ترجمہ:- اس نے مجھے اپنے سفید چہرے کا بوسہ لینے دیا۔ اور جب میں نے کہا کہ بس میں

سیر ہو گیا ہوں تو کہنے لگی بے وقوف بھو کے یہ تو صرف ناشتہ ہے۔

د سمند سمونه سره په وينو درومی

چره بيا دې د چـــا مينه كړه خرابه

ترجمہ:- تم جس گھوڑے پر سوار جا رہی ہو اسکے سُم خون آلود ہیں۔

تم پھر کس کی محبت کو برباد کر کے آ رہی ہو۔

ترجمہ:- جو آپس میں زور آزمائی کرتے ہیں وہ خسارے میں رہتے ہیں۔

وہ اگر از خود بوسہ دے دے تو زور آزمائی کی حاجت ہی نہ رہے۔

ترجمہ:- اسے یاری کے ہنر کا کچھ بھی پتہ نہیں۔

اگر میں اسے پند سناتا ہوں تو وہ رونے لگتی ہے۔

كله ناز كله كنځل كړې كله مهر

د خوشحاله مروره كه پخلا ئې

ترجمہ:- ایک بوسہ لینے پر تم خوشحال سے کس قدر ناراض ہو کہ کبھی ناز دکھاتی ہو کبھی گالیاں دیتی ہو تو کبھی مہربان ہو جاتی ہو۔

ولـې ليـچـې بـربـنـډئـې توره اوكـاږې

كــه د خــوارو د كشـتـن پـه آهـنگ نـه ده

ترجمہ:- وہ کیوں اپنی باہیں ننگی کر کے میان سے تلوار نکال رہی ہے۔

کیا اسے اپنے خوار عاشقوں کے قتل ہونے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

پـه بـار بـار دې د خـنـدا مـنـت رابـانـدې
چـې لـه ورايـه رابنکاره شې راتـه خـانـدې

ترجمہ:- جب تم دور سے نظر پڑتی ہو تو مجھے دیکھ کر مسکراتی ہو۔
اس مسکراہٹ کا مجھ پر تیرا بار بار احسان ہو۔

چې دې زړه وی چې بـه زړه د خوشحال گورم
راشـــــه اوگـوره پــه اور ایښے کبـــاب

ترجمہ:- اگر تیرا جی کرتا ہے کہ خوشحال کا دل دیکھے
تو آ اور آگ پر رکھا ہوا کباب دیکھ لے

مـــا وے زړه مـې سـتـــا د مخ پـه اور ورتـيـړی
دے وے پـرېـږده چې، بنـه وریت شي دا کبـاب

ترجمہ:- میں نے اپنی محبوبہ سے کہا ''میرا دل تیرے چہرے کی تپش سے جل رہا ہے۔
اس نے کہا اسے یونہی چھوڑ دو تا کہ یہ کباب اور بھی بھونا جائے۔

کـه د خپـلـو سپـو نـامـه وربـانـدې کېـږدې
خوار خوشحال بـه پـه عـالـم کښې سربلند کا

ترجمہ:- اگر تو خوشحال پر اپنے کتوں کا نام رکھدے
تو اسکا سر پورے جہان میں بلند ہو جائے

ستا سپیو سره ګرځم ستا کوځه کښې
کونــدې ماورسره ګڼه کړې په حساب

ترجمہ:- میں تیرے کتوں کے ساتھ ساتھ تیرے کوچے میں پھرتا رہتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید مجھے بھی انکے ساتھ حساب میں شمار کرلو۔

په ژړا مې ځنې خواست د سپینې خولې کړو
پــه خنــدائې وې چې څــه کــا دا ســړے

ترجمہ:- میں نے رورو کر اس سے سفید چہرے کا ایک بوسہ مانگا تو ہنس کر کہنے لگی کہ یہ مردوا کیا کر رہا ہے۔

په درست جهان به نه وی یو زما غوندې رسوا بل
ورځــم توره وکښلے چې مئین واؤرم پــه تــا بل

ترجمہ:- پورے جہاں میں مجھ جیسا رسوا شخص کوئی اور نہ ہوگا۔ کیونکہ جب بھی تم پر کسی کو عاشق ہونے کا سنتا ہوں تو اسکی طرف تلوار بدست چل دیتا ہوں۔

ایسے ہی چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

ترجمہ:- اس نے ابھی ابھی غمزے کا خنجر اپنی کمر سے لٹکایا ہے
معلوم نہیں اس سے رند کو کاٹا جائیگا یا زاہد کو

ترجمہ:- میں نے کہا ''میں تمہارے اس گورے حسین چہرے کا عاشق ہوں''
اس نے کہا ''خدا نے عاشقی بھی کیا سہل کردی ہے۔

ترجمہ:- از بک بھی ایسا شب خون نہیں مارتے

جس طرح تیری آنکھیں بے چاروں پر تاخت کرتی ہیں۔

شاعر ہو اور رقیب کا ذکر اسکے کلام میں نہ ملے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ رقیب روسیاہ کا ذکر شاعر کے کلام یا ادیب کے افسانے میں ضرور ملتا ہے۔ نہ ملے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آٹے میں نمک کی کمی رہ گئی ہے۔ تو پھر خوشحال کے کلام میں رقیب کے ساتھ مخاصمت کیوں نہ نظر آئے۔

پہ څۀ چل ئې ځائے نیولے ستا تر څنګ دے
د رقیب خبره مه منه بد رنګ دے

ترجمہ:- رقیب نے کسی حیلے سے تیرے پہلو میں جا بنالی ہے

تم اسکی کوئی بات مت مانو کہ یہ بدرنگ (اور جھوٹا) ہے۔

د رقیب ګونه چې بده شوه لیده دې
چې ته ماته په تولی کښې موسکیدلې

ترجمہ:- جب تم اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی تو تم نے دیکھا کہ رقیب کی حالت کتنی غیر ہو رہی تھی۔

یاره ته چې له اغیار سره خندا کړې
د خوشحال په لړمانۀ درومی چاړۀ

ترجمہ:- اے محبوبہ جب تو اغیار کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے۔ تو خوشحال کے

معدے میں چھری گھس جاتی ہے۔

ترجمہ:-وصال یار کے وقت رقیبوں سے امان چاہئیے۔ بہار کے موسم میں پریشان کرنے والی بے شمار کھیاں پھرتی رہتی ہیں۔

ترجمہ:- اگر تو یار کی تلاش میں ہے تو جا کر رقیبوں کو ڈھونڈ

گلاب کا پھول وہیں ہوتا ہے جہاں خار ہوتے ہیں

ترجمہ:- جب میں یار کے ساتھ بیٹھتا ہوں تو رقیب ہمیشہ مجھے بری نظروں سے دیکھتے ہیں۔کیا یہ اندھے نہیں ہو سکتے۔

ترجمہ:-رقیب کی برائی سے عاشق ایسا کاٹا جاتا ہے۔جیسے کتے اپنے دانتوں سے آدمی کو کاٹتے ہیں۔

بڑھاپے سے منسلک چند اور اشعار کا ترجمہ جن میں اپنی ذات پر طنز کے تیر برسائے ہیں:-

ترجمہ:- ستر سال سے گذر چکا ہوں۔کج چشم کو تو ایک کے دو نظر آتے ہیں میں ایک کو سات دیکھتا ہوں۔اگر میں اسی (۸۰) سال تک پہنچ جاؤں تو ظاہر ہے کہ ایک کے بیس دکھائی دینگے۔

تو معلوم ہوا کہ خوشحال کے ہاں مزاح کم اور طنز کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔انکی شخصیت میں سموئی صاف گوئی نے بھی انکے کلام میں ایسے اشعار کو جنم دیا ہے جو طنز' ہجو اور تمسخر کے زمرے میں آتے ہیں۔طنز و مزاح اور ہجو و تمسخر کے اس ملغوبے سے ہم خوشحال کی ایک نئی اور اچھوتی شخصیت کو ابھرتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔

غالب کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت

غالب کے دور میں مغلیہ سلطنت کی شمع حیات ٹمٹمانے لگی تھی۔ پھر غدر آیا یہ شمع ہمیشہ کے لئے بجھ گئی اور غالب نے ساٹھ سال کی عمر میں دلی میں انگریزی استعمار کی جھلک دیکھی۔ گو کہ وہ تیس برس پہلے ہی اسکی ابتدائی حکومت کا نقشہ کلکتے میں دیکھ آئے تھے۔ ان تمام واقعات وعوامل کے پیش نظر غالب کے ردعمل اور انکی شاعری اور نثر پر ان عوامل کے اثرات کا ہونا بھی لازم ہے۔ مگر جس چیز نے غالب کے کلام اور انکے مکاتیب کو متاثر کیا وہ انکی شخصیت تھی:۔

"وہ اپنے محبوب کی موت پر آنسو بہاتے ہیں مگر ان کی ساری عمر آنسو بہانے میں نہیں گذری۔ ایک شوخ اور آزاد طبیعت ان کے یہاں وہ لطیف حسن پیدا کر دیتی ہے جسے (Sense of humour) کہتے ہیں"۔

(آل احمد سرور "غالب کی عظمت")

غالب کی شاعری چار ادوار پر مشتمل ہے۔ جو آگرہ دہلی اور رامپور پر محیط ہیں۔ جہاں تک انکی شاعری میں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کا تعلق ہے تو یہ عناصر انکے چوتھے دور میں زیادہ نمایاں ہو کر تکمیل کو پہنچے۔ انکے مکاتیب بھی اسی چوتھے دور کی یادگار ہیں۔ یوں تو غالب کی اردو غزلوں اور قصیدوں کے اشعار کی تعداد پانچ ہزار کے لگ

بھگ بتائی جاتی ہے۔ مگر ان سے تقریباً اٹھارہ سو اشعار کا انتخاب کر کے دیوان غالب کے مختلف ایڈیشن چھپوائے گئے۔ جہاں تک دیوان میں شوخ اشعار کا تعلق ہے تو وہ میری تحقیق کے مطابق کم وبیش ڈیڑھ سو بنتے ہیں۔ ویسے تو آپ کو غالب کے اکثر اشعار میں شوخی وظرافت کی لطیف سی لہر دوڑتی نظر آئے گی۔

دوسری بات جو غالب سے متعلق خاص ہے وہ یہ کہ انکی نثر کا بیشتر حصہ مکاتیب پر مشتمل ہے اور یہ کہ ان کے مکاتیب میں سے شوخی وظرافت چھلک چھلک پڑتی ہے۔ یوں غالب برصغیر کے واحد شاعر و نثار ہوئے جنہوں نے نثر و نظم دونوں میں شوخی وظرافت کو برتا۔

''غالب کا اصل فن' اس کی شوخ نگاری تھی۔ اس کی غیر معمولی رسائی ذہن تھی۔ انداز بیان کی ندرت تھی اور اس کی شاعری کی یہ خصوصیت اس کے ہر صنف سخن میں پائی جاتی ہے''
(نیاز فتح پوری ''ولی بادہ خوار'')

شیلے نے کہا تھا:-

"Our Singerest Laughter With some pain is Frought"

جب ہم غالب کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں بیشتر شیلے کے خیالات پر پورا اترتے ہیں۔ بس اتنا ہے کہ انکے اشعار کو سمجھنے اور ان میں سے شوخی کے پہلو کو برآمد کرنے کے لیے قوت متخیلہ کا استعمال ناگزیر ہے۔

گو کہ غالب کے مکاتیب انکے آخری دور کی یادگار ہیں۔ لیکن ہم یہاں ان کا

ذکر انکی شوخ شاعری سے پہلے کرنا چاہیں گے:-

''غالب نے اپنے خطوں میں ظرافت کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت میں بے فکراپن نہیں بلکہ ظاہری خوش طبعی اور زندہ دلی کی تہہ میں بھی ان کے تجربات اور جذبات درد کام کر رہے ہیں۔ ان کی ظرافت کے سرچشمے ان کے درد و غم ہی سے پھوٹتے ہیں۔ درد اور ظرافت کا یہی اجتماع حقیقت میں کسی ادب پارے کو اعلیٰ ادب کا درجہ دیتا ہے۔ غالب کی ظرافت میں ان دونوں عناصر کا اجتماع ہے''

(ڈاکٹر سید عبداللہ ''غالب کی اردو نثر'')

جزئیات نگاری اور منظر کشی مرزا پر ختم ہے۔ میر مجروح کو لکھتے ہیں:-

''برسات کا حال نہ پوچھو' خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خان کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیگ کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے چھتیں چھلنی ہوگئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے''

سفید بالوں کے نکل آنے پر پیری کا تصور یوں دلایا ہے:-

''۔۔۔۔ جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے ۔۔۔۔ اس سے

بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کید دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی
اور ڈاڑھی بھی"

غالب کے مکتوبات اس قبیل کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اوپر کی یہ چند مثالیں دے کر مکاتیب غالب میں شوخی وظرافت کا باب بند کرتے ہیں۔ اور انکی شاعری میں ان اصناف کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سب سے پہلی بات جو غالب کے اشعار کی شوخی کے ضمن میں سامنے آتی ہے وہ یہ کہ وہ اپنے اشعار میں منظر کشی کرنے کے بادشاہ ہیں۔ مثلاً تصور کیجئے کہ غالب پیرانہ سالی میں اپنی عمر کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا ہے۔ اور گھوڑ سوار نے اپنے آپ کو اللہ توکل چھوڑا ہوا ہے۔ یہ منظر ذہن میں رکھتے ہوئے غالب کا منظر کش شعر ملاحظہ فرمائیں:-

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یا یہ منظر کہ عاشق ہجر سے تنگ آ کر خودکشی کی بجائے معشوق کے ہاتھوں قتل ہو جانے کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے سر پر کفن اور کمر سے تلوار یعنی آلۂ قتل باندھ کر سوئے معشوق چلا جارہا ہے اور اسکے لبوں پر یہ شعر ہے:-

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ فرمائیں گے کیا؟

جسمانی ناتوانی اور دماغی بدگمانی کی وجہ سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کے منظر میں شوخی کا پہلو ڈھونڈ یئے:-

اُدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

غالب کو کوچۂ یار سے بڑی رغبت تھی۔ اس ضمن میں ان کے متعدد اشعار موجود ہیں مگر کوچۂ یار یا محبوبہ کے گھر کے پتہ کو رشک کے ساتھ مربوط کر کے غالب نے جو شعر کہا ہے اسکی بات ہی کچھ اور ہے۔ عاشق کو رشک کی بنا پر گوارہ نہیں کہ کسی سے اپنی محبوبہ کے گھر کا پتہ پوچھیں کہ یوں دوسروں کو بھی اسکی محبوبہ سے دلچسپی پیدا ہونے کا ڈر ہے۔ تو لوگوں کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ محبوبہ سے ملنے کے لیے میں کس طرف جاؤں:

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

کوچۂ یار سے متعلق تمام ماحول یعنی محبوبہ کے گھر' اسکی مجلس' پاسبان' دربان' حتیٰ کہ محبوبہ کے پاس محبت نامے پہنچانے والے نامہ بر کا نقشہ غالب نے اپنے اشعار میں شوخی کی چاشنی کے ساتھ کھینچا ہے۔ چند نمائندہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

اُس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

بعد اک عمر ورع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

یار اور کوچۂ یار کے اردگرد ایک اور شخص بھی گشت کرتا رہتا ہے۔ اور وہ ہے رقیب روسیاہ۔ غالب نے مختلف زاویوں سے رقیب کا جائزہ یوں لیا ہے:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
ہوگیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

تا کرے نہ غمازی، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

غیر سے دیکھیے کیا خوب نبھائی اس نے
نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

بوسہ خاص طور پر مشرقی شعراء کا ہر دلعزیز مضمون رہا ہے جسے ہر ایک نے مختلف زاویوں سے برتا ہے۔ مگر غالب نے اس مضمون پر جتنے اشعار کہے ہیں وہ تقریباً سب کے سب طنزیہ ہیں اور ساتھ میں شوخی و ظرافت کی چاشنی بھی موجود ہے۔ ملاحظہ کریں:-

غنچۂ نو شگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

دکھا کر جنبش لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوق فضول و جرات رندانہ چاہئے

زلف، آنکھیں، بھوئیں، ابرو، رخسار، گردن اور کلائی وغیرہ کا بیان تو ہر شاعر کے کلام میں مل جائے گا لیکن غالب کی شوخیٔ طبیعت کا کیا کیا جائے کہ انہوں نے محبوبہ کے پاؤں کی بھی طرح طرح کی تصاویر اتاری ہیں۔ اور ایک شعر میں اپنے پاؤں پر بھی عجیب و غریب نظر ڈالی ہے:-

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیمتن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جب اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اللہ رے ذوق دشت نور دی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

جب بات چل ہی نکلی ہے تو بستر اور تکیے سے متعلق بھی غالب کی نکتہ آفرینی اور شوخ طبیعت پر اک نظر دوڑالی جائے:-

خوشا اقبال رنجوری، عیادت کو تم آئے ہو
فروغ شمع بالیں، طالع بیدار بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

غش آ گیا جو پس از قتل میرے قاتل کو
ہوئی پھر اس کو مری نعش بے کفن تکیہ

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن تکیہ

مرزا نہ صرف یہ کہ مشرب ممنوعہ کے بے طرح عادی ہو گئے تھے اور اسے اپنی ضروریات

زندگی میں سے سمجھتے تھے بلکہ ان کے کلام میں بھی مے نوشی پر بڑے جاندار اشعار ملتے ہیں جن میں طنز اور شوخی کی ہلکی سی لہر دوڑتی نظر آتی ہے:۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہوگئیں

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو
موج گل موج شفق، موج صبا، موج شراب

موج گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

کہاں مے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایکدن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایکدن

اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کوئی شخص کتنا حوصلے مند ہے اور کتنا جلدی دوسروں میں گھلنے ملنے والا ہے تو معلوم کرو کہ وہ شخص اپنی ذات پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتا ہے یا نہیں۔ معلوم نہیں کس کا یہ کہا کہاں تک درست ہے مگر مرزا غالب کی حد تک تو یہ سو فیصد صحیح اترتا ہے۔ وہ اپنی ذات پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

غالب نے اچھی خاصی تعداد میں ایسے اشعار چھوڑے ہیں جن میں وہ اپنی ذات کو طنز و مزاح یا غربت و مسکینی کا نشانہ بناتے نظر آتے ہیں۔

> ''مزاح کی طرح غالب کی طنز بھی لطیف ہے گو اتنی براہ راست یا سادہ نہیں۔ ان کے ہاں وہی بات جب تک سادہ اور براہ راست رہتی ہے ہلکے پھلکے مزاح کا نمونہ معلوم ہوتی ہے لیکن جہاں اس میں معمولی بھی خم آیا طنز کا تیکھا پن اور ظرافت کا ستم پورے طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس غیر معمولی اعتماد اور قابو کی مثالیں کوئی حالی سے پوچھے یا ان دوستوں سے جن کے نام غالب نے ہنس ہنس کر خطوط لکھے ہیں یا پھر ان مقطعوں میں دیکھے جن میں کسی نہ کسی بہانے کوئی نہ کوئی سخن گسترانہ بات آپڑی ہے''

(رشید احمد صدیقی ''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا'')

آیئے ہم بھی ایسے مقطعوں اور دوسرے اشعار سے لطف اندوز ہوں جن میں بظاہر غالب نے اپنی ذات یا اپنے ماحول پر چوٹ کی ہے مگر ایسا کر کے ہمارے لیے طنز و مزاح کا

سامان کر گئے:-

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

عشق نے غالب نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

دھول دھپا اس سراپہ ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی
بناکر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب ایک نہایت ہی صاف گو انسان تھے۔ اور انکی یہی تصویر اپنے دیوان کے متعدد اشعار سے بھی جھلکتی ہے۔ مرزا نے خدا پر تو طنز کیا ہی ہے۔ انکے قلم کی کاٹ سے فرشتے، پیغمبر، شیخ، محتسب اور زاہد کوئی بھی نہیں بچا۔ کعبہ، زمزم، حرم، دیر، کلیسا، مسجد، مندر اور خانقاہ پر بھی ان کی نظر کرم رہی ہے۔ چند ایک مثالیں پیش ہیں:-

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ترے سر و قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حضرت ناصح گر آویں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

غالب کو جوانا نیت اپنے خاندانی ماحول اور درباری رہتے کی وجہ سے ملی اس نے
ان کی شخصیت پر غیر مثبت اثرات ڈالے مگر ساتھ کے ساتھ انکو یہ حوصلہ بھی بخشا کہ وہ ہر غم
اور ہر مصیبت کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہوں اور نہ صرف اس غم کو سہا بلکہ ایسا کرتے
ہوئے ایک اطمینان اور ایک لطیف شوخی انکے لبوں پر موجود رہی۔ اور جب کبھی وہ اپنے

آپ کو جتانے کے موڈ میں ہوتے تو خودداری اور عزت نفس کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر مدمقابل کے سامنے آتے یہاں تک کہ اپنی معشوقہ کو بھی اکثر On the Defensive رکھتے۔

شوخی کے ضمن میں مجھے دیوان غالب کا جو شعر نہایت مرغوب ہے اس پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں:-

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

خوشحال و غالب

اقبال کی نظر میں

اس میں کلام نہیں کہ خوشحال، غالب اور اقبال زمانہ ساز شخصیتیں تھیں۔ اگر چہ ہم خوشحال اور غالب کا بلاواسطہ موازنہ کرنے نکلے ہیں مگر اس راستے میں اب ہم ایک ایسے مقام سے گذر رہے ہیں جہاں اقبال کی شخصیت بار بار ہماری نظروں کے سامنے آ رہی ہے۔ اسلئے کیا ہی اچھا ہو کہ ہم خوشحال و غالب کی شخصیتوں اور فن کو علامہ اقبال کی نظر سے پرکھیں۔ جو شاید ایک منفرد ادبی تجربہ ہو۔ باوجود یہ کہ اس سے پہلے خوشحال و اقبال اور غالب و اقبال کا موازنہ کسی نہ کسی طور کیا جا چکا ہے۔ آیئے پہلے خوشحال کو علامہ اقبال کی نظر سے دیکھیں:

خوشحال۔ اقبال کی نظر میں

میر عبدالصمد خان کی شہرۂ آفاق کتاب خوشحال و اقبال کے صفحۂ اول پر خوشحال و اقبال کے یہ دو اشعار لکھے ہوئے ہیں:-

خوشحال لکه باز په لوئے لوئے ښکار زما نظر دے
نه چې ګرځي ګونګټ نيسى باد خورك يم

ترجمہ:- میری نظریں باز کی طرح بڑے بڑے شکار پر ہوتی ہیں
میں کیڑے مکوڑے پکڑنے والا جانور نہیں ہوں۔

اقبال نگاہِ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے
شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

آگے چل کر اسی کتاب خوشحال و اقبال کے تعارف میں مندرجہ ذیل الفاظ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں:

"اقبال اور خوشحال کے زمانوں میں کم وبیش دوسوسال کا وقفہ ہے۔ اقبال کا حلقۂ فکر ونظر لازمی طور پر خوشحال سے وسیع تر ہے۔علوم جدیدہ سے ان کی کامل واقفیت اور عصر حاضر کے پیچیدہ ماحول نے ان کی نظم و نثر کو وہ گہرائی عطا کی ہے جس کی تلاش عہد عتیق کے کسی مصنف کی تخلیقات میں لا حاصل ہوگی۔تاہم اساسی طور پر دونوں (خوشحال و اقبال) کے افکار کا منبع وہی سرمدی سوتا ہے جو کم وبیش چودہ سوسال ہوئے ریگزار عرب میں سے پھوٹا اور جس کی آبیاری سے انسانی قلب ونظر کی پھلواری اب تک ہری بھری ہے۔اقبال اور خوشحال میں یہی وہ مشترک عنصر ہے جس سے فقر، خودداری، حریت

پسندی، بلند ہمتی اور سخت کوشی کی اقدار ان کے کلام میں رچی ہوئی نظر آتی ہیں''۔

(ڈاکٹر ایس اے رحمن جج سپریم کورٹ آف پاکستان' لاہور ۱۱ستمبر ۱۹۶۰ء)

اور اسی کتاب ''خوشحال و اقبال'' کے پیش لفظ کے یہ چند الفاظ بھی قابل توجہ ہیں:-

''حیرت و مسرت کی انتہا نہیں رہتی کہ آج سے تین سو سال پہلے ضلع پشاور کے ایک گاؤں اکوڑہ خٹک میں ایک اور شخص گزر رہا ہے جسے دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ پشتو کا اقبال بشکل خوشحال تھا یا تین سو سال بعد اردو کا خوشحال بہ شکل اقبال پیدا ہوا''۔

(محمد جعفر شاہ پھلواری، رفیق ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور' ۶۰-۶-۱۰)

تاریخ گواہ ہے کہ علامہ اقبال کو ملت افغان سے دلی محبت تھی۔ وہ اسے ایشیا کے دل کی حیثیت دیتے تھے:-

آسیا یک پیکر آب و گل است
ملت افغاں در آں پیکر دل است

ایک اور جگہ شاعر مشرق افغانوں کی فضیلت یوں بیان کرتے ہیں:-

''مقتدی تاتار و افغانی امام''

خوشحال کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک اور موقع پر ضرب کلیم میں علامہ نے افغان ملت کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے فرمایا:-

''اپنی خودی پہچان او غافل افغان''

اگر علامہ اقبال نے شاہ امان اللہ خان اور نادر شاہ شہید فرمان روایان افغانستان کی شان میں قصیدہ (۱) اور مثنوی (۲) کے اشعار لکھے اور خود نادر شاہ کی دعوت پر ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں مولانا سلیمان ندوی اور سرسید احمد خان کے نواسے سر راس مسعود کا ایک وفد لیکر کابل کا دورہ کیا تو یہ سب انکی اس تڑپ کے مظاہر ہیں جو وہ ملت افغان کے لئے رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ علامہ کے دوستانہ روابط اُسوقت کے وزیر تعلیم افغانستان کے ساتھ بھی تھے۔ جو خوشحال خان خٹک کی منظومات کے سلسلہ وار انگریزی تراجم علامہ اقبال کو کابل سے بھجوایا کرتے تھے۔ گو کہ اس سے پہلے علامہ نے انگریز مستشرق میجر راورٹی کی انگریزی میں ترجمہ کی ہوئی خوشحال کی سو کے قریب نظموں کا مطالعہ اپنے قیام جرمنی کے دوران کر رکھا تھا۔ اور ان سے متاثر ہو کر حیدر آباد دکن کے انگریزی مجلّہ ''اسلامک کلچر'' میں ایک مضمون بعنوان "The Afghan Warrier Poet" رقم کر چکے تھے۔ جس میں انہوں نے خوشحال کی شاعری اور شخصیت پر اپنی رائے کا جو اظہار کیا تھا اسے ڈاکٹر سید عبداللہ یوں بیان کرتے ہیں:-

''علامہ اقبال کے جس خیال نے مجھے اپنی طرف فوراً متوجہ کیا وہ یہ تھا کہ:-

''خوشحال خان کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کی روح کارفرما

---

(۱) پیام مشرق (۲) مثنوی ''مسافر''

نظر آتی ہے۔ جب ہم اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس میں بیان کی فطری اصلیت وصداقت کو واضح شکل میں دیکھتے ہیں۔ اس میں عرب شاعری کی طرح آزادی اور جنگ سے محبت کا اظہار ملتا ہے اور زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر اور تنقید کا رنگ ڈھنگ بھی ویسا ہی نظر آتا ہے۔"

یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کے دل میں عربی شاعری کی روح و آزادی وصداقت کی بڑی عزت تھی چنانچہ انہوں نے اسرار خودی کے دیباچہ میں معاصر شعراء کو عربی شاعری کی پیروی کی تلقین کی تھی اور فرمایا تھا:-

؎ رجعتے سوئے عرب می بایدت

ڈاکٹر سید عبداللہ آگے چلکر فرماتے ہیں:-

"جہاں تک مجھے معلوم ہے علامہ اقبال نے غالب (اور شاید قدرے نظیری نیشاپوری) کے سوا فارسی اور اردو کے کسی شاعر کو" یہ رتبہ عطا نہیں کیا جو خوشحال خان کو دیا"

(ڈاکٹر سید عبداللہ "خوشحال خان کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کی جھلک 'خوشحال نامہ'')

خوشحال کا کلام پڑھنے اور اس سے حد درجہ متاثر ہونے کے بعد علامہ اقبال نے نہ صرف افغان وزیر تعلیم کو خوشحال کی شخصیت اور شاعری پر مزید ریسرچ کے لیے کسی جید عالم کو مقرر کرنے کے لیے کہا بلکہ لاہور کی ریسرچ سکالر محترمہ خدیجہ فیروز الدین کو بھی خوشحال پر پی

ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کی تلقین کی۔ محترمہ خدیجہ نے یہ مقالہ لکھا۔ اور اس پر ان کو ۱۹۴۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔

خوشحال کا کلام پڑھنے کے بعد علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں اسے یوں خراج تحسین پیش کیا:-

خوش سرود آں شاعر افغان شناس
ہر کہ بیند باز گوید بے ہراس
آں حکیم ملت افغانیاں
آں طبیب علت افغانیاں
راز قومے دید و بے باکانہ گفت
حرف حق باشوخئ رندانہ گفت

اس کے علاوہ علامہ نے خوشحال کی وصیت کو بال جبریل میں یوں جگہ دی:-

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم
کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کم تر نہیں
کوہستاں کا یہ بچۂ ارجمند

کہوں تجھ سے اے ہمنشیں دل کی بات
وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مغل شہسواروں کی گرد سمند

خوشحال و اقبال کے نظریات اور فلسفۂ ہائے حیات

زیادہ تفصیل میں جائے بغیر ہم اتنا کہنے پر اکتفا کر سکتے ہیں کہ خوشحال اور اقبال دونوں نے اسلام کی تعلیمات سے استفادہ کیا تھا۔ اس لئے دونوں مسلمانوں کے اتحاد کے نظریہ پر متفق تھے۔ جہاں خوشحال نے مغلوں کے وقتی مظالم سے تنگ آ کر ملت افغان کو متحد کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اور افغانوں کے ننگ اور عزت کی خاطر اپنی کمر سے تلوار لٹکائی وہاں اقبال نے پوری مسلم ملت کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی۔ لیکن اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو خوشحال جس جغرافیائی اکائی کو مغلوں کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ وہ آج کے مغربی پنجاب صوبہ سرحد کابل قندہار اور کشمیر پر مشتمل تھی۔ جہاں ملت افغان کے افراد کم یا زیادہ تعداد میں آباد تھے۔

”علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کرتے وقت شمالی ہندوستان

میں مسلم اکثریت کے علاقوں کے علاوہ کشمیر اور افغانستان کو بھی اپنے تصور کا آزاد اسلامی ملک گردانا تھا جیسا کہ پاکستان کے حروف ''ک'' اور ''الف'' سے ظاہر ہے۔۔۔۔ خوشحال خان خٹک ساری عمر پختونوں کے اسی علاقے کے لئے لڑتا رہا جو آج پاکستان کا بازوئے بندوق زن کہلاتا ہے اپنے اس علاقے کے لوگوں کو موجودہ مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے کبھی جدا نہیں سمجھا۔ وہ پاکستان کے اسی حصے کو ہندوستان سے الگ اور آزاد رکھنا چاہتا تھا''۔

(میر عبدالصمد خان' ''خوشحال و اقبال'')

''جہاں خوشحال نے افغان قوم کے لیے ''پشتو'' پر قائم رہنا ضروری سمجھا وہاں اقبال کے ہاں خود شناسی اور خدا شناسی کے مجموعے ''خودی'' کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ ''پشتو'' چند اوصاف کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ اوصاف اسلام میں بھی پائے جاتے ہیں یعنی شجاعت' مردانگی' سخاوت' مہمان نوازی' غیرت' ہمت' اولالعزمی' استقلال اور ارادے کی پختگی لیکن ''پشتو'' کے نظریہ میں چند غیر اسلامی عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اقبال کی خودی ایک مکمل اخلاقی نظام کے نیچے فرد اور ملت کی تربیت کا نام ہے۔

اسی سلسلے میں خوشحال کی ''پشتو'' کے نظریۂ سے تنگیال مرد یا باتور (غیرت کرنے والا' عزت کے لیے جان پر کھیل جانے والا' تھوڑا بولنے والا' زیادہ عمل کرنے والا) وجود میں آیا تو اقبال کی خودی کے نظریہ سے مرد مومن (توحید کے راستے پر چلنے والا' مرد آزاد'

مرد قلندر' مرد کامل اور بندۂ مولاصفات) وجود میں آیا۔ علامہ اقبال اپنے مردِ مومن کی تعریف یوں کرتے ہیں:-

ہاتھ ہے اللہ کا ' بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا ' کارساز
خاکی و نوری نہاد ' بندۂ مولاصفات
ہر دو جہاں سے غنی' اس کا دل بے نیاز
اسکی امیدیں قلیل' اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب ' اس کی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو ' گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

خوشحال اپنے ننگیال کی ستائش یوں کرتے ہیں:-

ترجمہ:- مرد وہ ہے جو باہمت اور بابرکت ہو
وہ دوسروں کے ساتھ کھائے پیئے اور رہائش رکھے
جس کا قول پکا اور عہد عہد ہو
نہ تو دروغ گو ہو نہ ہی فریب کار
اور نہ ہی ظاہری طور پر پرتپاک ہو
خاموشی سے تھوڑا بولے اور زیادہ عمل کرے

اور غنچے کی مانند اسکا منہ بند ہو مگر سینہ چاک
اور جہاں پستی و بلندی کا ذکر آئے تو
بلندی میں آسمان ہو اور پستی میں خاک
باغ میں تازہ و شگفتہ پھول کی طرح ہو
جس پر سو بلبلیں منڈلاتی رہتی ہیں

غور کریں تو خوشحال کا ننگیال اور اقبال کا مرد مومن ایکدوسرے کے کافی نزدیک نظر آئیگے یہ اس لیے کہ دونوں نے اپنا تصور انسان قرآن پاک کی تعلیمات اور فلسفۂ توحید سے لیا ہے۔ اور اپنے اپنے رنگ میں پیش کردیا ہے"۔

(میاں سید رسول رسا" مقدمہ ارمغانِ خوشحال")

مرد مومن اور ننگیال کے علاوہ خوشحال کا باز اور اقبال کا شاہین بھی ایک جیسی صفات کے حامل ہیں۔ خوشحال بابا کہتے ہیں:-

نہ مچ یم نہ کارغہ یم چې پہ کرو مرو گرځم
یا باز یم یا شاهین یم پہ خپل ښکار مې زړه خرم دے

ترجمہ:- میں نہ مکھی ہوں اور نہ کوا کہ مردار چیزوں کے پیچھے پھروں۔ میں تو باز ہوں شاہین ہوں میرا دل اپنے شکار کو دیکھ کر خرم رہتا ہے۔

خوشحال و اقبال دونوں نے فلسفۂ ستیز اور سخت کوشی پیش کیا۔

چې ځرګنده سربازي کاندي د تورو
زه خوشحال خټک تر هسې هنر ځار شم

ترجمہ:- جب جنگ میں تلواروں کے ساتھ سر کی بازی لگائی جاتی ہے۔ تو خوشحال ایسے ہنر کے قربان جاتا ہے۔

اقبال:- بہ دریا غلط و با موجش در آویز

حیات جاوداں اندر ستیز است

اسکے علاوہ خوشحال و اقبال کی شاعری میں رجائیت، آرزو، جستجو، مدعا، حق گوئی اور بیباکی کے مضامین میں حد درجہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اغیار اور دوستوں کے لیے انسان کو کیسا ہونا چاہیے۔ اس موضوع پر ہمارے ان دونوں نابغہ شعراء کے خیالات کی ہم آہنگی ملاحظہ کریں۔ خوشحال بابا فرماتے ہیں:-

واغیار ته لکه کانې، موم و یار ته
په سختی او په نرمی کښې هغه زه یم
اهل شر ته د شاهین منګل پیدا کړه
اهل خیر و ته حلیم شه تر حمامَ

ترجمہ:- جو اغیار کے لیے پتھر اور دوست کے لیے موم ہو

سختی اور نرمی میں وہ میں ہوں

اہل شر کے لئے شاہین کا پنجہ پیدا کر

اور اہل خیر کے لئے کبوتر سے بھی زیادہ نرم ہوجا

اقبال:-

مصافِ زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر

شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا

ہمارے ان دونو شعراء کے نزدیک جنت کا تصور بھی تقریباً ایک جیسا ہے:-

خوشحال:-

زاهدان چې مونځ روژه کا جنت غواړي

ما خوشحال د مزدوريه طاعت نهٔ زده

ترجمہ:- یہ جو زاہد نماز روزے کے بدلے جنت کے خواہاں ہیں۔

مجھے اس قسم کی مزدوری اور اطاعت کرنی نہیں آتی۔

اقبال:- سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے

او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

آخر میں دو ایک عجیب اتفاقات کا ذکر کر کے اس مضمون کو سمیٹتے ہیں۔ کیا یہ ایک عجیب اتفاق نہیں کہ خوشحال اور اقبال دونوں نے شاعر نہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

خوشحال:- زه د شعر په کار هيڅ نه يم خوشحال

ولې خدائے مې کړو په غاړه دا مقال

ترجمہ:- میں شعر و شاعری کے کام سے خوش نہیں ہوں

مگر خدا نے یہ کام میرے گلے میں ڈال دیا ہے۔

اقبال:-

''میں نے اپنے آپ کو کبھی بھی شاعر نہیں سمجھا۔ مجھے شاعری کے فن کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر بھی میرے کچھ مقاصد ہیں جنکو بیان کرنے کے لیے میں نے اس وطن کے حالات اور روایات کی وجہ سے نظم کے ذریعے کو ترجیح دی ہے''

بہ حوالہ ماہنامہ ''دعوۃ'' اسلام آباد صفحہ ۲۸ نومبر ۱۹۹۹ء

(سہ ماہی ''پشتو'' پشتو اکیڈیمی پشاور نومبر-دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۱۷)

دوسرا عجیب اتفاق یہ ہے کہ خوشحال و اقبال دونوں نے اپنی موت سے پہلے پیشگوئی کے انداز میں اشعار کہے ہیں جو انکے آخری الفاظ کہے جاسکتے ہیں اور جن میں حد درجہ مماثلت پائی جاتی ہے۔

خوشحال:-

نه به زما غوندې بل ننګيالے راشي
نه به زما غوندې بل جنګيالے راشي
خټک لا پرېږده په درست افغان کښې
عجب که هسې فرهنګيالے راشي

ترجمہ:- نہ ہی میرے بعد میری طرح کا کوئی ننگیال آئے گا

نہ ہی میرے بعد میری طرح کا کوئی جنگجو آئے گا
خٹک قوم کا تو کیا کہنا بلکہ پوری افغان
قوم میں شاید کہ میری طرح کا کوئی دانشمند آئے

اقبال:-

نسیمے از حجاز آید کہ نہ آید
دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

اس مضمون کو ذیل کے اقتباس پر ختم کرتے ہیں:-

''خوشحال کی علمی' ادبی فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنی گوناگوں خصوصیات اور صلاحیتوں کے پیش نظر اتنا عظیم اور جینئس فنکار ہے کہ پورے ایشیا میں اُس کا ثانی پیدا کرنا محال ہے۔ تو بیجا نہ ہوگا۔ اس نے سب سے پہلے انسان کامل کا تصور' خودی کا فلسفہ اور شاہین کا سمبل پیش کیا۔ قوم کو بیدار کرنے کے لیے اس نے (ان) تین ستونوں پر اپنی شاعری کی عمارت اٹھائی۔ ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی شاعری بھی ان ہی بنیادوں پر استوار ہوئی ہے۔ یہ کوئی حسن اتفاق نہیں۔ بلکہ کھلی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال نے سب سے پہلے میجر راورٹی کے حوالے سے خوشحال کی نظموں کا اردو منظوم ترجمہ پیش کیا۔ اسی طرح خوشحال کے خودی کے

فلسفے کی شاہین کی علامت کو اسی کے پیش کردہ صفات وخصوصیات
کے ساتھ اپنایا اور ان سے ملت خوابیدہ کو بیدار کرنے کے لیے خاطر
خواہ کام کیا"

(فارغ بخاری' رضا ہمدانی' "خوشحال خان خٹک' تلاش اور منظوم ترجمہ" ص ۱۶' لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد' ص ۱۹۸۰ء)

غالب۔ اقبال کی نظر میں

خوشحال کو اقبال کی نظر سے دیکھنے کے بعد ہم غالب کی طرف آتے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے غالب نے اردو شاعری کو ایک نئے رنگ میں ڈھالا اور وہیں سے اردو کی جدید شاعری کی ابتداء ہوئی۔ اس کا اثر اردو غزل پر خاص طور سے پڑا جو حالی و اقبال سے ہوتا ہوا آج کے شعراء میں آ جھلکتا ہے۔ گو کہ اقبال نے غزل کو بھی نبھایا لیکن انکا اصل میدان نظم میں ہے۔ بہر حال جب غالب کا ذکر کرتے ہیں تو انکی انفرادیت انکے زور تخیل اور انکی فکر ہی کی مرہون منت سمجھی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال نے غالب کو اپنی عقیدت کا نذرانہ یوں پیش کیا ہے۔

فکر انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہمنشیں

تو کیا اقبال نے غالب سے فیضان حاصل کیا جس سے ظاہر ہو کہ اقبال کی نظر میں غالب کا کیا مقام ہے:-

''غالب سے صحیح معنوں میں اگر کسی نے فیضان حاصل کیا ہے تو وہ اقبال ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اقبال نے غالب کا تتبع کیا ہے۔ اقبال کی شخصیت غالب سے بالکل الگ ہے اور اتنی منفرد کہ ان کے بنیادی عناصر میں کوئی مشابہت نہیں۔ سر عبدالقادر مرحوم نے بانگ درا کا دیباچہ لکھتے وقت یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ''اگر میں سلسلہ تناسخ کا قائل ہوتا تو سمجھتا کہ غالب کی روح نے اقبال کے پیکر میں دوبارہ جنم لیا ہے''۔ یہ تنقید درست نہیں۔ اقبال نے غالب سے اسی طرح فائدہ اٹھایا ہے جس طرح انہوں نے ماضی کے تمام بلند پایہ شاعروں سے۔ انہوں نے اردو فارسی کے ادب عالیہ کی تمام زندہ روایات کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔۔۔۔ لیکن غالب کی طرف

انہوں نے اس لیے زیادہ رجوع کیا کہ غالب ہی اس وقت تک اردو میں اکیلے شاعر تھے۔ جن کے یہاں فکر کے عناصر ملتے ہیں۔ اقبال جو بات کہنی چاہتے تھے وہ ولی، قائم، میر، مومن یا خود ان کے استاد داغ کی زبان میں ادا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے لامحالہ غالب کے طرز گفتار سے انہوں نے فائدہ اٹھایا لیکن ان کی شخصیت اور ان کا وجدان بالکل غالب سے منفرد ہے۔ اس لیے موضوعات کے سلسلے میں انہوں نے نئی سمت سفر کیا"

(خلیل الرحمٰن اعظمی "غالب اور عصر جدید")

جاوید نامہ میں غالب کے متعلق اشعار، ان سے سوال و جواب اور ان کی ایک مشہور فارسی غزل کے منتخب اشعار کی نقل سے واضح ہوتا ہے کہ اردو شعراء میں اقبال سب سے زیادہ غالب سے متاثر تھے۔ وہ ان کو محض فنکار ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ سمجھتے تھے۔

زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

جب ہم انفرادیت پسندی کی بات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے پرانے دور کے شعراء کسی نہ کسی بند شاعر کی پیروی کرنے ہی کو شاعری کا کمال سمجھتے تھے۔ اس دور کے بڑے شعراء یعنی میر اور مومن کی بات ذرا مختلف ہے۔ انہوں نے اپنا الگ رنگ بنانے کی کوشش کی کہتے ہیں کہ غالب کی کامیابی کا راز ہی ان کی انفرادیت میں مضمر ہے:-

"نظم کے شعراء اپنی شخصیت اور انفرادیت کے اظہار سے زیادہ شغف رکھتے ہیں۔ اس انفرادیت پسندی کی ابتداء غالب سے ہوئی اور ہمارے ہاں کے جدید رنگ کے شعراء ابھی تک اسی نہج پر چل رہے ہیں۔ اقبال کی دنیا غالب کی دنیا سے کسی قدر مختلف ہے۔ ان دونوں میں واقعی بعد المشر قین ہے۔ غالب ہندوستان میں مغلیہ دور کے کلچر کا آخری ترجمان ہے اور اقبال مشرق میں مغربی فکر و خیال کا سب سے بڑا نمائندہ، مگر شاعری کو اپنی شخصیت اور انفرادیت کا عکس بنانے کے نقطۂ نظر سے اقبال نے غالب کی قائم کردہ روایت نباہی ہے"

(آفتاب احمد "اردو شاعری میں غالب کی اہمیت")

ایک اور خصوصیت جس کی وجہ سے اقبال نے غالب کے کلام کو پسند کیا وہ غالب کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کا رنگ ہے۔ ان کو ابتدائی عرب شاعری کا یہ رنگ پشتو، اردو اور فارسی کے شعراء میں سے خوشحال، غالب اور کسی حد تک نظیری نیشاپوری کے سوا کسی میں نظر نہیں آیا۔

اقبال کا مطالعہ اپنے زمانہ تک کے تمام انسانی علوم پر محیط ہے۔ اسی لئے مشرق و مغرب اور ماضی وحال کی بہت سی شخصیتیں اقبال کے زیر تجربہ آ ئیں۔ یہ سارے علوم و اشخاص اقبال کے فکری وفنی مقصود کے محض وسائل ہیں۔

"یہی سبب ہے کہ اقبال کے حلقۂ تاثر میں متنوع بلکہ متضاد شخصیتیں بڑے توازن کے ساتھ اسیر ہیں۔ چنانچہ دوسرے بے شمار لوگوں کی طرح غالب سے بھی انہوں نے اسی طرح اخذ کیا ہے۔ ان کا ذہن و مزاج اردو شعراء میں سب سے زیادہ غالب کے مماثل ہے۔ اس سے قطع نظر کہ غالب ہی کی طرح اقبال کا بھی اصل سرمایۂ فکر وفن فارسی میں ہے۔ یہ واقع ہے کہ ہمارے ادب کے ان دو عظیم ترین نابغوں کے تصور و تخیل میں بنیادی طور پر بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان چند اہم اوصاف مشترک ہیں۔ شوخی' اندیشہ' رفعت خیال' ندرت فکر' شوکت اسلوب' آتش نوائی' رعنائی تصور' مستی و تندی' ظاہر ہے کہ یہ مجرد اوصاف سیکھے نہیں جاتے بلکہ طبعی طور پر پائے جاتے ہیں"

(پروفیسر عبدالغنی (پٹنہ) "موازنہ اقبال و غالب")

باوجود ان تمام حقائق کے جناب شہرت بخاری کا خیال ہے کہ اقبال و غالب کا مقابلہ مشکل ہے۔ اگر چہ ان میں چند باتیں مشترک ہیں مگر وہ سطحی سی ہیں۔ غالب محض شاعر تھا اور اسکو اقبال کی طرح دنیا کو پیغام نہیں پہنچانا تھا۔

"بڑا فرق جو اقبال اور غالب میں محسوس کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ غالب جس قدر انسانی زندگی کو قریب سے دیکھتا ہے اقبال اس کا مشاہدہ

نہیں کرسکتا۔ اقبال کا تمام تجربہ کتابی ہے اس کی زندگی اور اسکے فلسفے
میں ایک خلیج حائل ہے مگر غالب زندگی کی تلخ ترین اور غلیظ ترین
حقیقت کی نقاب کشائی میں جھجک نہیں پاتا''

(شہرت بخاری ''غالب کی فارسی شاعری'')

مثال کے طور پر غالب و اقبال کے فارسی کلام سے جنت کے متعلق ان اشعار سے دونوں کے فکروفن کا موازنہ ہوجاتا ہے:۔

غالب:

در آں پاک میخانہ بے سروش
چہ گنجائش شورش و نائے نوش

اقبال:۔

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

یہی شعری موازنہ ہم غالب و اقبال کے اردو کلام میں بھی کرسکتے ہیں۔ اسکے لیے موضوع تو بہت سے ہوسکتے ہیں۔ لیکن ہم یہاں چند ایک پر اکتفا کریں گے:۔

''فلسفہ جزوکل کا ذکر ہو تو غالب کے ہاں ''جز'' اپنے ''کل'' میں شامل ہونے کے لیے بے قرار ہے کیونکہ وہ اسی کا حصہ ہے اور اسی سے جدا کیا گیا ہے۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے وہ دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

مگر اقبال کے ہاں ''جز'' ''کل'' کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتا ہے۔

تو ہے محیط بیکراں' میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

(پروفیسر افضل حسین اظہر ''غالب و اقبال کی ہم آہنگی'')

تصوف کا موضوع غالب و اقبال دونوں کے ہاں موجود ہے۔ پہلے غالب کو لیجئے:-

''وحدت الوجود کے نظریئے کا اثر غالب پر اتنا گہرا ہے کہ اسے کسی طرح رسمی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس کا تجربہ کرنے سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ غالب اس کی طرف دل کی بجائے ذہن کے راستے سے آئے لیکن اسے ذہنی طور پر قبول کرنے کے بعد انہوں نے اس سے جذباتی وابستگی بھی پیدا کی کیونکہ اس کے بغیر مسائل تصوف کے بیان میں وہ جوش نہیں پیدا ہوسکتا تھا جو مثال کے طور پر ان کے اس شعر میں موجود ہے:-

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں'

(ابو محمد سحر ''غالب کا فلسفہ'')

اور اقبال کے ہاں تصوف کا یہ رنگ ہے:-

''اقبال کی بال جبریل کی غزلوں میں تصوف رچا ہوا ہے۔ اسی تصوف کی بدولت اقبال کی شاعری مین ایک مفکرانہ سنجیدگی اور ایک پاکیزہ تاثر پیدا ہوگیا ہے۔ اقبال سے پہلے ہمارے غزل گو شعراء کے تصوف میں ایک چیز کی کمی تھی وہ یہ کی اجتماعی زندگی کے ارتقاء پر تصوف کی روشنی نہیں ڈالی گئی تھی۔ اقبال کے متعدد اشعار واقعیت اور روحانیت کے اس امتزاج کا پیش خیمہ ہیں جس کے لیے انسانیت آج گوش برآواز ہے۔ معرفت الٰہی حاصل کرنے کے لیے حواس ظاہری کی ضرورت نہیں بلکہ اسی کے لیے حواس خمسہ باطنی کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے:-

مشام تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن وتخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری
ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی''

(پروفیسر افضل حسین اظہر ''غالب اور اقبال کی ہم آہنگی'')

جب ہم کسی شخص کے لب ولہجہ کی بات کرتے ہیں تو اسکی شخصیت سے اسکا تعلق ضرور بنتا ہے اور شخصیت پر اس شخص کے ارد گرد کے حالات کا۔ غالب و اقبال کے شاعرانہ لب ولہجہ میں

بڑی مماثلت پائی گئی ہے۔ غالب نسلاً ترک تھے۔ اس لیے ترکوں کی تمام خصوصیات انکی شخصیت پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ وہ کسی کے سامنے جھک نہیں سکتے تھے۔ پر جوش تھے۔ وضعدار تھے آن رکھتے تھے۔ ان تمام خصوصیات کا اثر انکی شاعری کے لب ولہجہ میں صاف جھلکتا ہے۔ اردو میں بھی اور فارسی میں بھی۔ مگر پروفیسر یوسف زاہد کے مطابق فارسی میں ان کا یہ قاہرانہ و باغیانہ لب ولہجہ اور بھی تندی و تیزی اور جوش و استقامت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں تک اقبال کے شاعرانہ لب ولہجہ کی بات ہے تو غالب کے کلام کا عمیق مطالعہ اور انکی اپنی حساسیت اسکے محرک بنے۔

> ''بہر حال غالب کے لب ولہجہ کے یہ مختلف پہلو اردو شاعری میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی آواز میں جو قوت' صلابت' جوش' گرمی' یقین و اعتماد اور مردانہ قاہرانہ انداز ہے وہ ان کے بعد ہمیں اقبال ہی کی شاعری میں ملتا ہے۔ اور اقبال پر اس پہلو سے غالب ہی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ان کے لب ولہجہ میں بھی ایک گھن گرج' اثبات' خود داری' دلیری اور قاہری ہے لیکن غالب کی آواز اقبال سے کچھ زیادہ باغیانہ اور قوت و جبروت کی حامل معلوم ہوتی ہے''

(پروفیسر یوسف زاہد ''غالب کا شاعرانہ لب ولہجہ'')

غالب و اقبال کے نظریات اور فلسفۂ ہائے حیات

حقیقت یہ ہے کہ غالب محض ایک شاعر تھے۔ اور انکی شخصیت میں قوم کو کوئی پیغام دینے یا اسکے ضمیر کو جھنجوڑنے کا کوئی عنصر موجود نہ تھا۔ حالانکہ تاریخی طور پر انہوں نے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ اور انگریزی حکومت کی عملداری کی شروعات اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ انکی طبیعت کی شوخی اور انکی یار باشی کا جذبہ بھی انکی شخصیت کی بنت میں اہم مقام رکھتے تھے۔ اس زاویہ سے دیکھا جائے تو قوم کو پیغام دینے کے لحاظ سے ان کا کوئی نظریۂ حیات یا فلسفۂ حیات نہیں تھا لیکن انکا اپنی ذات کی حد تک ایک نظریۂ حیات ضرور تھا:-

> '' غالب کی شاعری کے لب ولہجہ کو ان کے نظریۂ حیات نے بھی ۹ تقویت بخشی جس کو بابر نے یوں بیان کیا ہے۔ ے بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست یعنی زندگی کی مسرتوں کے حصول میں پوری کوششوں سے کام لینا (لیکن اس سے مراد بے فکری اور بے بصری نہیں) اور یہی غالب نے کیا''

(پروفیسر یوسف زاہد ''غالب کا شاعرانہ لب ولہجہ'')

اس کے برعکس اقبال ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور مسلمانانِ عالم کے لیے بالعموم اتحاد و یکجہتی کا پیغام لے کر اٹھے۔ وہ ایک طرف مسلمانانِ ہند کو انگریزوں اور

ہنود کے تسلط سے چھڑا کرانکے لیے اپنے ایک خطۂ زمین کے خواب دیکھتے تھے۔ تو دوسری طرف اسلامیان عالم کو ایک ملت کے پلیٹ فارم پر لا کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے مسلمانوں کی روحانی تربیت کرنے کی ٹھانی اور ایسا کرنے کے لیے خودی، مرد مومن اور شاہین کا تصور پیش کیا۔ یوں انہوں نے اپنی پوری شاعری کو اس مقدس فریضہ کو پورا کرنے کے لیے وقف کردیا۔ اس مقام پر آ کر ہمیں غالب و اقبال کے کلام میں جھانک کر دونوں کی ہم آہنگی کا جائزہ لینا ہے:-

> "فن کے بحیثیت فن کچھ تقاضے ہیں۔ جن سے عہدہ برآ ہونے والے شعراء یقیناً ایک مشترک راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے غالب اور اقبال کو بھی ایک دوسرے کے برابر لا کر دیکھا جاسکتا ہے۔ غالب کی بیشتر شاعری عشقیہ ہے۔ اقبال کی شاعری کا صرف ایک حصہ عشقیہ ہے اور بیشتر غزلوں کی روح تصوفانہ ہے۔ غالب کے ہاں تصوف کسی باقاعدہ رجحان کی صورت میں نہیں ہے۔ مختلف اسالیب میں کہیں کہیں منتشر مضامین ہیں اور اس سلسلے میں دونوں شعراء کو اپنے سامنے لایا جاسکتا ہے"

(پروفیسر افضل حسین اظہر "غالب اور اقبال میں ہم آہنگی")

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش کے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا غالب

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں اقبال

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے غالب

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے اقبال

طاعت میں تار ہے نہ مے انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو غالب

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے اقبال

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں غالب

علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوک سوزن سے نکالے ہیں اقبال

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک غالب

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر اقبال

اس ہم آہنگی کے باوجود غالب و اقبال کے فنی اور جذباتی افق بالکل جدا بھی ہو جاتے ہیں:

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
وا ماندگی شوق تراشے ہے پنا ہیں غالب
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقش بند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں اقبال

بہر حال یہاں تک آ کر اب ہم یہ جان چکے ہیں کہ غالب کا زمانہ اقبال کے حالات سے مختلف تھا۔ اس لیے اقبال کے برعکس انکے پاس قوم کے لیے کوئی پیغام نہ تھا۔ دوسری طرف اقبال ایک نظریئے اور قوم کے لئے ایک پیغام لے کر آگے بڑھے۔ غالب و اقبال کی ہم آہنگی انکے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اقبال نے غالب کا مطالعہ کیا اور کسی بھی دوسرے اردو شاعر سے زیادہ وہ غالب ہی سے متاثر دکھائی دیتے ہیں:۔

"دونوں کے درمیان چند اہم اوصاف مشترک ہیں۔ شوخی' اندیشہ' رفعت خیال' ندرت' فکر' شوکت اسلوب' آتش نوائی' رعنائی تصور' مستی و تندی۔۔۔۔ان کے اشتراک سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال و غالب کی ذہنی ساخت اصلاً ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی۔ ان کے نفس کا میلان اور مزاج کا رنگ ایک سا تھا۔ خود آ گاہی' وسعت نظر'

لطافت تخیل کے سرمایہ دار دونوں تھے۔ خودسری' بے باکی' جدت و اختراع سے دونوں بہرہ ور تھے۔ ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ دونوں کا شعور فلسفیانہ اور ذوق عاشقانہ تھا۔ چنانچہ دونوں ''درائے شاعری چیزے دگر'' کے قائل ہیں اور شاید اسی ''پیغمبرانہ'' احساس کے سبب ایک خود کو ''عندلیب گلشن نا آفریدہ'' اور دوسرا اپنے بارے میں ''من شاعر فرداستم'' کہتا ہے''

(پروفیسر عبدالغنی (پٹنہ) ''موازنہ اقبال وغالب'')

خوشحال وغالب

اپنے اشعار کے آئینے میں

خوشحال وغالب جیسی عالی شخصیتوں سے قطع نظر جب دو عام شخصیتوں کا بھی موازنہ کرنا ہو تو احسن طریقہ یہی قرار پایا ہے کہ ان شخصیات کے موافق اور مخاطب ہر دو پہلوؤں پر روشنی ڈال کر انکا موازنہ کیا جائے۔ اس لیے جب ہم خوشحال وغالب کے کلام کا موازنہ کرنے چلے ہیں۔ تو ان دونوں کے کلام میں فکر موافق اور فکر مخالف کا جائزہ لینا ہوگا۔ اور اس باب میں ہم نے یہی وطیرہ اختیار کیا ہے۔ دنیا میں کوئی دو شخصیتیں بھی بالکل ایک جیسی پیدا نہیں ہوتیں۔ شخصی خصوصیات میں فرق فطری ہے۔ اور یہی اس جہان رنگ و بو کی بوقلمونی کا ثبوت ہے۔ اسلئے ہم دو شخصیتوں میں شخصی اور فنی ہر دو میلانات میں موازنہ کر کے انکی موافق اور مخالف خصوصیات کو پرکھ کر آشکارہ کرتے وقت قدرت کی شان کو اجاگر کر رہے ہوتے ہیں۔ آیئے اب خوشحال وغالب کے اشعار کی روشنی میں قدرت کے اس کمال کا جائزہ لیں۔ جہاں اس باب میں دیئے گئے اشعار کے لیے دونوں شعراء کے دیوان وکلیات کی چھان پھٹک شامل ہے۔ وہاں اس ریسرچ کے دوران مجھے جناب محترم ڈاکٹر درویش خان یوسفزے کے اس مقالہ سے بہت مدد ملی جو انہوں نے خوشحال اور غالب کے عنوان سے لکھا اور پشتو سہ ماہی تاترہ پشاور اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۱ء میں چھاپا

گیا۔ اس مقالہ کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اس دشت کی سیاحی میں نوے کی دہائی سے مصروف رہے ہیں۔ بارے انکی یہ کاوش میرے بہت کام آئی۔ جس کے لیے میں انکا ممنون احسان ہوں۔ عجیب اتفاق ہے کہ اپنی اس موجودہ تصنیف ''موازنہ خوشحال وغالب'' کی شروعات میں نے بھی ۱۹۹۴ء میں کیں۔

تقابلی مطالعہ (ہم آہنگی فکر)

خوشحال	غالب
صورت گرچي بـه صورت په ديوال ساز كه كل عـالـم ئـي پـه صفت زبان دراز كا	نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
ترجمہ:۔ جب مصور دیوار پر کوئی اچھی تصویر بناتا ہے۔ تو لوگ اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔	

نوٹ:۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے عرض ہے کہ خوشحال کا یہ شعر ان کی اُس پہلی غزل کا پہلا شعر ہے جو منتخبات خوشحال خان خٹک میں چھاپی گئی۔ ادھر غالب کا مندرجہ شعر بھی انکے دیوان کی پہلی غزل کا پہلا شعر ہے۔

په درون کښې مې پراته دي ډېر ګنجونه
په معنی کښې لکه کان د سیم و زر یم

ترجمہ:- میرے درون میں بہت بڑے گنج (خزانے) چھپے ہوئے ہیں۔ (اسلئے) معنٰی کے لحاظ سے میں سیم و زر کی ایک کان ہوں۔

گنجینہ معنٰی کا طلسم اس کو سمجھیئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

دا عالم لکه طفلان ورته ښکاریږي
د طفلانو په بازي پورې خندا کا

ترجمہ:- عارف کو یہ دنیا بچوں کا ایک تماشہ نظر آتی ہے۔ جس پر وہ ہنستا ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

پلار نیکه مې شهیدان و ګور ته تللی
پشت پهٔ پشت مې هنر دادی آل په آل

ترجمہ:- میرے باپ دادا سب شہید ہوئے ہیں۔ میری کئی پشتوں سے بڑوں اور چھوٹوں سب میں یہ کمال پایا گیا ہے۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

د الهام غندې خبر وي چې رادرومي
چې زما په زړۀ نزول کا لا يزال
ترجمہ:- اک بات ہوتی ہے کہ جسے خدئے پاک بالکل الہام کی طرح میرے دل میں اتارتا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

ءُ

له دې خاورو نه چې ګل ريږي خوشحاله
دا په دا چې تل ور درومي ماه جبينې
ترجمہ:- اے خوشحال اس مٹی سے یہ جو پھول نکلتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ بڑی مہ جبین حسینائیں اس کے تلے دبتی رہی ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

چې يو زمان له ستر ګو جدا کيږي
د خوشحال په مخ د اوښکو ځي رودونه
ترجمہ:- جب محبوب ایک لمحے کے لیے بھی خوشحال سے جدا ہوتا ہے تو خوشحال کے چہرے پر آنسوؤں کی نہریں بہنے لگتی ہیں۔

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

ددې کلي طبيبان واړه ناترس دي
د دارو په طمع مه اوسه بيمار
ترجمہ:- اے بیار دوا کی امید میں نہ رہ کہ اس گاؤں کے تمام طبیب ناترس ہیں۔

کہیں حقیقت جانکاہی مرض لکھیئے
کہیں مصیبت ناسازئی دوا کہیئے

هیڅ حجت له هیچا مه کوه خوشحاله
هر چې تاوته ځوک وائي ته هغه
ترجمہ:-اے خوشحال تو کسی سے کچھ حجت نہ کیا کر۔تم وہی ہو جو لوگ کہتے ہیں۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

د صبا باده ګذر په چمن بیا کړه
په چمن کښې رنګا رنګ ګلونه وا کړه
ترجمہ:- اے بادصبا تو پھر چمن پر گذر کر۔اور چمن میں رنگا رنگ پھولوں کو وا کر۔

ہاں نشاط آمد فصل بہاری واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

چې ئې سورے ووپه ما لکه بادشاه ووم
همائی وه ستا د تورو زلفو سیورِ

نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

ترجمہ:- جب تک مجھ پر تیری کالی زلفوں کا سایہ رہا تو میں بادشاہ کی مانند تھا۔ کیونکہ تیری کالی زلفوں کا سایہ ہمہ گیر تھا۔

د صبا پـه بـاد نشاط وی د گـلـونـو
کـه جنبـش کـا د بلبل له شور و شره

ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

ترجمہ:- پھولوں کو بادِصبا سے نشاط ملتی ہے۔ یا یہ پھول بلبل کے شور سے جنبش میں آتے ہیں۔

خدایه هومره ژوندون ورکړه په جهان کښې
چې کـاږهٔ کـارونـه سم کاندی خوشحال

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ترجمہ:- اے خدا تو خوشحال کو اتنی عمر دے کہ وہ اپنے پیچیدہ کاموں کو پایۂ اختتام تک پہنچا سکے۔

د تقوىٰ پـه کـاروبـار بنـه خبـردار يم
ولې څه کرم چې نصيب مې ګمراهي شوه
ترجمہ:- میں تقویٰ کے کاروبار کا بخوبی علم رکھتا ہوں۔لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میری قسمت میں گمراہی لکھی ہوئی ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

چې ئې زړه ترکانې سخت دے پرې مين شوم
لاس دې نـه شـي د سـرې تـر کـانـي لانـدې
ترجمہ:- میں ایک سنگدل پر عاشق ہوا ہوں۔کسی کا ہاتھ پتھر کے نیچے نہ آئے۔

مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت
دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے

دا اوږده اوږده غـمـونـه پـريـشـانـي
چې زما دي دا ئې خوى راغے د څنيو
ترجمہ:- میرے لیے لمبے غم اور پریشانی اسکی زلفوں کی دین ہے۔

تو اور آرائش خم و کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

زاهدان چې مونځ روژه کا جنت غواړي
ما خوشحال د مزدوریه طاعت نه زده
ترجمہ:- یہ جو زاہد نماز روزے کے بدلے جنت کے خواہاں ہیں مجھے اس قسم کی مزدوری اوراطاعت نہیں آتی۔

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو

خوشحال که نبی نه دے نصیحت خو ئې خوار مه کړه
الهام دے چې ئې وائي دا کلام په افغاني
ترجمہ:- گو کہ خوشحال نبی نہیں ہے مگر اسکی نصیحت کو تو مان۔ کہ وہ پشتو زبان میں جو کلام کہہ رہا ہے وہ الہام کا درجہ رکھتا ہے۔

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

د ساقي د میو هسې شان اثر وو
په خمار کښې مې دستار د سره خپور شو
ترجمہ:-ساقی کی شراب میں کچھ ایسا سرور تھا کہ خمار کی وجہ سے میرے سر سے دستار کھسک کر بکھر گئی۔

موج گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

نمر پہ کوم لوری پریوزی کوم خوا خیژی
پہ خوشحال باندې یوه شوه توره سپینه
ترجمہ:۔سورج کس اوڑ غروب ہوتا ہے اور کس طرف سے نکلتا ہے خوشحال کو کچھ نہیں دکھتا کیونکہ اس کے لیے سیاہ وسفید ایک ہوگئے ہیں۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

زړه چې خوږ دبنکلې مخ دمینې نه وي
پکښې مات شه د تیرهٔ توبرې سفال
ترجمہ:۔جو دل خوبصورت چہرے کا عاشق نہ ہوا اس میں تیز دھار تیر کی نوک کے ٹکڑے چبھیں۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

پـه کـالیـو سره مخ ښائستـه کیـږي
ستا پہ مخ ښائسته ستا د مخ کالي دي
ترجمہ:۔ زیورات تو چہرے کو خوبصورتی بخشتے ہیں مگر تیرے چہرے پر زیورات کی خوبصورتی تیرے چہرے کی وجہ سے ہے۔

ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

که ستا کو څه جنت سره څوک سمه راته کښيږدي
کوڅه به دې وطن کړم که دا عيب وي هم دې وي
ترجمہ:- اگر کوئی میرے سامنے تیرا کوچہ جنت کے مقابلے میں رکھ دے۔ تو میں تیرے کوچے کو اپنا وطن جانوں گا۔ اگر ایسا کرنا عیب ہے تو یوں ہی سہی۔

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

چې دې بلانې د قامت راته ښکاره شوه
ګويــه پـاڅيـده بـلا د قيـامـت
ترجمہ:- جب میں نے اسکے قد کی بلا کو دیکھا۔ تو گویا قیامت کی بلا جاگ اٹھی۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

چې دې سپين بارخو کبود کړم په چيچلو
اوس ئې نـه ګـڼې هالـهٔ بـه مې ګڼې
ترجمہ:- تم مجھے اب تو نہیں مانتی۔ مگر وہاں (خلد میں) مجھے مان جاؤ گی۔ جب میں تمہارے سفید رخسار دانتوں سے کاٹ کر سرخ کردونگا۔

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

وبـال ئـې تـول زمـا پـه غـاړه
فتوئے دعقل ده خو چې بدان وژنې
ترجمہ:- عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ تم جتنے بُرے لوگوں کو مارسکو۔اس کا سارا وبال میری گردن پر۔

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

ذرې تـه چې هسې بـریښې منوره
کـه خبـر ئـې دا بـریښنا دې ده د نمره
ترجمہ:- اے ذرے یہ جو تجھ سے روشنی چھلکتی ہے اگر تم جانو تو یہ سورج کی روشنی ہے۔

ہے تجلی تری سامان وجود
ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

ساقی نن زما په دور جام گردان کړه
گوره گانده به د چا دور گردان شی
ترجمہ:- ساقی آج تم میرے نام سے جام کا دور چلاؤ۔ کیا جانے آئندہ کس کے نام کا جام چلے۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

چي شوندي کيږدي د جام په مورګو
اوبه په جام کښې رُبِ انار کړي
ترجمہ:- جب وہ اپنے لال ہونٹ جام کے کنارے پر رکھتی ہے۔ تو جام کا پانی انار رنگ ہو جاتا ہے۔

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہ گل چیں ہے

خوار خوشحال په مرګی حال دے څنکدن کا
راشه ګوره په ايمان دليدو ستا مري
ترجمہ:- بے چارہ خوشحال قریب المرگ ہے اور نزع کی حالت میں ہے آؤ دیکھو ایمان سے تمہیں دیکھنے کے لیے مر رہا ہے۔

اسد ہے نزع میں چل بے وفا برائے خدا
مقام ترک حجاب و وداع تمکیں ہے

هم دي ووژلم پخپله هم بيا ګوره
بيا په ما باندي تېر وهي ماتم کا
ترجمہ:- ایک تو تم نے مجھے قتل کیا اور پھر سینہ کوبی کرتے ہوئے میرا ہی ماتم کر رہے ہو۔

غش آ گیا جو پس از مرگ مرے قاتل کو
ہوئی ہے اس کو مری نعش بے کفن تکیہ

په زړه مې هسې نال نې اے له دوه سترګو غائبه
کـه بـلـه نامـه اخلم نوم مې ستا راشي په ژبه

ترجمہ:-اے میری آنکھوں سے اوجھل محبوب تم میرے دل میں اسطرح سے سرایت کر گئے ہو۔ کہ اگر میں کوئی اور نام پکارنا چاہوں تو بھی میری زبان پر تیرا ہی نام آ جاتا ہے۔

یہ کہہ سکتے ہو تم دل میں نہیں پر یہ تو بتلاؤ
کہ جب دل میں تم ہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

تـل د تـن هـډونـه راوکـاږم پـه نـوکـونـو
غم ئې د ناوک خورم حيرې مات نه شي پيكان

ترجمہ:-اس ڈر سے کہ کہیں اس کے تیر کی نوک (میرے زخم میں) ٹوٹ نہ جائے میں اپنے تن کی ہڈیاں انگلیوں کی بجائے ناخنوں کی مدد سے نکالتا ہوں۔

دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

کله کله هسې وخت په سړي راشي
چې د ګلونو په کتل نه وي محظوظ

ترجمہ:- انسان پر کبھی کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے کہ وہ پھولوں کے دیکھنے سے محظوظ نہیں ہوتا۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کو موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

هیڅ په منځ کښې نیشته په خالي دوکان غوغا ده
ما چې فکر وکړو واړه وهم خوب وخیال دے

ترجمہ:- یہ دنیا ایک ایسی خالی دوکان کی مانند ہے جس میں کوئی چیز موجود نہ ہو۔ جب میں نے اس نکتے پر سوچا تو کھلا کہ یہ سب کچھ خواب وخیال ہے۔

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں صورت اشیاء مرے آگے

په بیمارو سترګو تل پهې کیښنوے شي
د خوشحال په لیمو ښپې کیږده ګستاخ

ترجمہ:- بیمار آنکھوں پر ہمیشہ روئی کے پاھے رکھے جاتے ہیں۔ اے گستاخ تو بھی خوشحال کی (بیمار) آنکھوں پر اپنے پاؤں رکھدے۔

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

دلیچن په سترګو وځلیدل ستوري
وعالم وته ئې چغې کړې چې نمر دے

ترجمہ:- دکھتی آنکھوں والے پر ستارے روشن ہوئے تو زور زور سے لوگوں کو بلا کر چیخا کہ سورج نکل آیا ہے۔

جادار بادہ نوشئ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

د منت دارو کـه مـرم پکار مې نه دی
کـه علاج لـره مـې راشي مسیحا هم
ترجمہ:- مجھے اپنی بیماری کے لیے منت کی دوا قبول نہیں چاہے میرے علاج کے لیے حضرت عیسیٰ بذاتِ خود تشریف کیوں نہ لے آئیں۔

دردِ منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

ما خوشحال وته په زوره ناري اوکړې
چاؤ ماؤ ته وئیل چې خوشحال نشته
ترجمہ:- میں نے خوشحال کو نعرے لگا کر بلایا کیونکہ کسی نے مجھے بتایا کہ خوشحال کہیں کھو گیا ہے نظر نہیں آتا۔

اے ساکنان کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

ډیرې مینې د خوشحال عقل خراب کړو
لکه نور کله هوښیار وو هسې نه دے
ترجمہ:- عشق کی زیادتی نے خوشحال کی عقل مار دی ہے ۔ وہ پہلے کی طرح ہوشیار نہیں رہا۔

عشق نے غالب نکما کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

نندارچي چي ورته گوري حيرانيږي
بازيگر چي پـه بازيو کښي بلا کا
ترجمہ:- جب بازیگر اپنے کرتب دکھاتے ہیں تو دیکھنے والا تماش بین حیران رہ جاتا ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

هميشه به په هند نه اوسې خوشحاله
عاقبت بـه عاصي ووزي لـه جحيمَ
ترجمہ:- اے خوشحال تم ہمیشہ ہندوستان میں (قید) نہیں رہو گے۔ انجام کار گنہ گار دوزخ سے نکل جائے گا۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جایئے

د دانش مارغهٔ مې هومره پورته لاړو
چې هوري د کتـه بازو پرواز نيشته
ترجمہ:- میری دانش کا پرندہ اتنی اونچائی اور رفعت تک پہنچ گیا ہے کہ جہاں جسیم اور تنومند بازوں کی اڑان نہیں پہنچ سکتی۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

زۀ خوشحال که لتا غوارم مستحق یم
خوله زکواة راکړه د حسن له نصابَ
ترجمہ:-حسن کے نصاب سے مجھے ایک بوسہ از راہ زکواۃ دے دے کہ میں خوشحال اس کا مستحق ہوں۔

زکواۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

چې نه مېنی نه معشوقه نه گشت دگلو
دغه عمر دے دغم او غرامت
ترجمہ:-نہ شراب ہو۔نہ معشوقہ ہو اور نہ ہی پھولوں کی سیر ہو تو یہی عمر غم اور تاوان کی ہے۔

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ کر اسد
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب

کار زما او د مجنون سره يو رنگ دے
لکه دوه لرگی په اور کښې سر په سر
ترجمہ:- میرا اور مجنون کا کام ایک ہی طرح کا ہے۔جیسے آگ میں جلتی ہوئی ساتھ ساتھ رکھی ہوئی دولکڑیاں۔

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستان پر

راز ئې ولې ښکاره وه ښه چې په دار شو
د منصور سزا تر دا وه لا بتره
ترجمہ:-منصور نے راز کی بات کیوں کھولی۔ اچھا ہوا کہ اسے دار پر چڑھایا گیا۔ بلکہ اس کی سزا تو اس سے بھی بدتر ہونی چاہئے تھی۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

د زاهد په صومعه کښې مې زړه تنگ شو
له دې پسې به خدمت د مے فروش کړم
ترجمہ:- زاہد کی صحبت سے میرا دل بے زار ہوگیا ہے۔ اس کے بعد میں اب (کسی) مے فروش کی خدمت کروں گا۔

کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

په هر مخ کښې ننداره د هغه مخ کړم
چې د ډيرې پيدايئ ناپديد شه
ترجمہ:- میں ہر چیز میں اسی ایک رخ زیبا کا نظارہ کرتا ہوں۔ جو کثرت شہود کی وجہ سے نامشہود ہوگیا ہے۔

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

هرتشنه چې د وحدت په سيند سيراب شه
نور هـمـه جهـان وده وتـه سراب شـه
ترجمہ:- جو پیاسہ ایک دفعہ دریائے وحدت سے سیراب ہوجاے۔تو پھر ساری دنیا اس کی نظر میں سراب بن جاتی ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

نـور خـوک نشتـه لانـدي بـانـدي
واړه ديے چـې شـه کـانـدي
ترجمہ:- اس (خدا) کے سوا کوئی بھی موجود نہیں۔تم کچھ بھی کرو۔وہ سب کچھ ہے اور ہر جگہ ہے۔

ہر چند ہر شے میں تو ہے
پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

هائے توبه دعشق د پټو سرو لمبو نه
نه ئې تاؤ شته نه ئې لوګے لګې په تا
ترجمہ:- ہائے توبہ عشق کے مخفی سرخ شعلوں سے کہ نہ تو ان کی تپش اور نہ ہی ان کا دھواں تجھے محسوس ہوتا ہے۔

دل مرا سوز نہاں سے بے محابہ جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

پیری راغلـه زبون شوم که څه نور څه علالت شو
چې زه کرم هغه نه شي هغه ملک هغه عالم دے
ترجمہ:- بڑھاپے نے مجھے زخمی و بے حال کردیا ہے
۔یا یہ کوئی اور بیماری ہے کہ جو میں چاہتا ہوں ۔ ویسا
نہیں ہوتا حالانکہ وہی ملک ہے اور وہی لوگ ہیں ۔

کردیا ضعف نے عاجز غالب
ننگ پیری ہے جوانی میری

چې هر یار ته مې تر خوله ویوست آواز
زر پـه واړه عـالـم خور شو هغـه راز
ترجمہ:- میں نے جس بھی دوست کو اپنی کوئی
بات بتائی تو بہت جلد پوری دنیا میں میرے اس
راز کا چرچا ہونے لگا۔

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے
یا بیاں کیجئے سپاس لذت آزار دوست

چې له هسې محبوبا خوشحال جدا شو
د آتـش لـمبې نـې دورمی لـه بسترا
ترجمہ:- جب سے خوشحال اپنی محبوبہ سے
جدا ہوا ہے۔اسکے بستر سے آگ کے شعلے
نکل رہے ہیں۔

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالب
کہ بے تابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

خوک چې سترګې غړوي له هغې وارو
ما په پټو سترګو ښې ننداري اوکړې
ترجمہ:- لوگ کھلی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتے ہیں میں نے بند آنکھوں سے اُن چیزوں کا خوب خوب نظارا کیا۔

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

کله ناز کله کنځل کړې کله مهر
د خوشحاله مروره که پخلا ئې
ترجمہ:- ایک بوسہ لینے پر تم خوشحال سے کس قدر ناراض ہو کہ کبھی ناز دکھاتی ہو کبھی گالی دیتی ہو تو کبھی مہربان ہو جاتی ہو۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ' ادا کیا

وې ئې در به کړم بوسه د نرو شونډو
رانزدې شوه رانزدې خو رائې نه کړه
ترجمہ:- محبوبہ نے مجھ سے کہا کہ تمہیں اپنے پتلے ہونٹوں کا بوسہ دیتی ہوں۔ وہ میرے نزدیک آئی اور نزدیک آئی مگر بوسہ نہ دیا۔

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

عـاشقـی کـه سراسر واړه بلا ده
مـا پـه ځان او زړۀ قبوله دا بلا کړه

ترجمہ:- گو کہ عاشقی سرتا پا ایک بلا ہے۔ مگر میں نے دل وجان سے اس بلا کو قبول کیا۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دا نن شپه چې په خوشحال د فراق راغله
ور دې نه شی هسې سخته په دشمن شپه

ترجمہ:- یہ جو آج خوشحال پر شب فراق آئی ہے۔ ایسی سخت رات خدا دشمن پر بھی نہ لائے۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا' اگر ایک بار ہوتا

گوره کوم لوری ته لاړو مونده نشی
د خوشحال د زړه پیدا چرته سراغ کړه

ترجمہ:- دیکھنا کہاں چلا گیا ہے۔ کہیں مل نہیں رہا۔ ذرا خوشحال کے دل کا سراغ تو لگاؤ۔

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

ستا د زلفو په تورتم كښې مې زړه ورک شو
چې ئې بيا مومم ښكاره د مخ چراغ كړه
ترجمہ:- میرا دل تیری زلفوں کے اندھیرے میں کہیں گم ہوگیا ہے۔ ذرا اپنے رُخ کا چراغ دکھاؤ کہ میں اپنا دل ڈھونڈ سکوں۔

ہورہا ہے جہاں میں اندھیرا
زُلف کی پھر سرشتہ واری ہے

هر چې نن د محبت په اور وراته شو
څــه پــرواه لــری د اوره د دوزخ
ترجمہ:- ہرکوئی جو محبت کی آگ میں جل چکا ہو۔ اسے دوزخ کی آگ کی کیا پرواہ۔

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوز غمہائے نہانی اور ہے

ولې ليـچې برينـډئي توره اوكاږي
كـه د خوارو د كشتن پـه آهنګ نـه ده
ترجمہ:- کیا اسے اپنے خوار عاشقوں کے قتل ہونے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ وہ کیوں اپنی باہیں ننگی کرکے (میان سے) تلوار نکال رہی ہے۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

غنچې ګل چې ستا د مخ سره سیالی کا
خوله ئې باد په طمانچه کړله فراخه

ترجمہ:- جس غنچۂ گل نے ترے رخ زیبا کی برابری کا دعویٰ کیا ۔ ہوا نے ایک طمانچہ مار کر اس کا منہ کھول دیا۔

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچہ و گل کا صدائے خندۂ دل ہے

که هر څو ئې په سور اور کښې لولپه کړې
د یاقوت د اوبو ډار د ګداز نشته

ترجمہ:- ہر چند کہ تم یاقوت کو آگ کے سرخ شعلوں میں پھینک دو ۔ اسے نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں۔

حیران ہوں شوخی رگ یاقوت دیکھ کر
یاں ہے کہ صحبت خس آتش برابر ہے

مغنی په چغانه دې لیندء کیږده
په نغمو په پردو وغوړه هر تار

ترجمہ:- اے مغنی اپنا ساز سنبھال اور اسکے ہر تار سے (فضا میں) نغمے بکھیر دے۔

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

په اختر په جمعه څه غرض زما
زه مجنون یم سرنیولے په صحرا
ترجمہ:- مجھے عید اور جمعہ سے کیا غرض میں تو صحرا میں سر پکڑ کر بیٹھا ہوا مجنون ہوں۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

تر ثرا تر ثریا کـه فهم اوکړي
په څلور کنجه غوغا د محبت ده
ترجمہ:- اگر غور کرو تو بلندی اور پاتال تک چاروں سمت محبت کا غوغا ہے۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

لږ د مهر د وفا خوي ونه زده کړه
د جفا خوي ونه ډېر درځخه شته
ترجمہ:- ذرا مہر و وفا کی عادت بھی ڈال۔ مانا کہ تیرے پاس جفا کی عادتیں وافر مقدار میں موجود ہیں۔

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

ګل چې ستا په لاسو درغے تازه شو
لاس دې لا شرف لرى د ګل تر شاخ
ترجمہ:- پھول جب تیرے ہاتھوں میں آیا تو تر و تازہ ہوگیا۔ تیرے ہاتھ شاخ گل سے زیادہ شرف رکھتے ہیں۔

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

جاهل سره ګلګشت لکه دوزخ دې
له دانا سره راضى يم کښې مې بند کا
ترجمہ:- جاہل کے ساتھ چمن میں جانا دوزخ کے برابر ہے۔ (مگر) دانا کے ساتھ مجھے لحد میں بھی اکٹھا بند ہو جانا منظور ہے۔

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی ہے دانا اسد
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

غم ئې نه دے پيدا کړے بې حکمته
د نامرد او مرد تر مينځه غم محک دے
ترجمہ:- خدا نے غم کو بغیر کسی حکمت کے پیدا نہیں کیا۔ غم مرد اور نامرد میں تمیز کرنے کی کسوٹی ہے۔

غم آغوش بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے

محـتسـب چې په احداد وو د مستانو
د رنـدانـو سره کښيناست باده خور شو
ترجمہ:- جو محتسب مستانوں کا دشمن تھا۔ وہ شرابیوں کی صحبت میں رہ کرے خور بن گیا۔

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

گـلـزار تـه راغـلـه گـلـونـه چونی
تـر مـخ ئـې نـه دی لالـه مخ رونی
چې کـور تـه درومـی لـه گـلستانه
گـل ئـې لـمـن نيسی لاله لستونی
ترجمہ:- وہ حسینہ گلزار میں آئی اور پھول چن رہی ہے لالہ کے پھول اسکے چہرے کی ہمسری نہیں کر سکتے۔ جب وہ گلستاں سے گھر واپس لوٹنا چاہتی ہے تو پھول اسکے دامن اور لالہ اسکی آستین سے لپٹ جاتے ہیں کہ ہم سے جدا مت ہو۔

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو وصنوبر
تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

جنت ځائے د پرهيزګارو دے خوشحاله
لـه جنت وتـه هوس پـه كوم عمل كړې
ترجمہ:-اے خوشحال جنت تو پرہیزگاروں کی جگہ ہے۔تم جنت کی خواہش کس عمل کی بنیاد پر کر رہے ہو۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

كه درست باغ د مئيو ډک و ماته كيږدې
تر همت پورې مې څـه دے يو خسنے
ترجمہ:- اگر شراب سے بھرا ہوا پورا باغ بھی میرے سامنے رکھ دو تو یہ میری ہمت کے سامنے ایک تنکے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

د خوشحال قدر كه اوس په هيچا نشته
پس د مرګ بـه ئې ياد كا ډېر عالم
ترجمہ:- گو کہ اس وقت خوشحال کی قدر کسی کو نہیں لیکن موت کے بعد اسے دنیا بہت یاد کرے گی۔

جو چاہیئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسف بقیمت اول خریدہ ہوں

ما وے زه به ئې عسل سره نسبت کرم
د دشنام ئې په بل پیر دے تلذز
ترجمہ:- میں نے سوچا کہ انہیں شہد سے نسبت دوں کیونکہ اسکی گالیوں میں ایک عجیب طرح کی لذت ہے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

د مانړے توره ئې څه توري پر بیاسي
چې په زړه ئې یو گذار وي سل پرهار
ترجمہ:- اسکے شکوے کی تلوار کیسے کیسے وار کرتی ہے۔ کہ دل پر چلتی تو ایک بار ہے مگر سو زخم چھوڑ جاتی ہے۔

بہ نیم غمزہ ادا کر حق و دیعت ناز
نیام پردۂ زخم جگر سے خنجر کھینچ

د گلزار گلونه څه دي راشه گوره
له گلونو خائسته دواړه رخسار
ترجمہ:- اگر یہ دیکھنا ہو کہ گلزار کے پھول کیسے ہوتے ہیں تو آ ؤ میرے یار کے دونوں رخسار دیکھو کہ پھولوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔

عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آئے اسد
جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

خوار خوشحال ئې لکه خس هسې لاهو کړو
چې د عشق سيلاب را او خوت لهر لهر

ترجمہ:- جب عشق کا سیلاب لہر لہر اٹھا تو بے چارے خوشحال کو خس کی طرح بہا کر لے گیا۔

میں نے روکا رات غالب کو وگر نہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

فکرِ مخالف

غالب	خوشحال
	چې مې خپل مین نیولے تر آغوش دے
مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا	د جهان هوس مې واړه فراموش دے
رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن تکیہ	ترجمہ میں نے جو اپنے محبوب کو آغوش میں لیا ہوا ہے تو ایسی حالت میں' میں نے تمام دنیا کی ہوس کو فراموش کر دیا ہے۔
	کہ مې شعر و شاعری سرگندولے
غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا	ما به دېر کړے د خپل بادشاه صفت وو
وہ دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں	ترجمہ:- اگر میں نے اپنی شعر و شاعری چمکائی ہوتی تو میں اپنے بادشاہ کی خوب خوب تعریفیں کرتا۔

خلقه زه د تورو زلفو ليونے يم
لا مې ښه په زنځيرونو وتړئ
ترجمہ:- اے لوگو میں سیاہ زلفوں کا دیوانہ ہوں۔ مجھے زنجیروں سے اور بھی کس کر باندھو۔

قید میں تھی ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گراں باریٔ زنجیر بھی تھا

زما زړه پــه دا دامـن دے
غم ښـادي دواړه تيـريـږي
ترجمہ:- میرا دل اس لئے حوصلہ مند ہے کہ غم اور خوشی دونوں گذر جاتے ہیں۔

ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے

دواړه شونډې دې خوږې شکرپارې دی
د گـلابـو گـل دې دواړه رخسـارې دی
ترجمہ:- اے محبوب ! تیرے دونوں ہونٹ شیریں شکر پارے ہیں۔ اور تیرے دونوں رخسار گلاب کے پھول ہیں۔

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن
دست مرہون حنا' رخسار رہن غازہ تھا

تـه مـحـبـوبـا كـه شيرينه ددې وخت ئې
زه خوشحال د اوسنى دور كوهكن يم
ترجمہ:-اگر تم اس وقت کی محبوبہ اور شیرین ہو
تو میں خوشحال موجودہ دور کا کوہکن ہوں۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

زۀ فـرهـاد د زمـانـې يـم
تـه شـيـريـنـه ددې دور
ترجمہ:- میں اس زمانے کا فرہاد
ہوں۔اور تم اس دور کی شیریں ہو۔

عشق ومزدوری عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو منظور نِکو نامئ فرہاد نہیں

ددې دور شیخان ډېر دي لوړ په لوړ
اورنګزیب باداشاه د وارو دے رنځور
په هغه چاړه قلم ساز کړه قرآن کښي
په هغه چاړه شه رګ پریکا د ورور

ترجمہ:-اس دور میں ہر جا شیوخ بیمار زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں لیکن ان میں سب سے بڑا شیخ خود اورنگزیب بادشاہ ہے۔ وہ جس چھری سے قرآن پاک لکھنے کے لیے قلم تراشتا ہے۔ اسی چھری سے اپنے بھائی کی شہ رگ بھی کاٹتا ہے۔

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

چې خوشحال ختک ئې وائي په پښتو ژبه خبرې
په فارسي ژبه به نه وی که یو هیرې سخن هسې

ترجمہ:-اگر تو سمجھے تو خوشحال خٹک پشتو زبان میں جو کچھ کہتا ہے وہ فارسی زبان میں کہاں۔

فارسی بین تابہ بنی نقشہائے رنگ رنگ
بگزراز مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

څهٔ سختې لرې خوشحاله
دا دې زړهٔ دے کـــه فــولاد

ترجمہ:-اے خوشحال تم کتنے سخت جان ہو۔ یہ تمہارا دل ہے کہ فولاد۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

د جهان غمونــه واړه پکښي ځائے شو
شکر دا چې ئې لوئې زړه راکړو ماهم

ترجمہ:- دنیا کے تمام غم اس میں سما گئے ہیں۔ شکر ہے کہ خدا نے مجھے بڑا دل عطا کیا ہے۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

چې پــه نـوم بـنـی آدم دی
پــه لا تــقـنطوا تـکـیــه ده

ترجمہ:- تمام بنی آدم کا ناامید نہ ہونے پر تکیہ ہے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

د ښادۍ پـه امیـد تـه اوسه په غم کښې
تل په شپه پسې رادرومی ورځ پیوسته

ترجمہ:-غم کے دوران خوشی کی امید میں رہو۔ کہ رات کے بعد ہمیشہ دن آتا ہے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

ترجمہ:۔"میں نے خوشحال کے دل کا خوب تماشا کیا جو سمندر (۱) کی طرح آگ کے شعلوں میں کھیلتا ہے"

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

ستا د ژبې د سر ډېر منت راباندې
چې دايم ئې رابرخيـر دے تلذذ

ترجمہ:- تو نے جو مجھے اپنی زبان کا بوسہ دیا ہے۔ اسکی لذت ہر دم ظاہر ہوتی رہتی ہے۔

رگ وپے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

(۱) ایک کیڑا جو آگ میں بھی زندہ رہتا ہے۔ اور راکھ میں رہتا ہے۔

باب سوئم

تنقید

خوشحال وغالب کے چند اہم محققین ونقاد

خوشحال و غالب کے چند اہم محققین و نقاد

غالب کے چند اہم محققین و نقاد

یوں تو غالب نے اردو میں کم و بیش پانچ ہزار اشعار کہے تھے۔ لیکن ان میں سے صرف اٹھارہ سو کے قریب اشعار کا انتخاب کر کے دیوان غالب چھاپہ گیا۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن یہ کانٹ چھانٹ غالب نے کی تھی۔ اور اسی لیے غالب خود اپنے پہلے نقاد ٹھہرے:-

"اگر تنقید و تخلیق کی ان دو دنیاؤں کو یکجا کیا جائے اور نقاد غالب کے تنقیدی شعور کی روشنی میں شاعر کے کلام' انتخاب کلام اور معیار کلام کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً ان دونوں شخصیتوں کی یہ ملاقات مفید ہو گی۔ نقاد غالب وہ ہے جو قتیل سے دست و گریباں ہوتا ہے۔ خسرو کے سوا ہندوستان کے کسی فارسی شاعر کے ذوق پر ایمان نہیں لاتا (یہ اور بات ہے کہ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے) اور مومن اور ذوق کے اچھے اشعار پر جھوم کر اپنا سارا دیوان ایک شعر پر نثار کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ خود اپنے دیوان کے متعدد بہ

حصے پر خطِ نسخ کھینچ دیتا ہے۔ شاعر غالب وہ ہے جو مذاقِ شعر کا اس درجہ قدردان ہے کہ شیفتہ کی داد اس کے لیے حاصلِ کلام ہے اور فضل حق کا علم و فضل اس کے نزدیک مسلم"

(ڈاکٹر محمد حسن "غالب کے چند اہم نقاد")

بعض دوسرے مخصوص حالات میں غالب کو اس وقت دوسروں کی تنقید کا نشانہ بننا پڑا جب وہ (غالب) ان دوسروں کی ادبی کاوشوں کے ناقد بنے۔ اس سلسلہ میں جو واقعہ بہت مشہور ہوا اس کی روداد پیش ہے۔ ایک دفعہ اپنی فارسی دانی کی بناء پر غالب کو کسی دوسرے مصنف کی تصنیف پر تنقید کے نتیجے میں عدالت تک جانا پڑا۔ ہوا یوں کہ جب غالب غدر کے زمانہ میں خلوت نشیں ہوئے تو ایسے میں کتب بینی ہی میں وقت گذارتے تھے۔

اتفاق سے فارسی کی مشہور لغت "برہان قاطع" پر غالب کی توجہ ہوئی۔ اور اس لغت میں ہزار ہا اغلاط پائیں۔ ہزار ہا بیان لغو نظر آئے اور عبارت کو پوچ پایا۔ پھر کیا تھا سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا اور "قاطع برہان" کے نام سے ۱۸۶۲ء میں چھپوا دیا۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ علمی دنیا میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ کچھ کتابیں "قاطع برہان" کی موافقت میں اور کچھ مخالفت میں لکھی گئیں۔ اس ضمن میں مولوی امین الدین کا رسالۂ 'قاطع القاطع' (جو قاطع برہان' کی مخالفت میں لکھا گیا تھا) گالیوں سے بھرا ہوا تھا۔

تب غالب نے ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ مولوی امین الدین کے خلاف عدالت میں دائر کر دیا۔ یہ مقدمہ ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء سے شروع ہو کر ۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو راضی

نامہ کی صورت میں ختم ہوا۔ یہ غالب کی موت سے تقریباً ایک سال پہلے کا واقعہ ہے۔

غالب کے بعد شیفتہ غالب کے پہلے نقاد ہیں' شیفتہ اس دور میں بھی غالب کی قدر کرتے تھے۔ جب غالب کو ناقدردانی کا سامنا تھا۔ شیفتہ روایت کے بھی قدر دان تھے۔ وہ غالب کے کلام میں روایت کی خصوصیات ڈھونڈتے تھے۔ اور یوں انہیں ظہوری اور نظیری کے درجہ پر لا کھڑا کرتے۔

غالب کے اگلے نقادان کے شاگرد مولانا حالی تھے۔ جنہوں نے ''یادگار غالب'' لکھ کر مرزا کو زندۂ جاوید کر دیا۔ اس زمانے میں مغربی علوم ہندوستانی سوسائٹی میں اپنی جگہ بنا رہے تھے۔ اسی لئے حالی نیچرل شاعری کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ ان دنوں ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی پر زور دیا جانے لگا تھا۔ اسی لیے ادب سے مقصدیت کے تقاضے کئے جا رہے تھے۔ نتیجتاً ادب کو اخلاق کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ اس تناظر میں حالی نے غالب کے کلام کو بھی اخلاقی نکتۂ نظر سے پرکھا۔ انہوں نے یہ بھی جاننے کی کوشش کی۔ کہ کیا غالب کا قوم کے نام کوئی پیغام ہے اور یہ پیغام قوم کی اصلاح کرنے میں کس طور ممد ثابت ہوسکتا ہے۔ کیا ان کے کلام میں روایت کے مقابلے میں جدت مضامین ہے۔ کلام غالب کے مطالعہ سے حالی نے جانا کہ روایت کے مقابلہ میں یہ ایک دوسرا ہی عالم ہے۔ یہاں خیالات کی طرفگی' ظرافت اور چونکا دینے والے استعارے اور کنائے اور ذومعنی اشعار پائے جاتے ہیں۔ اس میں نیا لہجہ ہے نئی فکر ہے یہاں اور ہی سماں ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری غالب کے وہ نقاد ہیں جنہوں نے یہ کہہ کر سب کو چونکا دیا کہ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ایک ''وید مقدس'' اور دوسری ''دیوان غالب'' کہتے ہیں کہ بجنوری نے غالب کے اردو اشعار کی تشریح و تفسیر کی ہے۔اور انہیں اپنی فلسفیانہ فکر کے ترازو پر تولا ہے۔اسے تنقید غالب نہیں کہہ سکتے۔بقول ڈاکٹر محمد حسن ''بجنوری کا مقدمہ تنقید غالب نہیں۔غالب کی خدمت میں نئی نسل کا خراج عقیدت ہے'' بجنوری کے نزدیک مضامین کا تنوع اور فکر کی وسعت غالب کے کلام کا بنیادی آہنگ ہے۔

چونکہ بجنوری غالب کے کلام کے تجزیہ کو ایک خاص Climax تک لے گئے تھے۔اس لیے ایک Anti-climax نے جنم لیا اور یہ غالب کے تیسرے نقاد ڈاکٹر سید عبداللطیف کی شکل میں منظر پر آیا۔دراصل ڈاکٹر لطیف کا ''غالب کی شاعری'' کے عنوان سے ایک مختصر انگریزی مقالہ بجنوری کی ہیرو پرستی کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔انہوں نے بجنوری کی رومانی طرز تنقید کو بالکل ناپسند کیا ہے اور غالب کے کلام کو پرکھنے اور اس کی شخصیت کا اندازہ لگانے کے لئے چند کڑے تنقیدی اصول قائم کئے ہیں۔نیز انہوں نے مغربی شاعری کے چند نمونے سامنے رکھ کر غالب کے کلام کو ان پر جانچا ہے۔ڈاکٹر لطیف کے مقالہ سے یہ چند الفاظ کتنے معنی خیز ہیں:

''کلام غالب کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ اس کا اصلی رنگ ذہنی اور دماغی ہے۔زندگی بھر شاعر کی یہ آرزو رہی کہ وہ فکر

واظہار میں اچھوتا معلوم ہو۔اور ایک لحاظ سے اس کا یہ مقصد پورا بھی ہوا۔لیکن اس سے اس کی شاعری ماری گئی۔اسکے اردو کلام میں شاعری سے زیادہ فن بلکہ صنعت گری نمایاں ہے۔اور احساس سے زیادہ فکر وتخیل یا خیال آرائی کے آثار پائے جاتے ہیں"

(ڈاکٹر سید عبداللطیف "غالب کی شاعری")

ڈاکٹر عبداللطیف کے نزد غالب کے کلام کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔پہلا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہے جن پر عقلی رنگ چڑھا کر پیش کیا گیا ہے:-

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

دوسرے حصے کے اشعار میں خیال آرائی اور ترکیب تراشی نمایاں ہیں:-

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

غالب کے کلام کے تیسرے حصے پر خالص وجدانی شاعری کا اطلاق ہوسکتا ہے۔کیونکہ زبان کے قلب میں جو شاعرانہ جذبہ جھلک رہا ہے۔ اس کو حقیقی طور پر شاعر نے محسوس کیا اور ان اشعار کو پُرتکلف صنعت گری سے پایہ جولاں نہیں کرتا:-

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ڈاکٹر عبدالطیف نے غالب کے کچھ اشعار کو لفظی کھیل سے زیادہ نہیں مانا اور ان میں پیش کئے گئے تصور کو معمولی قرار دیا ہے:

ہے پرے سرحد اوراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ڈاکٹر لطیف کے انگریزی مقالہ کے آخری الفاظ یہ ہیں:-

''یہ ہے کہانی ہمارے شاعر کی۔ اس نے ایک منتشر زاویہ نگاہ کے سایہ میں منتشر زندگی بسر کی اور ہمارے لئے ایسی شاعری چھوڑی جو خود ہم آہنگی سے معرا ہے۔ اس کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہو سکتا''

(ڈاکٹر عبدالطیف ''غالب کی شاعری'')

ڈاکٹر عبدالطیف نے کلام غالب سے متعلق اپنے خیالات کو جس نہج پر ختم کیا تھا۔ محمد اکرام نے اپنے خیالات کا ڈانڈا اوپر پر ملا کر غالب میں فلسفیانہ یک جہتی کے عدم وجود کا جواز ''غالب نامہ'' میں یوں پیش کیا:-

''ہر بڑا شاعر زندگی۔ اثر ڈالتا ہے۔ اور انتہائی شاعرانہ عظمت کے

معیار ہی میں انسانی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہوتی ہے۔ لیکن اس اثر اندازی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ شاعر کسی معین فلسفۂ زندگی یا پیغام کا حامل بھی ہو۔ یہی نہیں بلکہ دنیائے شعر میں انتہائی عظمت اکثر انہی لوگوں نے حاصل کی ہے۔ جنھوں نے انسانی عقائد اور زندگی کے فلسفوں کو تو نہیں چھوا لیکن اپنے کلام میں تخیل کی تربیت اور نشو و نما کا ایک ایسا سامان چھوڑ گئے جس سے انسانی فطرت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ ایک پہلو پر زور تو وہ دے جسے دوسرے پہلو نمایاں نظر نہ آتے ہوں''

(محمد اکرام ''غالب نامہ'')

ڈاکٹر اکرام غالب سے فلسفۂ فکر کا تقاضا نہیں کرتے بلکہ اسی کی کو غالب کے فن کا سب سے بڑا حسن قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق اکرام نے غالب کے مطالعے کے سلسلے میں سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی ہے کہ ان کے کلام کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ان ادوار کی بنیادی خصوصیات تلاش کیں۔ اکرام' مرزا کے کلام کی مقبولیت کے اسباب تنوع' تجزیہ اور طرز نو کو قرار دیتے ہیں۔

عہد جدید میں غالب کے نقادوں میں فیض احمد فیض نے کلام غالب میں ایک واضح اور نمایاں وحدت کی تلاش کرتے ہوئے ''اُداسی'' کو کلام غالب کی بنیادی کیفیت قرار دیا۔ اور ایک قدم آگے جاتے ہوئے اس اداسی کو ہماری پوری نسل کی اداسی سے جوڑ

دیا ہے۔

فیض کے بعد ڈاکٹر سید محمود اور قاضی عبدالغفار ہمارے عہد میں غالب کے نقاد ہیں۔ انہوں نے کلام غالب کے ڈانڈے اس کے اپنے عہد کی قومی ناہمواریوں کے ساتھ ملائے ہیں۔ ان کے بعد غالب کے جو قابل قدر نقاد منظر عام پر آئے وہ احتشام حسین اور آل احمد سرور ہیں۔

احتشام حسین نے اپنے مقالہ "غالب کا تفکر" میں دراصل یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ غالب کے کلام کی جدت ادا اور اس میں کے لاتعداد نئے مضامین کے سماجی عوامل کیا ہو سکتے ہیں۔ احتشام کے مطابق ان وجوہات کو غالب کے سفر کلکتہ سے جوڑا جا سکتا ہے کہ غالب کو اپنے اس سفر میں وہاں کے مغربی حکمرانوں کے سرمایہ کارانہ تصورات کو جانچنے کا موقعہ ملا۔ غالب نے اس نظام کے خلاف بنگالی عوامی طبقاتی کشمکش کا مطالعہ بھی کیا۔ اس طرح غالب کے ذہنی پس منظر اور دلی و لکھنؤ میں بیٹھے ہوئے انکے ہمعصر شعراء کی ذہنی سطح میں وہ فرق پیدا ہوا جو غالب کو اپنے ہمعصروں سے ممیز کرتا ہے۔ لیکن یہ تھیوری ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی کہ حقیقتاً کلکتے کا یہ سفر واقعی غالب کے تفکر میں وہ تبدیلی لا سکا جس سے انکے کلام پر اتنے انوکھے اثرات ہو سکتے تھے۔

آل احمد سرور نے کلام غالب کو صحت مند تشکیک کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ غالب ایسے د[illegible] تھے جب میں ایک طرف ہندوستان کی پرانی سماجی قدریں بدل رہی تھیں اور انکی جگہ بعض مقامات پر مغربی سرمایہ کاری نظام اپنے پنجے گاڑنے میں کامیاب ہو رہا تھا

غالب اپنی روایات سے مکمل طور پر کٹ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور نہ ہی وہ مکمل طور پر نئے نظام میں اپنے آپ کو ڈھال سکتے تھے۔ انکے سامنے مستقبل کی صورت واضح نہیں تھی۔ ان عوامل کا علاج ان کے نزدیک ایک ایسے صحت مند تشکک کی صورت میں ابھرا جس میں پناہ لیتے ہوئے وہ کبھی رند کبھی فلسفی اور کبھی قلندر کے روپ میں اپنی شاعری کا کردار بنے رہے۔ ساتھ میں انکو اپنی پرانی روایات کے مٹ جانے کا شدید احساس رہا۔

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

اسلوب احمد انصاری نے کلام غالب کا عمیق مطالعہ کر کے ان کی شاعری کے چند بنیادی عناصر پر ایک پرمغز مقالہ لکھا ہے۔ ان کے مطابق یہ بنیادی عناصر مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) فلسفہ (۲) معینہ اقدار و تصورات (۳) کائنات
(۴) عقیدہ وحدت الوجود (۵) تشکک (۶) نکتہ افرینی
(۷) پہلودار شاعری (۸) رمز بلیغ (۹) تخیل
(۱۰) قانونی اصطلاحات کا استعمال (۱۱) حسن کا احساس (۱۲) حکیمانہ مزاج
(۱۳) فکر اور جذبہ

یاد رہے کہ انصاری نے "چند" بنیادی عناصر کا ذکر کیا ہے۔ تمام کا ذکر ہونا ابھی باقی ہے۔

ماضی قریب اور عصر حاضر میں غالب کے محققین و ناقدین میں قاضی عبدالودود' ڈاکٹر عبدالستار صدیقی' مہیش پرشاد' مالک رام' امتیاز علی عرشی' غلام رسول مہر' مختیار الدین' حمید احمد خان اور سعود حسن رضوی کے نام سرفہرست ہیں۔ ظاہر ہے غالب جیسی نابغہ ہستی کے فن پر نقد و نظر کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ جس کو سرانجام دینے کے لیے بیسیوں محققین و ناقدین نہ صرف اس وقت اپنے کام میں مصروف ہیں بلکہ مستقبل میں بھی یہ کام جاری رہے گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج تک جو نقد و نظر کلام غالب کے حوالے سے ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں ابھی کافی تشنگی باقی ہے۔ یہ تنقید اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچے گی جب مرزا کے اس شعر کے مطابق ہم ان کے عہد اور ان کے فن کے ارتقاء کو جان جائیں گے:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

خوشحال کے چند اہم محققین ونقاد

اس سے پہلے کہ ہم خوشحال کے اہم نقاد کا ذکر کریں یہ بتادینا مناسب ہوگا کہ خوشحال خود بھی ایک اچھے نقاد تھے۔ انہوں نے اپنے کلام میں تو قطع برید نہیں کی مگر اپنے سے پہلے اور ہمعصر شعراء ادباء پر تنقید کی۔ اس صورت حال کو ہمایوں ہمدرد نے یوں سمیٹا ہے:۔

> "خوشحال کی شعری عظمت اور تنقیدی سوچ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ وہ ایک ایسے نقاد ہیں کہ خود پر بھی تنقید کرتے ہیں اور دوسروں پر بھی۔ انہوں نے اپنے عصر سے پہلے کے شعراء اور اپنے ہمعصر شعراء کے کلام میں گنجائش دیکھی تو اس پر تنقید کے تیر برسائے۔ لیکن خوشحال کسی پر بے جا تنقید برائے تنقید نہیں کرتے۔ جو کچھ کہتے ہیں اپنی بصیرت اور آگہی کی روشنی میں کہتے اور نڈر ہو کر کہتے ہیں۔ وہ اپنی تنقید میں کسی قسم کی مصلحت اور منافقت سے کام نہیں لیتے۔ ان میں ایک اچھے نقاد کی تمام خوبیاں موجود تھیں"

(ہمایوں ہمدرد "خوشحال خٹک کا تنقیدی شعور")

خوشحال کے تین بیٹے عبدالقادر خٹک، صدر خان خٹک اور سکندر خان خٹک صاحب دیوان شعراء گذرے ہیں۔ پوتوں اور پڑپوتوں میں افضل خان خٹک، سعید خان خٹک، کامگار خان خٹک اور کاظم خان شیدا پشتو شعروادب کے درخشاں ستارے تھے۔ بیٹی بی بی حلیمہ اپنے کلام کے لئے شہرت رکھتی ہے۔

خوشحال کے بیٹوں اور پوتوں پڑپوتوں کا ذکر اسلئے کیا گیا کہ ان میں سے اکثر نے اپنے باپ اور دادا (خوشحال) کے کلام پر اپنے خیالات کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے۔ یہاں چند ایک کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ خوشحال کے بعد خوشحال کی اولاد میں بھی انکے مؤرخ، محقق اور نقاد گذرے ہیں۔

اشرف خان ہجری نے خوشحال کی موت کی تاریخ اپنے فارسی قطعہ میں یوں نکالی:-

سال ہجران او اگر خواہی

موطن خیر، مجدد احسان بود

''موطن خیر'' سے خوشحال کی تاریخ وفات ۱۱۰۰ھ بمطابق ۱۶۸۹ء نکلتی ہے۔

خوشحال کے ایک اور بیٹے گوہر خان نے اپنے فارسی قطعہ میں خوشحال کی تاریخ وفات کے متعلق کہا:-

چوں ز تاریخ فوتِ خان خرم

شد ز ما رفت زیں جہاں پدرم

''ز ما رفت زیں جہاں پدرم'' سے بھی ۱۱۰۰ھ بمطابق ۱۶۸۹ء کی تاریخ نکلتی ہے۔

کلامِ خوشحال کی تعریف میں خوشحال خان کے سب سے بڑے پسر اشرف خان ہجری کا یہ شعر ملاحظہ کریں:-

تـول ئـې اوسپـارو پـه مـا سرير د نظم
هغه "نمر" چې نن دخاورو په بستر دیے

ترجمہ:-وہ سورج (خوشحال) جو کہ آج مٹی کے بستر پر ہے نظم کا سارا قلمدان مجھے سونپ گیا ہے۔

خوشحال کے ایک اور صاحب دیوان بیٹے عبدالقادر خان خٹک اپنے والد کی شاعری میں یوں رطب اللسان ہیں:-

دا غـزل پـه پښتـو ژبـه چې بيان عبدالقادر کړو
دروغـژن يم كه "بی خانه" وائی بل يو پښتون هسې

ترجمہ:- یہ غزل جو پشتو زبان میں عبدالقادر نے کہی ہے۔ مجھے جھوٹا کہنا اگر خان (خوشحال) کے علاوہ کوئی دوسرا پشتون ایسی غزل کہہ سکے"

خوشحال خان خٹک کی زندگی اور فن پر جو تحقیقی کام ہوا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر خالد خٹک کے مطابق "تاریخ مرصع" وہ پہلی کتاب ہے جس میں خوشحال کے فاضل پوتے افضل خان خٹک نے خوشحال کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب اب ۱۹۷۴ء میں جناب دوست محمد خان کامل کے حواشی کے ساتھ پشاور سے شائع ہوئی ہے۔ کاظم خان شیدا کی رامپور ہندوستان میں رہائش تھی۔ وہاں اس نے اپنے پردادا

خوشحال کا نام یوں زندہ رکھا:

د پښتو شعر معلوم وو
په معنیٰ کښې کالعدوم وو
چې قلم په لاس د "خان" شو
مرتب ئې لوئې دیوان شو
هر شاعر چې د افغان دے
ریزه چین د خان د خوان دے

ترجمہ:۔ پشتو کا شعر اصلی معنٰی میں معدوم تھا۔ لیکن جب خان (خوشحال) کے ہاتھ میں قلم آیا تو ایک بہت ضخیم دیوان مرتب ہوا۔ افغان (قوم) کا جو بھی شاعر ہے۔ وہ خان (خوشحال) کے خوان کا ریزہ چین ہے۔

مغربی مستشرقین

خوشحال خان کی اولاد کے علاوہ انکے دوسرے نقاد مغربی مستشرقین ہیں۔ان میں انگریز اہل علم سرفہرست ہیں۔جن کو اپنی حکمرانی کے دور میں کم وبیش اسی (۸۰) برس تک پشتون اقوام کے ساتھ رہنے سہنے اور اس دور ان پشتو زبان سیکھنے اور اس پر تحقیق وتنقید کرنے کا موقعہ ملا۔یہی وجہ ہے کہ پشتو کی اولین گرائمر اور ڈکشنری لکھنے کا سہرا بھی انہی مستشرقین کے سر ہے۔

''خوشحال کے احوال زندگی اور اسکے افکار پر تحقیق' تنقید اور ترجمہ کے کام کی ابتداء مستشرقین نے کی۔ان میں میجر راورٹی' سی ای بڈلف' ہنری بیلو' پادری ہیوز' اولف کیرو اور ڈاکٹر ڈی این میکنزی کے نام خصوصی ذکر کے حامل ہیں(ا)''

(ڈاکٹر محمد اقبال نسیم خٹک ''پیش لفظ خوشحال اور جمالیات'')

''اس فہرست میں ایسٹورٹ الفنسٹن سر ایولن ہاول اور چند روسی محققین کے نام بھی شامل

(ا) نوجوان محقق محمد زبیر حسرت کی تحقیق کے مطابق ان مستشرقین کی فہرست میں جے جی لوریمر (بچھو فرنگی)' مارگن سٹائن (ناروے) اور جینز ایولڈسن (عیسٰی گل) بھی شامل ہیں۔

(محمد زبیر حسرت۔جدید پشتو ادب میں تحقیق کی صورتحال) ' تاترہ جنوری-مارچ ۲۰۰۲ء

سمجھے جائیں۔

''خوشحال کے کلام کا انگریزی ترجمہ اور اس پر تنقید کرنے والے اولین مستشرقین میں میجر راورٹی کا مقام بہت اونچا ہے۔ میجر راورٹی نے خوشحال کے متعلق کہا ہے کہ ''مغرب کے شعراء کی طرح کوئی ایسا مضمون نہیں جو اس کے لیے بیگانہ ہو۔ شاعرانہ مضامین کے تنوع میں خوشحال خان مشرق کی نسبت مغرب کے شعراء سے نزدیک ہے اس کی شاعری کے لیے انسانی زندگی کا ہر پہلو ایک موزوں مضمون ہے۔ کیونکہ وہ انہیں قادرالکلامی کے ساتھ شاعرانہ اور ادبی رنگ میں پیش کر سکتا ہے۔ خوشحال اس صفت میں پشتو ادب کی ایک یکتا شخصیت ہے''

(سید رسول رسا ''مقدمہ ارمغان خوشحال'')

''میجر راورٹی پشتو کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ پشتو گرامر اور پشتو ڈکشنری ان ہی کی تصنیفات ہیں''۔

(شیر افضل بریکوٹی ''دبدبۂ خوشحال'')

میجر راورٹی نے Selection from the poetry of the Afghans میں خوشحال کی ۹۸ منتخب نظموں اور غزلوں کا انگریزی ترجمہ ۱۸۶۲ء میں شائع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال اسی ترجمے کے ذریعے خوشحال کے افکار سے متعارف ہوئے تھے۔ میجر راورٹی نے خوشحال کے ایک عشقیہ شعر کو انگریزی میں یوں ڈھالا ہے۔

خو شحال ختیک، چې بیا موندو لذت د یار د شوندو
ده وتــه نــور واړه د جهـــان خـــواږه ګـنــډيــر دی

"Since khushal khattak has drunk nectar from the lips of his beloved all the other sweets of the world are to him nauseous poison"

ڈاکٹر خالد خٹک کے مطابق کیمبرج یونیورسٹی کے سی ای بڈلف نے ۱۸۹۰ء میں خوشحال کے کلام کا دوسرا انگریزی ترجمہ کیا۔ اور Selection from the poetry of khushal khan khattak کے نام سے لندن سے شائع کیا۔ بڈلف نے خوشحال کے فن پر جو تبصرہ کیا ہے۔ وہ جناب مرشفق کی زبانی سنیئے :-

”خوشحال ایک ہمہ صفت ادیب تھے۔ انکی شاعری پشتون قوم کے اخلاق اور زندگی کا آئینہ تھی۔ انکی شاعری احساسات' ہمت اور شجاعت بھرے جذبات کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ خیالات اور روحانی افکار کا قابل قدر مجموعہ ہے“۔

(مرشفق ”زمانے کا غیر تمند خوشحال“) تاترہ اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۱ء ' ص ۱۴۱

ایک اور انگریزی عالم مونٹ اسٹیورٹ الفنسٹن نے بھی پشتو زبان میں تحقیق کا کام کیا۔ اس نے کلامِ خوشحال پر ان الفاظ میں تنقید کی ہے جس سے خوشحال کا ادبی مقام متعین ہوتا ہے:-

”خوشحال خان خٹک نے ایسی نظمیں تخلیق کی ہیں جن میں ہر قسم کے

اجتماعی واقعات کو جگہ دی گئی ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ خوشحال کی اپنی زندگی کی تصویر بھی منعکس ہوتی ہے۔ اسکی شاعری کے موضوعات کا سلسلہ کافی طویل ہے"

(ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک "خوشحال خان خٹک" ماہنامہ پشتو پشاور خوشحال نمبر ۲۰۰۱ء ص ۲۱)

۱۹۶۳ میں پشتو اکیڈی پشاور یونیورسٹی کے زیر اہتمام کلام خوشحال کی سولہ منتخب غزلوں' سات قصائد اور تین قطعات کا انگریزی ترجمہ لیے ہوئے سر ایولن ہاول اور سر اولف کیرو کی لکھی ہوئی کتاب "دی پوئمز آف خوشحال خان خٹک" شائع ہوئی۔ میں چاہوں گا کہ اس انگریزی ترجے کا ایک نمونہ دیکھنے سے پہلے سر اولف کیرو کی وہ تنقید دیکھیں جو اس نے (اپنی اسی کتاب میں) خوشحال کی شاعری کے بارے میں کی ہے:-

"It is worth while to dwell at some length on khushal's life and thoughts for he is a pathan of pathans. With all his weaknesses with all his vainglory, there is something splendid about the man. He compels affection and even love.And to understand him is the beginning of knowledge for him who would know pathan.

Those of his works which have come down to us consist in the main of a very large corpus of pakhto poetry of which the most

famous odes are still on the lips of every pathan. But he also wrote in prose on subjects ranging from religion and philosophy to sport and falconry"

خوشحال کے کلام میں مؤثر ترین غزل آفریدی قبیلے کی شاخ آدم خیل کی دوشیزاؤں کے حسن و جمال سے متعلق ہے۔ سر اولف کیرو اور سر ایولن ہاول نے اس غزل کو بھی انگریزی ترجمے کے لیے چُنا ہے اس غزل کا انگریزی ترجمے کے لئے چنا جانا ہمارے نزدیک مثبت تنقید کی حیثیت رکھتا ہے۔ غزل کے پہلے دو اشعار ہی سے اسکی دلکشی کا اندازہ ہوجاتا ہے:-

آدم خیلي افریدي دي سري او سپیني
پکښې شتهٔ دي ښائسته په رنګ رنګینې
غټې سترګې لوئې بانهٔ فراخې وروځې
شکر لبې ګل رخسارې مه جبینې

انگریزی ترجمہ:-

"Rosy and fair to the eyes are the daughters of Afridi Maids of the Adam khel, Lovely how they are lovely Large and liquid the eyes, brows arched, long lashes, sugar lips, Cheeks like flowers, foreheads as bright as the moon"

اردو ترجمہ:-

آدم خیل افریدی دوشیزائیں سرخ وسپید ہیں۔ان میں خوبصورت اور نگین صورت والی پائی جاتی ہیں۔بڑی بڑی آنکھوں' لمبی لمبی بھنوؤں اور فراخ ابروؤں والی' شکرلب' گل رخسار اور ماہ جبین"

ایک اور مستشرق I .N. Mackenzi تھے جس نے Poems from the Diwan of khushal khan khattak کے نام سے خوشحال بابا کے چیدہ چیدہ کلام کا ترجمہ ۱۹۶۵ء میں لندن سے شائع کیا۔اور یوں خوشحال کے کلام کو مغرب میں متعارف کروایا۔

افغانستان میں خوشحال کے محققین اور نقاد

انگریزوں اور دوسرے مغربی مستشرقین کے علاوہ افغانستان کے محققین اور نقادوں نے خوشحال بابا پر جو قابل قدر کام کیا ہے اس کا تفصیلی جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ ان محققین اور نقادوں میں علامہ عبدالحی حبیبی، گل باچا اُلفت، عبدالرؤف بینوا، صدیق اللہ ریشتین، عبدالشکور رشاد، قیام الدین خادم، محمد اکبر معتمد، محمد شیرین سنگوی خوگیانی، عبداللہ بختانی، ڈاکٹر دولت محمد لودین، ڈاکٹر عارف عثمان، حبیب اللہ رفیع، زرین انځور، ڈاکٹر گل محمد نوروزی اور نوجوان محقق ہیواد مل شامل ہیں۔ ان سب نے خوشحال پر جو کتابیں، مقالے اور مضامین لکھے ہیں۔ وہ بے مثال ہیں۔ ان کے ادبی کام کی نوعیت ایسی ہے کہ انکی وجہ سے پشتون قوم خوشحال خان کے نام اور کام دونوں پر ہمیشہ کے لیے ناز کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر خالد خان خٹک کے مطابق ان ادبی کاوشوں کی تفصیل درج ذیل ہے:-

(۱) ۱۹۳۸ء میں علامہ آقائے حبیبی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''د خوشحال ملغرے'' (خوشحال کے موتی) کے نام سے خوشحال کا مکمل دیوان دو جلدوں میں شائع کیا۔

(۲) ۱۹۵۰ء میں ''خوشحال خان خټک څۀ وائی'' کے عنوان سے عبدالرؤف بینوا نے خوشحال خان کے فن پر پہلی تحقیقی کتاب کابل سے شائع کی۔

(۳) ۱۹۵۳ء میں خوشحال خان کی تصانیف طب نامہ اور باز نامہ پشتو اکیڈیمی کابل نے شائع کیں۔

(۴) ۱۹۵۸ء میں عبدالرؤف بینوانے ''خوشحال اوپسرلے'' نامی کتاب کابل سے شائع کی اس کتاب میں خوشحال خان خٹک کے بہار سے متعلق اشعار کو اکٹھا کیا گیا ہے۔

(۵) افغانستان کے مشہور ادیب گل باچا الفت نے خوشحال کے فن اور شخصیت پر ''ملی قہرمان'' نامی کتاب ۱۹۶۵ء میں کابل سے شائع کی۔ گل باچا الفت کے ایک مقالے سے یہ اقتباس دیکھیے:-

> ''فردوسی نے اگر اپنی مادری زبان فارسی کی خدمت کی ہے تو اس سے زیادہ خدمت خوشحال خان خٹک نے اپنی مادری زبان پشتو کی ترقی کے لیے کی ہے۔ کلچر اور تہذیب اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جب ان میں فردوسی اور خوشحال جیسے زبان دان پیدا ہوں'

(۶) افغان محقق صدیق اللہ رشتین نے اپنی شاہکار کتاب ''تاریخ پشتو ادب'' میں خوشحال اور اسکی اولاد کی علمی اور ادبی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ فاضل محقق نے خوشحال کی تین کتابیں باز نامہ، طب نامہ اور فضل نامہ بھی چھپوانے کا اہتمام کیا اور اس طرح پشتون قوم کو خوشحال خان خٹک کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔

(۷) محترمہ معصومہ عصمتی کی خوشحال خان پر فارسی میں تحقیقی کتاب ''خوشحال خان خٹک کیست'' بھی افغانستان میں شائع ہوئی۔

(ڈاکٹر خالد خان خٹک۔ خوشحالیات "خوشحال نامہ")
افغانستان کے گل محمد نوروزی نے خوشحال کی زندگی کے ادبی آثار اور ادبی خدمات پر مقالہ لکھ کر ماسکو یونیورسٹی سے ۱۹۶۹ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔
نوجوان افغان محقق اور نقاد ہیوادمل نے خوشحال بابا کی کتاب "فراق نامہ" چھپوائی ہے۔ اس کتاب سے مغلوں کی قید و بند میں خوشحال پر روا رکھی جانے والی سختیوں کا پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب خوشحال نے اسی قید و بند کے دوران رنتھمبور (جے پور) اور دلی میں لکھی۔ فراق نامہ سے غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔ غزل کے مقطع سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل دلی میں نظر بندی کے دوران لکھی گئی تھی:-

دفراق غمونه لور په لور انبار دی
په کاغذ باندې دکوم یوه حساب کښم
که دخوږ خاطر له حال چاته کښل کړم
یا آهونه یا ژړا یا به عذاب کښم
ما خوشحال په خوب دا حال لیدلے نه وو
چې به دا دغم بیتونه په پنجاب کښم

ترجمہ:- ہر طرف ڈھیر کے ڈھیر جدائی کے غم ہیں
اب میں کاغذ پر کن کن کا حساب لکھوں
اگر میں اپنے دکھی دل کا حال کسی کو لکھوں

تو یا اپنی آہ و فریاد یا درد کا بیان ہی لکھونگا
مجھ خوشحال نے تو یہ حال کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا
کہ غم کے یہ اشعار میں پنجاب میں بیٹھ کر لکھوں گا۔

برصغیر پاک و ہند میں خوشحال کے محققین اور نقاد

بیسویں صدی کے دوران علامہ اقبال برصغیر پاک و ہند کے وہ پہلے مسلمان نقاد ہیں۔ جنہوں نے خوشحال کی شخصیت اور کلام سے متاثر ہو کر انکی شاعری کی تعریف کی اور انہوں نے خوشحال کے متعلق جاوید نامہ میں جو کچھ فرمایا ہم اسے علامہ اقبال کی طرف سے خوشحال کی شخصیت اور کلام پر انکی تنقید سمجھتے ہیں:۔

خوش سرود آں شاعر افغاں شناس
آں کہ بیند باز گوید بے ہراس
آں حکیم ملت افغانیاں
آں طبیب ملت افغانیاں
راز قومی دید و بے باکانہ گفت
حرف حق با شوخئی رندانہ گفت

علامہ اقبال نے کلامِ خوشحال کو برصغیر کے انگریزی دان طبقے میں متعارف کرانے کے لیے حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والے انگریزی مجلّہ "اسلامک کلچر" میں ایک مضمون بعنوان "The Afghan Warrior poet" چھپوایا۔ اس مضمون میں خوشحال کی شاعری اور شخصیت پر اپنی رائے کا اظہار علامہ اقبال نے یوں کیا:-

> "خوشحال خان کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ جب ہم اسکی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس میں بیان کی فطری اصلیت وصداقت کو واضح شکل میں دیکھتے ہیں۔ اس میں عرب شاعری کی طرح آزادی اور جنگ سے محبت کا اظہار ملتا ہے اور زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر اور تنقید کا رنگ ڈھنگ بھی ویسا ہی نظر آتا ہے"

لاہور کی ریسرچ سکالر محترمہ خدیجہ فیروز الدین نے علامہ اقبال کے کہنے پر خوشحال کی شخصیت اور فن پر مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۴۰ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

بیسویں صدی ہی کے دوران صوبہ سرحد میں خوشحال کے سب سے پہلے مسلمان محقق اور نقاد ہونے کا سہرا جناب دوست محمد خان کامل مرحوم کے سر ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ خوشحال کے کلام کے قلمی نسخے ڈھونڈ کر اکٹھے کیئے بلکہ ان کے ذریعے کلیات خوشحال خان مرتب کر کے ایک پُر مغز مقدمہ کے ساتھ چھپوایا۔ کامل صاحب نے خوشحال کی

شخصیت اور کلام پر کتابیں اور مقالے لکھے۔ اور تبصرے بھی کئے۔ ان کے علاوہ انہوں نے اردو میں فن وحیاتِ خوشحال خان خٹک پر اپنی شہرہ آفاق کتاب ۱۹۵۲ء میں شائع کی۔ جس میں ان کے کلام کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ خوشحال خان کے متعلق خارجی رویہ کو عنوان بناتے ہوئے انہوں نے انگریزی میں ایک مدلل اور سیر حاصل کتاب :- "On A Foreign Approach to Khushal Khan Khattak" لکھی۔ پشتو زبان کے متعلق خوشحال بابا کے احساسات کا ذکر جناب کامل صاحب نے اپنے ایک پشتو مقالہ میں یوں کیا ہے:- ترجمہ:-

> ''اس آگہی اور احساسات کا مالک اپنی قوم کی زندگی میں زبان کی ترقی' ادبی تحقیق اور ثقافتی سرمائے کے وجود اور اس کو بڑھاوا دینے کی اہمیت سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ علم و آگہی سے محبت اور ان کی تحقیق' قوم کی تہذیب و تمدن اور ادبی و ثقافتی ترقی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ محبت جتنی بڑھتی جاتی ہے اور محبت کرنے والا ترقی کرتا جاتا ہے اتنا ہی تہذیب' تمدن' ادب اور ثقافت بھی پھیلتے جاتے ہیں اور ہر قوم کی تہذیب' معاشرہ اور کلچر اپنی زبان کے ساتھ میچ کرتے ہیں۔ قوموں کی اجتماعی زندگی اور اس حقیقت کا احساس وشعور اور اس پر دو ٹوک عمل خوشحال خان کے ادبی آثار میں جابجا نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ پشتو زبان اور

ادب کی اپنی ریت قائم کرنے اور انہیں ترقی دینے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ اور انکی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ خود پشتو زبان کی محبت میں مبتلا ہیں اور پوری قوم کو اپنے ہمراہ اس محبت میں مبتلا دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ انکے ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے:-

اردو ترجمہ:- مجھے فارسی شعر کہنا بھی آتا ہے میں پشتو اور فارسی دونوں کا سلیقہ رکھتا ہوں۔ لیکن میں نے پشتو کو فارسی پر اس لئے فوقیت دی کیونکہ ہر شخص کو اپنے لوگ پسند ہوتے ہیں"

"میں نے پشتو کو رمز' مضمون' نزاکت اور تشبیہ میں عین فارسی تک پہنچادیا ہے"

"میرا ہر کلام چاہے آورد ہو یا الہام میں نے اسے بحر کی تقطیع میں بند کر دیا ہے"

"جب میں نے پشتو زبان پر اپنا علم بلند کیا تو گویا یاتوں کا ملک اپنے گھوڑے کی ٹاپوں سے فتح کیا"

(دوست محمد کامل "خوشحالی ادب میں ملی شعور" تاترہ' اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۱ء)

خوشحال خان خٹک کے ایک اور مشہور مؤرخ اور نقاد جناب سید رسول رسا ہیں۔ انہوں نے خوشحال کی بیشتر منظوم تصانیف کو یکجا کر کے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں" ارمغان

خوشحال'' کے نام سے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ جس کے ساتھ ۱۴۴ صفحے کا ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ مقدمہ لکھ کر جناب سید رسول رسا نے نہ صرف خوشحال کی زندگی کے حالات کو آنے والی نسلوں کی آگہی کے لیے قلمبند کر دیا ہے بلکہ خوشحال کے فن پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔

اس کے بعد ہم جس نقاد کا ذکر کریں گے۔ وہ پشتو کے معروف ادیب جناب فضل حق شیدا تھے۔ انہوں نے خوشحال کے فن پر متعدد مقالے سپردِ قلم کئے۔ وہ خوشحال کے فن میں انکی حماسی شاعری پر گراں قدر خیالات کا اظہار کرنے کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے۔

استادِ محترم پروفیسر تقویم الحق کاکا خیل مرحوم خوشحال بابا کی شخصیت اور فن پر ایک مستند محقق اور نقاد تھے۔ انہوں نے خاص طور سے خوشحال بابا کے تصورِ جمال پر تحقیق و تنقید کی ہے۔ ان کا پرمغز مقالہ ''خوشحال خان کا تصورِ جمال'' ان ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

جناب امیر حمزہ خان شنواری مرحوم عصرِ حاضر کی پشتو شاعری خاص طور پر غزل کے میدان کا ایک قابلِ قدر نام ہے۔ شاعری کے علاوہ وہ فلسفہ اور تصوف پر بھی ایک مستند حیثیت کے مالک تھے۔ انہوں نے خوشحال بابا کی شاعری میں تصوف پر نہ صرف تحقیق کی بلکہ انکے فلسفۂ وحدت الوجود پر کہے گئے ایک صوفیانہ شعر پر ایک پوری کتاب لکھ ڈالی۔ جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر سید انوار الحق نے خوشحال بابا کی غزلیات' قصائد' رباعیات' قطعات' متفرقات اور انکی دیگر تصنیفات یعنی فضل نامہ' باز نامہ اور سوات نامہ وغیرہ سے چیدہ چیدہ کلام کا انتخاب

کر کے پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی کے زیر اہتمام ''منتخبات خوشحال خان خٹک معہ اردو ترجمہ'' چھپوا کر پشتو دان طبقہ سے زیادہ اردو دان طبقہ کی خدمت سرانجام دی ہے۔اور یوں وہ پشتو اردو اتحاد کے سفیر کے طور پر ابھرے ہیں۔خوشحال بابا کے کلام' پیغام اور فلسفے سے آگاہی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ خاص طور سے اردو دان حضرات کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

خوشحالیات کی ترویج وتوسیع میں میر عبدالصمد خان افریدی کی خدمات کو ہمیشہ گراں قدر نظروں سے دیکھا جائے گا۔انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق اردو کتاب ''خوشحال و اقبال'' لکھ کر نہ صرف خوشحال بابا اور علامہ اقبال کی شخصیتوں اور فن کا قابل قدر موازنہ کیا ہے بلکہ اپنی اس کتاب کے ذریعے اپنے اہل وطن پاکستانیوں کے تشخص اور جذبۂ اتحاد کو مزید مستحکم کرنے کی سعی بھی کی ہے۔جس میں وہ خاصے کامیاب رہے ہیں۔اور یوں اردو دان طبقے کو خوشحال اور پشتو دان طبقے کو اقبال سے نہایت متاثر کن طریقے سے روشناس کرایا ہے۔میر عبدالصمد خان افریدی کی دوسری تصنیف ''تعلیمات خوشحال'' بھی اردو میں لکھی گئی۔اس کتاب میں خوشحال کے افکار اور تعلیمات کی وضاحت کی گئی ہے۔

اہل پاکستان کی جانی پہچانی شخصیت جناب پروفیسر پریشان خٹک مرحوم نے خٹک ہونے کے ناطے پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے سربراہ بنکر اور ایک قدم آگے بڑھ کر اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کے صدر نشین کی حیثیت سے خوشحال بابا کی شخصیت اور فن کو اجاگر کرنے کے لیے از حد کاوشیں کیں۔تحقیق کے علاوہ خوشحال خان پر انکے

مقالات اور تصانیف موجو ہیں۔ انکی ''پشتو شاعری کی تاریخ (ایک تحقیقی جائزہ)'' نامی کتاب اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد نے جنوری ۱۹۸۸ء میں چھاپی۔ اس کتاب میں پریشان خٹک مرحوم نے ''گوشۂ خوشحال خان خٹک'' کے عنوان سے ہمارے عظیم شاعر کی زندگی اور فکر وفن پر ایک خصوصی مقالہ سپرد قلم کیا ہے جو خوشحالیات کے سلسلہ میں مطالعہ کے لیے ایک خاصے کی تحریر ہے۔ اسکے علاوہ خوشحال بابا کی تین سوسالہ برسی کے موقع پر ۲۹' ۳۰' ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء کو اباسین آرٹس کونسل پشاور کے زیر اہتمام جو قومی مجلس مذاکرہ منعقد کی گئی۔ اس میں پڑھے گئے مقالات کو پریشان خٹک مرحوم نے جناب خاطر غزنوی مرحوم کی معاونت میں ترتیب دیکر ''خوشحال نامہ'' کے عنوان سے کتابی صورت میں چھپوایا۔ اس کتاب میں شامل انکے مقالے ''خوشحال بابا'' کی آخری سطروں سے یہ اقتباس قابل غور ہے:-

> ''مراو کہنے سے یہ ہے کہ اسے (خوشحال بابا کو) ایک مختصر مقالے میں متعارف کرنا کیسے ممکن ہے۔ جسکے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فطرت کی خوبصورتی کے بیان میں ہومر' رزم میں فردوسی' اخلاق میں سعدی' عشق وتصوف میں حافظ' فلسفہ میں خیام' عشرت میں بونواس اور فصاحت میں حضرت حسان کا تابع ہونے کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ ہے اور پھر یہ کہ صرف فردوسی نہیں خود رستم بھی ہے اور سب سے بڑی بات کہ جو کہتا ہے وہی کرتا ہے اور جو کرتا ہے وہی کہتا ہے۔

وہ ایک ایسا آفاقی شاعر ہے جسکی نظیر دنیا میں بہت کم نظر میں آتی ہے۔لیکن ابھی تک دنیا والوں نے خوشحال خان کو وہ مقام کیوں نہیں دیا جو اس کا حق ہے۔حالانکہ اس کا خیال تھا:-

د خوشحال قدر كه اوس په هيچا نشته
پس له مرګه به ئې ياد كا ډير عالم

ترجمہ:-"خوشحال کی اب اگر کوئی قدر نہیں کرتا۔موت کے بعد ایک عالم اس کو یاد کرے گا"

لیکن ایسا ہوا نہیں۔اسلئے میں نے اپنے شعر میں اسے یوں مخاطب کیا ہے:-

قصور کیا ہے ترا جو کبھی معاف نہ ہو
زمانہ تجھ سے ہمیشہ نظر چراتا رہا
کسی نے سننا نہ چاہا کوئی سمجھ نہ سکا
میں تیس سال تیری داستاں سناتا رہا"

پروفیسر پریشان خٹک کے بھائی حاجی پردل خان خٹک بھی خوشحالیات کے میدان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔انہوں نے پشتو اکیڈمی پشاور کے خوشحال ریسرچ سیل میں جو تحقیقی خدمات سرانجام دی ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔انہوں نے خوشحال خٹک کی کتاب "دستار نامہ" کی تالیف کر کے ۱۹۹۱ء میں پشتو اکیڈمی سے شائع کیا۔علاوہ ازیں حاجی پردل مرحوم نے "پشتو شاعری قدیم وجدید شعراء" میں بھی خوشحال کے فن پر مفید

روشنی ڈالی ہے انہوں نے پہلی پشتو اردو لغت کی ترتیب و تدوین کر کے مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے زیر اہتمام شائع کروائی۔ انکی ادبی خدمات کی وجہ سے انہیں تین سال کے لیے R.C.D پروگرام کے تحت ترکی میں مزید تحقیقی کام کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

جناب فارغ بخاری اور رضا ہمدانی نے ۱۹۸۰ء میں ''خوشحال خان خٹک۔ تلاش اور منظوم ترجمہ'' کے نام سے اپنی اردو کتاب لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد سے شائع کی۔ اس کتاب میں خوشحال بابا کے کلام کی تمام اصناف یعنی غزلیات، نظموں، رباعیات و قطعات، حمد، نعت اور منقبت سے چیدہ اشعار کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اسکے علاوہ باز نامہ، جنسیات اور باز و شاہین سے متعلق خوشحال بابا کے اشعار کا اردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری نے خوشحال بابا کی فارسی شاعری پر تحقیق کرتے ہوئے ان کے کم وبیش دو اڑھائی سو فارسی اشعار پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ یہ فارسی اشعار خوشحال بابا کے پشتو دیوان ہی کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر جعفری فرماتے ہیں:-

> ''خوشحال خان خٹک کے ضخیم دیوان میں صرف پچیس فارسی غزلیں دستیاب ہوئیں ہیں۔ جس میں اشعار کی مجموعی تعداد کم وبیش دو اڑھائی سو کے لگ بھگ بنتی ہے۔ لیکن اس قدر کم شعر کہہ کر بھی خان نے فارسی ادب میں اپنے لئے ایک ایسا مقام پیدا کیا جس کی ایرانی ناقد بھی تائید کرتے ہیں''۔

(ڈاکٹرسید مرتضیٰ جعفری''خوشحال بابا کی فارسی شاعری'')
پشتو کے نامور محقق جناب ہمیش خلیل نے خوشحال بابا کی تصنیف ''اخلاق نامہ'' کی ترتیب و تدوین کر کے کتابی صورت میں چھپوایا۔
جناب خاطر غزنوی نے خوشحال بابا کی نثری تحریر'' دستارنامہ'' کا اردو ترجمہ بمعہ تبصرہ ۱۹۸۰ء میں پشتو اکیڈیمی پشاور کے زیر اہتمام شائع کیا۔اس کتاب میں جناب خاطر غزنوی نے خوشحال بابا کی نثر پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے۔اور یوں خوشحال بابا کو جدید پشتو نثر کا بانی کہا ہے۔
جناب قلندر مومند خوشحالیات کے میدان میں ایک نقاد کی حیثیت سے یاد رکھے جائینگے۔
ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک اور محسن احسان نے رباعیات خوشحال کا منظوم اردو ترجمہ کر کے ایک یادگار ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اسکے علاوہ بھی ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک خوشحالیات پر ایک ماہر اور اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔انہوں نے پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے صدرنشین کی حیثیت سے بھی خوشحال بابا کی شخصیت اورفن کو اجاگر کرنے کے لیے انتھک کام کیا ہے۔اس ضمن میں ان کے پُر مغز مقالے یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔
پروفیسر ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک اپنی مشہور تحقیقی کتاب'' خوشحال او جمالیات'' (خوشحال اور جمالیات) کے لیے یاد رکھے جائینگے۔ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر صاحب کی پی ایچ ڈی کے لیے لکھی گئی تھیسس کی کتابی صورت ہے۔ یہ کتاب خوشحال ریسرچ سیل پشتو اکیڈمی پشاور کے زیر اہتمام ۱۹۸۷ء میں شائع کی گئی۔اس کتاب میں خوشحال کے تصور جمال کے علاوہ

انکے فن پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

پروفیسر نواز طائر نے ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی پشاور کی حیثیت سے تاریخ ادبیات پشتو کی تالیف کر کے ''روحی ادب'' کے نام سے ۱۹۸۷ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں بھی خوشحال باباکے فن پر ادبی بحث کی گئی ہے۔

خوشحال بابا کی تصنیف ''سوات نامہ'' کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر شکیل احمد نے پشتو اکیڈمی پشاور کے زیر اہتمام کتابی صورت میں شائع کیا۔ دیباچہ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک نے انگریزی میں سپرد قلم کیا ہے۔

جناب شیر افضل خان بریکوٹی نے ''دبدبۂ خوشحال'' کے نام سے خوشحال خان کے فن پر کتاب ۱۹۹۵ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں خوشحال بابا کی حقیقی اور مجازی شاعری پر سیر حاصل بحث خوشحال باباکے اشعار کی روشنی میں کی گئی ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس باب میں جناب ڈاکٹر درویش خان یوسف زئی کی ان تحقیقی کاوشوں کا ذکر نہ کیا جائے جن کے نتیجے میں انکا پرمغز پشتو مقالہ بعنوان ''غالب اوخوشحال'' (غالب اور خوشحال) پشتو سہ ماہی مجلّہ ''تاترہ'' پشاور اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۱ء میں چھپ کر اہل نظر کے سامنے آیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی دس سال سے زیادہ عرصہ پر محیط تحقیقی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس میں غالب وخوشحال کے چیدہ چیدہ اشعار کی روشنی میں دونوں نابغۂ شعراء کے فن کا موازنہ کیا گیا ہے۔

خوشحالیات کے میدان میں ڈاکٹر خالد خان کے مضامین اور مقالات پڑھنے کی حامل

تحریریں ہیں۔انکی تحقیق کا دائرہ برٹش میوزیم لائبریری لندن تک پھیلا ہوا ہے۔
ان کے علاوہ خوشحال خان خٹک پر متعدد معزز اہل قلم کے نام تحقیق و تحریر کے سلسلے میں لئے جانے کے قابل ہیں۔ان میں جناب پروفیسر ڈاکٹر اعظم اعظم' پروفیسر افضل رضا مرحوم' جناب نواز خٹک' جناب عقاب خٹک' جناب حمد اللہ جان بسمل' جناب سلیم راز' جناب داور خان داؤد' پروفیسر نعیم تقوی' محترمہ پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین' جناب محمد پرویش شاہین' جناب پروفیسر محمد قاسم مظہر' جناب ہمایون ہما' محترمہ ڈاکٹر بی بی مریم' جناب روخان یوسفزئی اور نوجوان محقق ڈاکٹر زبیر حسرت شامل ہیں۔ان کے علاوہ بھی دوسرے معزز ادباء ہونگے جو خوشحال کےفن پر کام کر رہے ہیں۔میں ان سب سے معذرت خواہ ہوں۔ اگر اس ضمن میں انکے اسمائے گرامی اور انکے کام سے متعلق یہاں پر ذکر نہ کیا گیا ہو۔
خوشحال بابا کے ایک قابل قدر نقاد جناب پروفیسر محمد قاسم مظہر ہیں۔انکی تنقید میں سے ایک اقتباس پر یہ مضمون ختم کرتے ہیں۔اس اقتباس میں آپکو غالب کے مشہور نقاد ڈاکٹر سید عبدالطیف کا رنگ چھلکتا نظر آئے گا:-

> ''اگرچہ پشتون ادیبوں اور باہر کے لوگوں نے خوشحال خان کے متعلق بیسویں صدی کے دوران منائی گئی برسیوں میں تاریخی انکشافات کئے ہیں اور انکی تاریخی شخصیت اور ادبی خدمات کو کماحقہ منظر عام پر لائے ہیں۔لیکن پھر بھی خوشحال کی متنوع شخصیت اور تاریخی اقدامات اس سے بھی زیادہ انکشافات کے متقاضی ہیں۔

کیونکہ کچھ وقت کے لیے منطقی استدلال کے زور پر لکھے گئے چند مقالے بعض لوگوں پر پیشکش کے کمال کے زور پر اتنا اثر ڈال چکے ہیں کہ ان کو صحیح سمجھا جائے۔ بعض دوسرے ادیبوں نے جوابی کاروائی کے زور پر نہ صرف اس استدلال کو رد کیا ہے۔ بلکہ تحقیق کا رخ دوسری طرف موڑ دیا ہے۔ اس مثبت اور منفی عمل سے کم از کم یہ ہوا کہ ادباء کو مجبور ہونا پڑا کہ خوشحال خان کو صحیح طریقہ پر ایک طرف تو مافوق الفطرت عالم بالا سے نیچے لایا جائے اور دوسری طرف تحت الثرا ء میں گرانے سے بچایا جائے۔ تاکہ وہ زمین کی سطح پر اچھے برے، علم وفہم، کامیابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ جڑ کر ایک ہوشمند، باخبر اور انسانی زندگی کے ترجمان مفکر کے طور پر سامنے آئے"۔

(پروفیسر محمد قاسم مظہر "خوشحال خان خٹک"، خوشحال مطالعہ ص ۱۳۰، ۱۳۱)

موازنۂ خوشحال وغالب

تلخیص

اس کتاب کے سارے مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد اب ہم ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں خوشحال وغالب کی شخصیت وفن کا ایک خصوصی موازنہ کر سکیں۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ شخصیت وفن کے لحاظ سے ان نابغہ شعراء میں قدرِ موافق بھی پائی جاتی ہے اور قدرِ تفاوت بھی۔ اس لئے ان اقدار پر تفصیل سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

شخصیت کے لحاظ سے خوشحال وغالب میں بہت سے پہلو ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ ان میں یہ حقائق شامل ہیں کہ ہماری یہ دونوں نابغۂ روزگار ہستیاں مغلیہ دور میں ہو گذری ہیں گو کہ دونوں کے ادوار میں لگ بھگ پونے دوصدیوں کا فاصلہ حائل ہے۔ دونوں دربارِ مغلیہ سے منسلک رہے۔ بچپن میں دونوں نے نوابانہ ماحول اور ناز ونعم میں پرورش پائی۔ دونوں مکتب سے باہر کے ماحول میں خوش رہتے۔ دونوں کو تعلیمی اور فکری استعداد بڑھانے کے لئے اچھے اساتذہ میسر آئے۔ اگر خوشحال نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شاہ اویس ملتانی جیسے جید اساتذہ سے استفادہ کیا تو غالب کو ملا عبدالصمد کی صورت میں ایک نہایت عالم وفاضل استاد ملا۔ خوشحال کے والد شہباز خان میدان جنگ میں زخمی ہو کر وفات پا گئے تھے تو غالب کے والد عبداللہ بیگ خان نے بھی میدان جنگ

میں لڑتے ہوئے وفات پائی۔ خوشحال و غالب دونوں کو اپنے اپنے خاندانوں اور آباء کی سپہ گری پر ناز تھا۔ دونوں کو مغلیہ دربار سے خلعتیں اور نقد انعامات عطا کئے گئے۔ دونوں نے اپنے اپنے جائے مولود سے دور کئی مقامات کے سفر اختیار کئے۔ دونوں با اخلاق انسان تھے اور دوستوں کو عزیز رکھتے تھے۔ دونوں نے چھوٹی عمر میں شاعری شروع کی اور دونوں کی شادیاں نسبتاً جلدی کر دی گئی تھیں۔

دونوں نے آخری عمر میں اس بات کا شکوہ کیا کہ انکے فن کی قدر و منزلت ان کی امیدوں کے مطابق نہیں ہوئی۔ دونوں نے پیشگوئی کی کہ انکی موت کے بعد انکے فن کو تمام عالم میں سراہا جائے گا۔ ان دونوں پر اپنے اپنے حالات کے پیش نظر بڑھاپے میں ابتلاء کا دور آیا۔ اگر خوشحال کو انکے علاقہ میں قحط و خشک سالی کے دوران اپنے عزیز و اقارب کی وفات کا صدمہ سہنا پڑا اور اپنے جواں سال اور چہیتے بیٹے نظام کی موت نے انہیں غمگین کیا تو غالب کو غدر کی صعوبتوں' عزیز و اقارب کے قتل اور اپنے اکلوتے بھائی کی موت جیسے صدمات نے زندہ درگور کیا۔ غالب کے بھانجے عارف کی جواں سالی میں موت ان تمام صدمات کے علاوہ ہے۔ جہاں غالب کی تمام اولادیں بچپن ہی میں داغ جدائی دے گئیں وہاں خوشحال کو اولاد کی نافرمانی کا دکھ اٹھانا پڑا۔ دونوں نے ستر سال سے زیادہ کی عمر پائی۔ خوشحال و غالب خلفائے اربعہ کا احترام کرتے تھے اور اہل بیت نبی کے خاص معتقد تھے۔ دونوں پر رافضی ہونے کا الزام لگا اور دونوں نے ایسے الزام کو جھٹلایا۔ گو کہ غالب کی وفات کے بعد سنی اور شیعہ طبقات میں اپنے اپنے عقائد کے مطابق انکی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں

بدگمانیاں پیدا ہوئیں مگر آخرکار غالب کو سنی عقیدہ کے مطابق دفنایا گیا۔ اُدھر خوشحال ایک راسخ العقیدہ سنی تھے اور انکو اسی کے مطابق سپردِ خاک کیا گیا۔

یہ تو تھیں خوشحال و غالب کی شخصیتوں میں موافقت کی باتیں۔ اب ذرا شخصیت ہی کے ضمن میں ان دونوں میں موجود تفاوت پر بات کرتے ہیں۔ جسمانی ساخت کے زمرے میں ظاہر ہے کہ پہاڑوں کے پروردہ پشتون (خوشحال) اور آگرہ کے محلات میں پلنے والے ترک زادے (غالب) میں فرق تھا۔ خوشحال تنومند تھے اور مرد تیر و تفنگ ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ مگر غالب شاعری کے علاوہ کسی دوسرے میدان کے دھنی نہ تھے۔ غالب عیش و عشرت کے دلدادہ تھے تو خوشحال سادگی پسند تھے۔ خوشحال کا رجحان مذہب کی طرف تھا تو غالب آزاد منش انسان تھے۔ غالب انا پرست تھے تو خوشحال غیرت پر مر مٹنے والے تھے۔ خوشحال Extrovert تھے اور گھر سے باہر کے امور میں زیادہ خوش رہتے تو غالب مزاجاً Introvert تھے۔ کمرے میں انگیٹھی جلا کر بیٹھنا اور شعر و شاعری کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ غالب نے غیر آسودہ گھریلو زندگی سے فرار کے طور پر جوانی میں عشق کا تجربہ کر ڈالا تھا مگر خوشحال اس جھنجھٹ سے دور رہے۔ خوشحال نے ۱۳ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ یوسفزئیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ تو غالب اتنی ہی عمر میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

آیئے اب ذرا اپنے ان نابغۂ شعراء کے فن میں جھانک کر ان میں ہم آہنگی تلاش کریں۔ اس بات میں سب سے پہلی چیز جس کی طرف نظر جاتی ہے۔ وہ یہ کہ دونوں

نے شاعری کا آغاز چھوٹی عمر میں کیا۔ اس پر اتنا اضافہ اور ہے کہ جہاں غالب نے دس برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا وہاں خوشحال کو شاعری شروع کرنے میں دس برس مزید لگ گئے۔ خوشحال و غالب نے اپنی اپنی زبان کی جن اصناف شاعری کو درجۂ کمال تک پہونچایا ان میں غزل، قصیدہ اور رباعی شامل ہیں۔ دونوں نے نثر میں بھی لکھا اور اپنی اپنی جودت طبع کے مطابق جدید نثر کے بانی کہلائے۔ خوشحال نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''دستارنامہ'' کی طرز تحریر کے ذریعے پشتو نثر کو سادہ اور روزمرہ کے مطابق بنا کر جدید دور میں داخل کر دیا۔ اُدھر غالب نے اپنے مکاتیب کے ذریعے اردو نثر کو جدیدیت بخشی۔

خوشحال و غالب دونوں نے تاریخ نویسی بھی کی۔ غالب نے فارسی میں مغلیہ خاندان کی تاریخ (مہرنیم روز) اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حالات (دستنبو) لکھنے کا کارنامہ سرانجام دیا تو خوشحال نے اپنے قصیدوں میں شہر دہلی اور وہاں گذرنے والے افغان بادشاہوں کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ دونوں نے شعر و شاعری خاص طور پر غزل کے میدان میں نئے تجربات کئے ہیں۔ اگر غالب نے استفہامیہ طرز کی اردو غزلیں لکھ کر اور چھوٹی بحر کی فارسی سے پاک غزلیں پیش کر کے شاعری کے میدان میں نئے تجربات کئے تو خوشحال نے پشتو شاعری میں قسمیہ طرز اور سوال و جواب لئے ہوئی غزلیں لکھیں اور ایک ہی شعر کے دو مصرعے الگ الگ زبانوں یعنی پشتو اور فارسی میں لکھنے کا تجربہ کیا۔ اگر خوشحال نے پشتو نثر و شاعری کے نئے دور کا آغاز کیا تو غالب نے جدید اردو نثر و شاعری کا آغاز کیا۔ یوں یہ دونوں نابغۂ روزگار ہستیاں اپنی اپنی زبان کے شعر و نثر پر

ثبت ہوگئیں۔

خوشحال و غالب کا نظریۂ شعر ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ جہاں غالب نے اپنا نظریۂ شعر اختصار سے بیان کیا ہے۔ خوشحال نے اسکی تفصیل کو ''دستار نامہ'' میں نمایاں جگہ دی۔ ہمارے ان ہر دو نابغۂ شعراء کے کلام میں سائنسی توجیہات ملتی ہیں جو حیران کن حد تک گہرے سائنسی ادراک کا پتہ دیتی ہیں۔ جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے تو انہوں نے خوشحال و غالب دونوں کو اپنے کلام میں سراہا ہے۔

خوشحال و غالب کے فن میں تفاوت بھی پایا جاتا ہے۔ جہاں خوشحال نے غزل کے علاوہ حماسی شاعری کی اور وطن کی محبت میں قصیدے رقم کئے وہاں غالب نے دوسری اصناف یعنی سہرہ وغیرہ پر بھی اپنا قلم آزمایا۔ خوشحال کے پاس قوم کے لئے ایک واضح پیغام تھا۔ انہوں نے باز اور شکیال کا تصور دے کر اپنی قوم کو متحد کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور یوں ایک سیاست دان اور مفکر کے درجہ تک پہونچ گئے۔ اُدھر غالب کی شاعری میں ایسا کوئی پیغام نہ تھا۔ ہاں البتہ انہوں نے غزل کی بوقلمونی کے ذریعے جدید اردو شاعری کی بنیاد ڈالی

قصیدہ گوئی کے میدان میں دیکھیں تو غالب نے قصیدے کو مدح حضرت علی اور تعریف شاہ تک محدود رکھا۔ اُدھر خوشحال نے اپنے بیشتر خیالات کا اظہار قصیدے کے ذریعے کیا۔ اسمیں اورنگزیب بادشاہ کی ہجو بھی شامل تھی۔

جہاں غالب کے ہاں تاریخ نویسی کا فن تو موجود ہے اور تاریخ گوئی مفقود وہاں خوشحال نے تاریخ نویسی اور تاریخ گوئی دونوں میں نام پیدا کیا۔ خوشحال نے اپنی شاعری

میں صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا کیونکہ انہوں نے اسلامی صوفی تحریک کا مطالعہ کر رکھا تھا لیکن غالب نے اسلامی یا یونانی صوفی تحاریک کا کوئی با قاعدہ مطالعہ نہیں کیا تھا۔ بااایں ہمہ انکے کلام میں اچھے صوفیانہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ غالب بادہ خوار کیونکر صوفی ہو سکتے تھے۔

خوشحال وغالب کے فلسفۂ غم میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ جہاں خوشحال ہر غم کو سینے سے لگانے اور اسکا مداوہ کرنے کا خواہشمند نظر آتا ہے۔ وہاں غالب غم کا اسیر ہوتا ہے۔ لیکن اپنی خوشدلیٔ طبع کی ڈھال سے غم کا حملہ روکنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔

خوشحال وغالب نے فارسی کلام بھی کہا مگر غالب کی فارسی شاعری میں کلام نہیں انہوں نے فارسی میں جو شاعری کی اس میں انکی اردو شاعری کی نسبت زیادہ جذبہ اور دبدبہ پایا جاتا ہے۔ خود انہوں نے بھی اپنی فارسی شاعری کو اردو شاعری سے بہتر جانا۔ اور اپنی اردو شاعری کو فارسی شاعری کے مقابلے میں ''بے رنگ'' کہا۔ اُدھر خوشحال کی مادری زبان فارسی نہ ہوتے ہوئے بھی اُنہوں نے فارسی شاعری کی گو کہ اُن کے پشتو دیوان میں ہی پچیس فارسی غزلیں ملی ہیں۔ جو تقریباً دوسو پچاس اشعار پر مشتمل ہیں۔

جرات اظہار اور بے باکی کے میدان میں خوشحال نے گویا پشتو شاعری میں ایک ریکارڈ قایم کر دیا ہے۔ انہوں نے کسی کو نہیں بخشا۔ مغلوں سے لیکر اپنے افغان ہم وطنوں حتٰی کہ اپنے قبیلے خٹک اور اپنی اولاد تک کو نہیں بخشا اور سب کو بے نطق کی سنائی ہیں۔ خوشحال نے اپنی شاعری میں جنسی بے باکی کو درجۂ کمال تک پہونچایا۔ غالب نے ایسی

کوئی بات نظر نہیں آتی ۔ وہ محبوبہ کے پاؤں تک چھونے سے گھبراتے ہیں اور یہی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ کہیں ایسا کرنے سے محبوبہ ناراض نہ ہو جائے ۔ بوسہ مانگتے ہیں تو وہ بھی ذرا دور سے۔

حسن وعشق کی بات ہو۔ تو بھی خوشحال وغالب کی شاعری میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ جہاں خوشحال حسن کے دلدادہ اور عشق کے متوالے ہیں وہاں غالب اس میدان میں نہایت احتیاط سے رک رک کر قدم رکھتے ہیں۔ گو کہ غالب کی فارسی شاعری میں اردو شاعری کی نسبت عشق کا جذبہ زوروں پر رہتا ہے۔

طنز ومزاح کے میدان میں بھی ہمارے ان شعرۂ آفاق شعراء کے معیار مختلف ہیں جہاں خوشحال طنز کا تیر استعمال کرتے ہیں اور مزاح اُنکے مزاج میں نہیں۔ وہاں غالب کے کلام میں طنز بھی پایا جاتا ہے اور مزاح بھی ۔ یہاں تک کہ غالب کے شاگرد مولانا حالی نے اپنے استاد کو ''حیوانِ ظریف'' تک کہہ ڈالا۔

خوشحال وغالب کی شاعری میں مے اور مے خانہ کے متعلق جو اشعار ملتے ہیں۔ ان سے تو بادی النظر میں یہی اندازہ ہوتا ہے کہ گویا دونوں پرلے درجے کے میخوار تھے۔ لیکن درحقیقت جہاں خوشحال شراب کا ایک قطرہ بھی چکھے بغیر میخوار کی حد تک پہونچے وہاں غالب نے مے پرستی بھی کی اور میخواری بھی ۔ ان الفاظ کے ساتھ موازنہ خوشحال و غالب اختتام پذیر ہوتا ہے ۔